زندہ

اور زندگی دینے والا دین

از ہر عباس، فاضل درس نظامی

☆☆☆☆☆☆

مصنف کتاب ہذا

عمر رسیدہ مگر تازہ دم، جید عالم دین، مفکر جناب ازہر عباس فاضل درس نظامی جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہر ماہ ماہنامہ صوت الحق اور دیگر مجلات میں بھی ان کی فہم و فراست سے بھرپور تحریریں منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔

ان کی گراں قدر تازہ کتاب ''زندہ اور زندگی دینے والا دین'' شائع ہو کر الحمدللہ منظر عام پر آ گئی ہے۔ یہ ان مضامین سے مکون ہے جو ماہنامہ صوت الحق میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے مندرجات کی روشنی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ازہر عباس خواجہ صاحب کی یہ کتاب ایک ایسا زمینی صحیفہ ہے جسے ہم اس صدی میں بطور زاد راہ اپنے ساتھ رکھنے پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس کتاب میں ان الجھے ہوئے مسائل کا قرآنی حل پیش کیا گیا ہے جن پر قابل ذکر کام نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک ایسی کتابِ علم و حکمت ہے کہ جو علمائے سلف کی یاد دلاتی ہے۔

حسین امیر فرہاد
مدیر ماہنامہ صوت الحق۔ کراچی

حقوق محفوظ نہیں ہیں مصنف اور کتاب کا حوالہ دے کر
کوئی بھی اس کتاب کے مندرجات شائع کر سکتے ہیں

اشاعت..2010ء
مطبع..........................نیو مجاز پرنٹر بندر روڈ کراچی
کمپوزنگ و اشاعت.......................... حسین امیر فرہاد
رابطہ............................سی بریز شارع فیصل کراچی

Mob.0323 2070277

اس کتاب میں تمام خوبیاں مصنف محترم ازہر عباس خواجہ صاحب کی جانب سے ہیں اور خامیاں، غلطیاں اس ناچیز کی طرف سے ہیں۔
حسین امیر فرہاد

گر تو می خواهی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز به قرآں زیستن

انتساب

ملت اسلامیہ کے سرمایہ، محترم ڈاکٹر راشد شاز صاحب کے نام

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حسن ترتیب

1	ابتدائیہ	6
2	زندہ اور زندگی دینے والا دین	10
3	عبادت کے معنی پرستش کرنا نہیں	22
4	قرآن کریم کی رو سے نیکی کیا ہے	32
5	اللہ تعالیٰ کے انسان کو علم دینے کے طریقے	40
6	مقام حدیث کے بارے میں چند توضیحات	48
7	چشم آفرین دارم	57
8	مسلمانوں کے زوال میں الہام کا کردار	62
9	حقوق اللہ اور حقوق العباد کی وضاحت	71
10	روحانیت کا روایتی، قرآنی مفہوم	74
11	اسلام اور جمہوریت	83
12	اسلامی سزائیں	88
13	قومیتوں کا تصور اور اسلام	94
14	طارق فتح صاحب کی کتاب کا تعارف	97
15	جمہوری نظام اور قرآنی نظام کے فاصلے	108
16	قرآن اور سنت کی روشنی میں موسیقی کی حیثیت	119
17	دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا	129
18	تین بچے	132
19	درسی کتاب علوم قرآن پر تبصرہ	140

20	محترم جناب پرویز صاحب پر ایک سنگین افتراء	154
21	تیری آواز مکے اور مدینے	160
22	کیا امر اور نواہی انفرادی طور پر انجام نہیں دیئے جاسکتے؟	163
23	قرآن کریم کے موجودہ تراجم	171
24	علماء کرام کی خدمت میں تحریک طلوع اسلام کا اجمالی تعارف	176
25	ایک آیت کریمہ کی تشریح	191
26	اللہ اور رسول کی پکار اور اس کے جواب کا مفہوم	197
27	سعودی علماء کی پارسائی پر ڈیلی ٹائم کا تبصرہ	205
28	ایک عریضہ بنام جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ صوت الحق	217
29	مسلمانوں کے زوال پر حضرت شیخ الہند کا تبصرہ	225
30	اسلامی قانون سازی	238
31	ارتداد	249
32	ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	257
33	غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی حیثیت	267
34	اللہ اور رسول کی اطاعت کی عملی شکل	273
35	لندن سے جناب ناظر علی کے سوالات	288
36	اسلامی اصول فقہ پر ایک نظر	293
37	لندن کے لارڈ میر کے بیان پر تبصرہ	305
38	اخبار ڈیلی ٹائمز کے ایک مضمون پر تبصرہ	326
39	قرآنِ کریم کلام اللہ یا کلام رسول	338
40	انسانوں کے باہمی معاملات کو وحی الٰہی کے مطابق طے کرنا دین ہے	345
41	اذا زلزلت الارض	365
42	شب برات	376

ابتدائیہ

ہم سب مسلمانوں کا اس بات پر ایمان رکھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم کا عطا کردہ نظام انسانوں کے وضع کردہ نظامہائے حیات سے بہتر ہے۔ صرف اسی نظام سے انسانیت کی فوز وفلاح وابستہ ہے۔ یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا عملی مفہوم ہی یہ ہے کہ اے وہ لوگو! جو اس بات پر ایمان لائے ہو کہ اللہ کا دیا ہوا نظام انسانوں کے وضع کردہ تمام نظاموں سے بہتر ہے۔ حضورؐ نے اپنے دور میں اس نظام کو قائم کر کے عملاً اس کے بہتر اور بے مثال ہونے کا ثبوت بھی فراہم فرما دیا کیونکہ قرآن کریم نے اس نظام کے نتائج وثمرات کے جو وعدے انسانیت سے کئے تھے وہ سب ایک ایک کر کے پورے ہوئے۔ لیکن انسانیت کی بدقسمتی تھی کہ وہ نظام کچھ ہی عرصہ جاری رہا اور جلد ہی معترض ہو گیا۔ اور اس کے فوائد ومنافع اس کی برکات وثمرات سے انسانیت محروم ہو گئی۔ قرآن کریم کا عطا کردہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا، دین میں ہمیشہ اجتماعی اطاعت ہوتی ہے اور اس نظام کی اطاعت ہی "اللہ اور رسول" کی اطاعت گردانی جاتی ہے۔ دین جب مذہب میں تبدیل ہو گیا تو اللہ اور رسول کی اطاعت میں اللہ کی اطاعت تو قرآن کریم کی رو سے کی جانے لگی، لیکن ایک اہم اور مشکل سوال یہ سامنے آیا کہ رسول کی اطاعت کس طرح کی جائے؟ مسلمانوں کی قسمت اگر یاوری کرتی تو وہ پھر اس نظام کو دوبارہ قائم کر دیتے اور پھر اللہ اور رسول کی اطاعت کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا اور قرار یہ پایا کہ رسول کی اطاعت حدیث کی رو سے کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راہ نکل ہی نہیں سکتی تھی۔ جب نظام کو ہی معترض کر دیا تو اس کے علاوہ اطاعتِ رسول کی اور کون سی صورت باقی رہ سکتی تھی لہٰذا اب احادیث کے ذخیرے جمع ہونے لگے چونکہ یہ بات ہر شخص کے لئے مشکل تھی کہ وہ از خود معلوم کرے کہ قرآن وحدیث میں کیا لکھا ہے اس لئے عام آدمیوں کو صاحبانِ علم کی طرف رجوع کرنا پڑا، اور اس طرح مسلمانوں میں پیشوائیت کی داغ بیل پڑنی شروع ہو گئی جس نے امتدادِ زمانہ کے ساتھ خوب فروغ حاصل کیا۔

یہاں تک بھی معاملہ غنیمت تھا اور مسلمانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکانات موجود تھے کیونکہ وحی الٰہی قرآن کریم کی شکل میں محفوظ موجود تھی اور وحی ہی مردہ قوموں کو زندہ کرتی ہے لیکن مسلمانوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے امکانات، اس وقت بالکل ختم ہو گئے جب ہماری پیشوائیت نے اپنے مفاد کے پیش نظر روایات کو بھی وحی قرار دے دیا اور یہ نظریہ وضع کیا کہ روایات بھی قرآن کی طرح مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰہ ہیں۔ ہمارے علماء کرام نے اس پر بھی بس نہیں کی جبکہ علامہ شوکانی نے "ارشاد الفحول" میں تحریر فرمایا دیا کہ "اَلسُّنَةُ قَاضِيَةٌ عَلَى الْكِتَابِ اللّٰهِ" یعنی سنت کتاب اللہ کے صحیح مصداق کا فیصلہ کرتی ہے کتاب اللہ سنت کے مصداقات متعین نہیں کرتی (بحوالہ اصول فقہ، شریعت اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد)

یہ نظریہ کہ احادیث قرآن کی طرح وحی منزل من اللہ ہیں، امت میں چلا آرہا ہے اور حیرت یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقے اس خلاف قرآن عقیدہ کے حامل چلے آرہے ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ہمارے اس دور میں اس خلاف قرآن عقیدہ کی نہ صرف تردید کی گئی ہے بلکہ اس عقیدے کے خلاف قرآن ہونے کے بے شمار مسکت دلائل بھی فراہم کیے گئے۔ ادارہ صوت الحق اسی عقیدہ کا داعی ہے کہ "وحی صرف قرآن میں ہے" اور روایات واحادیث وحی الٰہی نہیں ہیں ادارہ صوت الحق اس موضوع پر اپنے رسالہ میں برابر مقالات شائع کرتا چلا آرہا ہے جو بہت پسند کیے گئے ہیں احادیث کے وحی الٰہی ہونے کی تردید میں خواجہ ازہر عباس صاحب نے متعدد مضامین تحریر کیے جو رسالہ صوت الحق میں شائع ہوتے رہے ہیں قارئین صوت الحق کے اصرار پر خواجہ صاحب کے مضامین کا یہ مجموعہ الگ شائع کیا جا رہا ہے جو آپ حضرات کے پیش خدمت عالی ہے۔

خواجہ ازہر عباس کا یہ نظریہ ہے کہ جن احادیث کو وحی الٰہی خیال کیا جاتا ہے، اول تو یہ احادیث حضورؐ کی احادیث ہی نہیں ہیں، ان کو احادیث رسول کہنا ہی غلط ہے۔ یہ تو روایات کے ذخیرے ہیں کیونکہ اڑھائی سو سال تک جو الفاظ نسلاً بعد نسلاً اور پشت در پشت ایک زبان سے دوسری، دوسری سے تیسری، تیسری سے چوتھی، پانچویں، چھٹی پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہوں ان کا اپنی اصل شکل میں رہنا بالکل ناممکن ہے۔ باقی رہا حضورؐ کے ارشادات عالی قدر، تو ان کے متعلق یہ عرض ہے کہ اگر وہ وحی الٰہی منزل من اللہ تھے، اور

دین کا ایک حصہ ہے تو حضورؐ کا فریضہ تھا کہ انہیں بھی قرآن کریم کی طرح محفوظ صورت میں جمع کرا کر، امت کو دیتے، اور چونکہ حضورؐ نے ایسا کوئی بندوبست نہیں کیا، اس لئے یہ بات واضح ہے کہ یہ حضورؐ کے ارشادات گرامی قدر، نہ وحی تھے اور نہ دین کا کوئی جزو۔ دین خداوندی اپنی مکمل محفوظ، غیر متبدل شکل میں صرف اور صرف قرآن کریم میں محفوظ ہے اور اسی سے انسانیت کی قسمت اور اقوام عالم کی موت وحیات وابستہ ہے۔

دوسرا موضوع جس پر خواجہ صاحب نے بہت FOCUS کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ قرآن کریم کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔ نزول قرآن کے وقت انسانی ذہن ملوکیت کو فطرت انسانی کے عین مطابق سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ ذہن میں کوئی اور طریقہ حکومت کرنے کا، آتا ہی نہیں تھا۔ قرآن کریم نے اس کی واضح طور پر تردید کی اور شخصیات کے بجائے، نظام، قانون، اور INSTITUTION کی اطاعت کا تصور پیش کیا۔ قرآن کریم کے مطابق اللہ کا دیا ہوا دین (نظام) جس کو رسول اللہ نے نافذ فرمایا تھا، اس دین کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اس نظریہ میں یہ لطیف فرق ہے کہ اس نظام میں حضورؐ کی ذاتی اطاعت نہیں کی جاتی تھی بلکہ اطاعت نظام کی، کی جاتی تھی اور اس نظام کا سنگِ میل ہی یہ تھا کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسان سے اپنا حکم منوائے۔ یہ ایک ایسا انقلابی نظریہ تھا کہ اس وقت ذہن انسانی اس تصور سے قطعاً نا آشنا اور غیر مانوس تھا۔ نیز یہ کہ اس نظام کو چلانے کا عملی طریقہ قرآن کریم نے مشاورت قرار دیا ہے جس کے عملی طریقہ کو آج عقل انسانی کی معراج کبریٰ خیال کیا جاتا ہے یہ دونوں نظریات انسانیت کو قرآن کے عطا کردہ ہیں جو کتاب آپ کی خدمت عالی میں پیش کی جارہی ہے، اس کا نام ہی اسلامی حکومت کے قیام پر دلالت کرتا ہے اس کتاب میں آپ کوئی مضمون اس موضوع پر ملیں گے کہ حقیقی مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ، واحد مکمل، اور آخری ضابطۂ حیات تسلیم کرتا ہے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام کو جاری

کردے یہ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت کے مرادف ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ اُن کا عطا کردہ نظام جاری ہو۔ جو لوگ اللہ کے عطا کردہ نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ، اور رسول کے باغی، عادی، نافرمان اور مجرم ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں غیر اسلامی نظام میں کمایا ہوا، ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے اور اس کے ماتحت زندگی بسر کرنا، ایک سنگین جُرم ہے۔

ہم جناب حسین امیر فرہاد صاحب، ایڈیٹر رسالہ صوت الحق کے انتہائی شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کو اپنی نگرانی میں طبع کرایا اگر وہ اس کتاب کو طبع نہ کراتے، تو یہ کتاب کبھی بھی طبع نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ معاون ثابت ہوئے ہیں۔

خواجہ ازہر عباس صاحب کے فرزند عزیز خواجہ ضیاء عباس صاحب، کراچی کے ایک مشہور بنکر ہیں انہوں نے خواجہ صاحب کو تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کیا ہوا ہے۔ اب خواجہ صاحب نے اپنا سارا وقت قرآن کریم کی خدمت کے لئے وقف کیا ہوا ہے ہم اور پاکستان کے تمام قرآنی حلقے خواجہ ضیاء عباس صاحب کے انتہائی شکر گزار او دل سے ممنون ہیں۔

والسلام۔ پروفیسر محمد رفیع
ایم۔ اے، ایل ایل بی
(سابق) پرنسپل گورنمنٹ اسلامیہ سائنس کالج کراچی۔

=زندہ اور زندگی دینے والا دین=

ابتداء آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی سنت یہی رہی ہے کہ دنیا کی اس پُرخار وادی میں بنی نوع انسان کو بے سہارا نہ چھوڑا جائے بلکہ برابر اس کی راہنمائی کی جاتی رہے۔ چنانچہ اس سنت الٰہی کے مطابق انبیائے کرام کا سلسلہ جاری رہا اور دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں رہا کہ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے انبیائے کرام اس کی وحی لے کر نہ آئے ہوں۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ کُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ

(16/36) اور ہم نے تو ہر امت میں رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو! اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچے رہو۔ انبیائے کرام کی تعلیم شروع سے ایک ہی رہی ہے ان کی تعلیم میں کوئی تضاد و تناقض کبھی نہیں ہوا۔ اس آیت کریمہ کی تشریح آگے مضمون میں آئے گی۔ فی الحال آپ صرف یہ ملاحظہ فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ کی ارسال کردہ ہدایت کا ہماری زندگی میں کیا مقام ہے اور اس کے ہماری زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور ہمارے لئے اس کا ہونا کس قدر ضروری اور لابدی ہے۔

انسانوں نے جب سے تمدنی زندگی بسر کرنی شروع کی ہے، اپنے لئے کوئی نہ کوئی ضابطہ جاری رکھا کہ جس کے ماتحت وہ اطمینان وسکون کی زندگی بسر کر سکیں۔ شروع میں انسانی تمدن بالکل ابتدائی حالت میں اور نہایت سادہ تھا اور اس دور میں ضوابط زندگی بھی بالکل آسان تھے وقت اسی طرح گزرتا چلا گیا یہاں تک کہ ماضی قریب میں یورپ میں نشاۃ ثانیہ RENAISSANCE ہوا اور سارا یورپ بیک وقت بیدار ہو گیا اور آہستہ آہستہ مملکت کا تصور بھی واضح ہونا شروع ہوا۔ اور ہر ملک میں قومی حکومتیں NATION STATES وجود میں آنی شروع ہو گئیں۔ انسانیت کی یہ بدقسمتی تھی کہ وہاں اس وقت عیسائیت بطور

مذہب کے رائج تھی۔ایک تو عیسائیت میں مملکت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔دوسرے اس وقت وہاں چرچ کے نمائندے اس قدر کمزور سیرت کے حامل تھے کہ عام طور پر لوگ ان کے خلاف تھے پھر اتفاق سے وہاں سیاسی حالات بھی اس طرح کے واقع ہوئے کہ جن کی وجہ سے عیسائیت روبہ زوال ہی ہوتی رہی۔اور قومی حکومتیں NATIONAL STATES وجود میں آگئیں ۔ اس معاملہ میں ہنری ہشتم (HENREY THE EIGHT,) کی بہت CONTRIBUTION ہے۔یہاں مقصد تاریخی وقائع کی نشاندہی کرنا نہیں ہے بلکہ صرف اتنے اشارات پر اکتفاء کرنا ہے کہ کسی نہ کسی صورت سے یورپ میں قومی حکومتیں قائم ہوگئیں اور چونکہ ساری دنیا یورپ سے متاثر تھی اس لئے یہ مملکتیں دنیا کے اور حصوں میں بھی وجود میں آگئیں۔ان یورپین مملکتوں کی اساس جمہوریت اور سیکولرازم پر قائم ہوئی تھیں۔پولیٹکل سائنس کے ماہرین نے سیکولرازم کی مختلف تعریفیں کی ہیں ہمارے T.V چینلو پر بھی علمی وفکری مباحثوں میں ہمارے قابل احترام سکالرز،سیکولرازم کی تعریف کرتے رہے ہیں اور اس کی حمایت میں یہ بھی کہتے ہیں کہ سیکولرازم کے معنی لامذہبیت نہیں ہے۔سیکولرسٹیٹ میں بھی عوام مذہبی زندگی گذارسکتے ہیں۔بہرحال سیکولرازم کی جامع اور مختصر تعریف یہ ہے کہ اس میں قانون سازی کا منبع ومصدر عوام ہوتے ہیں۔اس میں قانون ساز افراد یا اداروں کو بالکل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جس قسم کا بھی قانون بنانا چاہیں وہ بنالیں خارج سے ان پر کسی قسم کی کوئی پابندی IMPOSE نہیں ہوتی۔یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں ہم جنس پرستی جیسا قبیح ومکروہ فعل قانونی طور پر جائز ہے۔انگریزی زبان میں ایک لفظ INCEST ہوتا ہے، جس کے معنی محرّمات سے بدچلنی کرنا ہوتا ہے۔یہ ایسا مکروہ فعل ہے کہ اس کے مرادف کوئی لفظ ہمارے ہاں اردو میں اب تک وضع نہیں ہوا ہے لیکن برطانیہ میں نہ صرف اس فعل کا ارتکاب ہوتا ہے،اس THEME پر ڈرامے بنائے جاتے ہیں جو مختلف چینلو پر چلتے ہیں۔ اگر یہ فعل وہاں میڈیا کی وجہ سے عام ہوجائے اور عوام اس کی موافقت میں ہوجائیں تو وہاں اس کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔کسی قسم کی کوئی پابندی ان اداروں پر نہیں ہے۔ سیکولر حکومتوں میں اس آزادی کے نتیجہ میں جو دوسری خامی پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ مملکت

خود بھی ضابطہ اخلاق کی پابند نہیں رہتی۔ سیکولر نظام کا یہ اساسی نظریہ ہوتا ہے کہ مملکت کو ہر قسم کے ضابطہ اخلاق سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس کا مقصد صرف اپنے مفاد کی نگرانی کرنا ہوتا ہے۔ ہر وہ حربہ جس سے اپنا مفاد محفوظ رہے وہ نہ صرف جائز ہے بلکہ قابل توصیف ہے اور ہر وہ فیصلہ جس سے اس کا مفاد مجروح ہوتا ہو، وہ ناجائز اور معیوب ہے۔ اس کے پیش نظر صرف اس کے اپنے مصالح ہوتے ہیں۔ چونکہ مملکت خود کسی ضابطہ اخلاق کی پابند نہیں ہوتی اس لئے وہ اپنے معاشرہ کے لوگوں پر بھی کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتی۔ اگر کوئی شہری مملکت کے قوانین کا فرمانبردار ہے تو اس کے باقی معاملات میں اس کو ہر طرح کی اجازت ہے کہ وہ جو جی میں آئے کرتا پھرے۔

سیکولرز نظام کی دوسری خامی اس کا ہمہ گیر ہونا ہے یہ اسی طرح ہمہ گیر ہوتی ہے جس طرح مطلق العنان بادشاہ یا ڈکٹیٹر ہوتا ہے اکاون فیصد والے اپنے فیصلہ کو پورے اختیارات کے ساتھ نافذ کر سکتے ہیں۔ وہ اس فیصلہ کو نافذ کرنے کے لئے اسی قدر مطلق العنان ہیں جیسے کوئی بادشاہ۔

تیسری خامی اس نظام کی یہ ہے کہ یہ کسی کو جواب دہ نہیں ہوتا۔ اس حکومت میں عام رواج و طریقہ یہی ہوتا ہے کہ پست درجہ کے لوگ تو حکومت کے قوانین کے پابند ہوتے ہیں لیکن اعلیٰ سطح کے افراد و سیاست دان خود کو ان قوانین سے مستثنیٰ کرا لیتے ہیں۔ یہ ہمارا روز کا مشاہدہ ہے۔ اس پر تحریر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

یہ مملکت جس نظریہ حیات پر قائم ہوتی ہے وہ خالص دنیاوی، مادی ہوتا ہے اس کے پیش نظر کوئی مقصد حیات نہیں ہوتا قرآن کریم کے الفاظ میں یہ حیوانی سطح کی زندگی ہے جس میں وَيَأْكُلُونَ كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ والی حالت ہوتی ہے (47/12) اس کے برعکس مملکت یا نظام حیات کے متعلق قرآن کریم کا نظریہ نہایت مستحکم، پائیدار اور اصول پر مبنی ہے، اس نظریہ کے مطابق مملکت کا مقصد انسانی زندگی کو اگلی سطح پر لے جانا اور اس کو ترقی دینا ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے "زندگی" بتدریج ترقی کرتی ہوئی اس سطح پر پہنچی ہے جس پر آج ہم ہیں۔ اور اسی 'زندگی' کو مزید ترقی دینا مقصد حیات ہے۔ قرآن کریم کی عطا کردہ

مستقل اقدار کے مطابق زندگی گذارنے سے زندگی میں ارتقاء ہوتا ہے۔ قرآنی حکومت ان قرآنی اقدار پر قائم ہوتی ہے۔ اس حکومت میں زندگی گذارنے سے نفس انسانی از خود ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ جب کہ غیر اسلامی نظام میں زندگی ترقی نہیں کر سکتی اس کو عام فہم انداز میں سمجھانے کے لئے تحریر ہے کہ قرآن کریم کی یہ مستقل قدر ہے کہ ربوٰ حرام ہے۔ جو شخص ربوٰ لے گا اس کی زندگی میں بجائے نشوونما کے ضعف و اضمحلال واقع ہوگا۔ اگر پورا معاشرہ ہی ربوٰ پر قائم ہو، جیسا کہ اب ہمارا معاشرہ ہے۔ تو جو افراد بھی اس میں زندگی بسر کریں گے۔ ان کا نفس ترقی نہیں کرے گا۔ اس لئے لازم ہے کہ معاشرہ اس معاشی اصول پر قائم ہو جس میں ربوٰ حرام ہو۔ انسانی زندگی کا ارتقاء، مستقل اقدار کو خود میں منعکس کرنے سے ہوتا ہے، اور یہ صرف اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ مملکت خود مستقل اقدار یا صفات الٰہی کے مطابق قائم ہو۔ مستقل اقدار اور صفات الٰہی ایک ہی چیز ہیں اور اگر ان کو سیاسی زبان میں TRANSLATE کر دیں تو یہی HUMAN RIGHTS کہلاتے ہیں۔

یوں تو قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کے دیگر دلائل بھی بہت مضبوط ہیں اور اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو قرآن کریم کی بیشتر آیات کے محتویات خود اپنے من جانب اللہ ہونے کے دلائل اپنے اندر رکھتی ہیں۔ لیکن قرآن کریم نے اطاعت الٰہی کا جو طریقہ بتایا ہے وہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ کسی فرد واحد کی سوچ کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ نزول قرآن تک اور خود نزول قرآن کے دوران، اللہ تعالیٰ کی اطاعت انفرادی، ذاتی، نجی طور پر ہوتی تھی۔ ہر شخص براہ راست اللہ کی اطاعت کرتا تھا۔ لیکن قرآن کریم وہ واحد کتاب ہے جس نے تمام انسانیت کے طریقہ کے علی الرغم نہایت پرزور آواز میں یہ نظریہ پیش کیا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی بلکہ اللہ کی اطاعت درحقیقت قوانین الٰہی کی ایسی اطاعت ہے جو اس کے رسول کی وساطت سے کی جاتی ہے، جو اس قانون کو نافذ کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اللہ کے قوانین، جن کو رسول نافذ کرتا ہے۔ ان قوانین کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ چونکہ وہ قوانین اللہ کے ہوتے اور رسول ان کو جاری کرتا ہے۔ اس لئے ان کی اطاعت میں اللہ و رسولؐ دونوں

کی اطاعت آجاتی ہے۔ عملاً اس کی مثال یہ ہے کہ صدر اول میں حضورؐ نے جو نظام قائم فرمایا تھا اس کی پوزیشن یہ تھی کہ اللہ کا دیا ہوا نظام جس کو حضورؐ نے عملاً اس زمین پر نافذ فرمایا تھا ۔اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔لیکن چونکہ یہ نظام کوئی وقتی یا ہنگامی نہیں تھا بلکہ اس کو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا تھا،اور یہ بھی ایک ظاہر بات تھی کہ حضورؐ بشر تھے جن کی عمر طبعی قوانین کے مطابق ختم ہونا تھا۔حضورؐ کو فوت ہونا تھا،اس لئے حضورؐ کے بعد،آپ کے جانشین اور اس نظام کے سربراہ کی اطاعت، اللہ ورسول کی اطاعت تھی ۔اس کے بعد جب تک وہ نظام جاری رہا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی اور اس عقیدہ نے انفرادی اطاعت کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔لیکن انسانیت کی بدبختی کہ وہ نظام معترض ہو گیا۔اور پھر اطاعت الٰہی انفرادی طور پر کی جانے لگی۔لیکن یہ انفرادی اطاعت کا تصور قرآن کریم کے خلاف ہے۔اس طرح آپ اپنی تسکین تو حاصل کرسکتے ہیں لیکن اللہ ورسول کی اطاعت کسی طرح بھی نہیں ہوسکتی۔چونکہ یہ نکتہ ونظریہ بالکل انوکھا (UNIQUE) ہے اور اس میں غایت درجہ ندرت اور نکارت ہے، اس لئے اس کو ذہن نشین کرانے کے لئے اس مفہوم کو دوسرے پیرائے میں تحریر کیا جاتا ہے۔

مذہب انفرادی اطاعت کا قائل ہے،اس کو عملی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ لہٰذا مذہب میں ہر انسان اپنے اپنے طور پر اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔اسلام جو کہ ایک دین ہے اس کی رُو سے اللہ کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر بھی اختلافات وتنازعات واقع ہوں ان کا فیصلہ قوانین الٰہی کی رو سے کرایا جائے ارشاد ہوتا ہے۔وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10) تمہارے آپس میں جو بھی تنازعات واقع ہوں ان سب کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے یعنی ان کا فیصلہ قوانین الٰہی کے مطابق کرو۔اس طرح قانون الٰہی (قرآن کے مطابق طے کردہ فیصلوں کی اطاعت)اللہ کی اطاعت ہوتی ہے اور پھر دنیاوی کام جس کا فیصلہ قرآن کریم کے مطابق کر دیا جائے وہ دینی بن جاتا ہے اس طرح اسلام میں دین ودنیا کی تفریق ختم ہوجاتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا منفرد نظریہ ہے جو قرآن کریم کے وحی ہونے پر دال ہے۔مذہب میں چونکہ

اطاعت انفرادی ہوتی ہے اس لئے اس میں سنے ہوئے ان احکامات کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔

دوسری بات جو اسلامی حکومت کی اطاعت کے لئے ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے یہ ہے کہ چونکہ یہ احکامات اللہ کے ہوتے ہیں اور جاری ان کو رسول کرتا ہے تو ان کی اطاعت سے اللہ ورسول دونوں کی اطاعت ہوتی ہے اور یہ ایک اطاعت ہے اور یہ اطاعتیں دو ہرگز نہیں ہوتیں اور اسی لئے ان دو مطاعوں کے لئے قرآن نے ایک کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ صیغہ فعل میں بھی ایک ہے اور ضمائر بھی ایک ہے۔ اس لئے اس اطاعت کو ایک شمار کرنا ضروری ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (9/74) انہیں اللہ ورسول نے اپنے فضل سے غنی کردیا۔ یعنی واحد مرکزی نظام (بیت المال) نے جو اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے کہ ان کی ضروریات زندگی کا ضامن ہو یہاں ضمیر واحد کی استعمال ہوئی ہے۔

(۲) یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِیُرْضُوْكُمْ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ یُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ (9/62) ملاحظہ فرمائیں کہ یہاں اللہ ورسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں لائی گئی، بلکہ یرضوہ میں ضمیر واحد لائی گئی ہے اور آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ایمان والو! منافق تمہیں راضی کرنے کے لئے قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اللہ ورسول زیادہ حقدار ہیں کہ مومنین انہیں راضی رکھیں۔ یعنی قرآنی نظام کے وفادار رہیں۔ اب بات صاف ہے کہ اللہ ورسول کے لئے واحد ضمیر آتی ہے اللہ ورسول کے لئے واحد ضمیریں لاکر انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ جملہ اللہ ورسول ایک اصطلاح کے طور پر اسلامی حکومت کے مرکز یا اسلامی نظام کی فائنل اتھارٹی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ رسول اللہ نے احکام نافذ کئے تھے اس لئے قرآن کریم نے اس کے لئے اللہ ورسول کی اصطلاح ان ہی خاص معانی میں استعمال کی ہے۔ قرآن کریم میں جس جگہ بھی اللہ ورسول کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے اس سے مراد اسلامی حکومت کی فائنل اتھارٹی یا

اس کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں موقر رسالہ "صوت الحق" میں اس قدر تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس کو دوبارہ، سہ بارہ، تحریر کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس لئے یہاں صرف چند آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

جنگ احد میں جب مسلمان سخت خلفشار میں گھرے ہوئے تھے اور غلط فہمی کی وجہ سے فتح شکست میں تبدیل ہو چکی تھی اور سخت خوف و اضطراب کا عالم تھا تو حضورؐ نے صحابہ کو دوبارہ جمع کرنے کے لئے آواز دی۔ اگر چہ یہ آواز حضورؐ کی تھی لیکن چونکہ یہ بلاواحضورؐ کا ذاتی نہیں تھا اس لئے اس آواز کو اللہ ورسول کی آواز کہا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَ اتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ (3/172) جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا باوریہ کہ وہ زخم کھا چکے تھے تو یاد رکھو ان میں جو لوگ نیک اور متقی ہیں یقیناً ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔

(۲) یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضورؐ کے ساتھ کیا تھا۔ اس عہد شکنی کو اللہ ورسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے۔ اس لئے کہ یہ مخالفت اسلامی حکومت کی مخالفت تھی۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ۚ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (8/13) یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے اور جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے۔ تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔ اس سلسلہ میں مزید آیات آپ خود قرآن کریم کے نسخوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

(24/54، 99/24، 58/21، 6/62، 9/74، 8/20، 59/8، 33/36، 58/20، 58/5،)

اصل مرکزی اور منفرد نقطہ اس مضمون کا یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کی اطاعت قرآن کریم کے عطا کردہ نظام کی معرفت ہی ہو سکتی ہے۔ اور چونکہ حضورؐ نے وہ نظام قائم فرمایا تھا اس لئے ان کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی اطاعت تھی۔ قرآن کریم اس اہم نکتہ کو کہ اللہ کی اطاعت نہ تو براہ راست ہو سکتی ہے اور نہ ہی انفرادی طور پر ہو سکتی ہے بار بار دہراتا ہے جبکہ ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (4/65) پس اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقت کہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ نہ ہوں ، بلکہ خوش خوش اس کو مان لیں۔ (۲) وَ اَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5/49) جو احکام اللہ نے نازل کئے ہیں تم ان کے مطابق فیصلہ کرو (۳) فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ولا تتبع اهوآء و احذرهم ....(5/48)

تو جو کچھ تم پر اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق تم بھی حکم دو اور حق آجانے کے بعد ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ (۴) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ (4/59)، اے ایمان والو! تم اطاعت کرو اللہ کی اور اس کے رسول کی اور اپنے میں سے صاحب اختیار لوگوں کی ، پھر اگر تم میں کسی معاملہ میں جھگڑا ہو تو اسے اللہ و رسول کی طرف لے آؤ۔ اس آیت میں بھی سارے متنازعہ فیہ امور کو رسول اللہ کے پاس فیصلے کے لئے لانے کا حکم دیا گیا۔ اس سلسلہ میں اور بھی متعدد آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔

ان تمام آیات سے واضح ہوتا ہے کہ دین کا تقاضا ہے اور اللہ کی اطاعت کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان جس قدر بھی تنازعات واقع ہوں ان سب کا فیصلہ قوانین الٰہی کی رو سے کیا جائے۔ اور ان فیصلوں کی اطاعت کرنا ہی اللہ کی اطاعت ہے اور یہ کسی طرح بھی انفرادی نہیں ہو سکتی۔ یہ انفرادی تصور ہی قرآن کے خلاف ہے۔

اقامت صلوٰۃ (نماز) جسے ہم خالص "مذہبی" کام سمجھتے ہیں قرآن کریم کی رو سے تو وہ بھی انفرادی اور براہ راست نہیں ہو سکتا حضورؐ کی موجودگی میں حضورؐ کو امامت کرنا فرض تھا۔ اور تمام مومنین کو حکم تھا کہ حضورؐ کی اقتداء میں نماز ادا کریں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَاْخُذُوْٓا اَسْلِحَتَهُمْ فَاِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا مِنْ وَّرَآئِكُمْ وَلْتَاْتِ طَآئِفَةٌ اُخْرٰى لَمْ

يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ وَلْيَاْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَ اَسْلِحَتَهُمْ ۔(4/102)

اور جب آپ ان میں ہوں اور انہیں صلوٰۃ پڑھانے لگیں تو ان میں سے ایک گروہ آپ کے ساتھ کھڑا ہو اور اپنے ہتھیار لئے رہیں۔ جب نماز پڑھ چکیں تو یہ آپ لوگوں کی پشت پناہی کے لئے چلے جائیں اور دوسرا گروہ ان کا جس نے صلوٰۃ نہیں پڑھی ہے آ جائے اور آپ کے ساتھ نماز پڑھے اور یہ بھی اپنا سامان حفاظت اور ہتھیار "لئے رہیں"۔

مشہور و مستند تفسیر فصل الخطاب میں اس آیہ کریمہ کے ذیل میں تحریر ہے "یہاں نماز خوف کی ترکیب بیان کی گئی ہے کہ فوج اسلام کے دو حصے ہو جائیں ایک حصہ دشمن کے مقابلہ میں جنگ کرتا رہے اور ایک حصہ رسول اللہ کے ساتھ نماز میں شریک ہو۔ اس طرح کہ ایک رکعت پیغمبر کے ساتھ با جماعت پڑھے۔ پھر رسول بیٹھے رہیں اور یہ لوگ کھڑے ہو کر اپنی دوسری رکعت بطور خود جلدی جلدی پڑھ کر چلے جائیں دشمنوں کے مقابلہ میں۔ اب وہ لوگ آئیں اور رسول اب کھڑے ہو کر ان کے ساتھ دوسری رکعت پڑھیں۔ لیکن یہ ان لوگوں کی پہلی رکعت ہے۔ لہٰذا رسول دونوں سجدوں کے بعد پھر بیٹھ جائیں اور یہ لوگ سجدوں کے بعد کھڑے ہو کر اپنی دوسری رکعت جلدی سے پڑھ کر جب سجدوں سے فارغ ہوں تو اب رسول ان کے ساتھ سلام پڑھ کر نماز تمام کریں"۔ فصل الخطاب۔ جلد دوم، صفحہ 286۔

یہاں یونہی آیت کریمہ اور اس کا ترجمہ اور تفسیر صرف اس وجہ سے نقل کی گئی ہے کہ یہ واضح کر دیا جائے کہ مجاہدین حملے کے خوف کی وجہ سے یکبارگی نماز ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے حضوؐر ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے نماز پڑھاتے تھے۔ وہ تو دو حصوں میں منقسم ہو جاتے تھے۔ لیکن حضوؐر ان کے دونوں حصوں کی امامت فرماتے تھے ان کا کوئی مجاہد انفرادی نماز نہیں پڑھ سکتا تھا۔ ہر مجاہد کو حضوؐر کی اقتداء میں نماز پڑھنی واجب تھی۔ اس لئے آیت کریمہ میں "مـــعك" کا لفظ دوبار استعمال کیا گیا ہے۔ یہ شرط ہے اس لئے حضوؐر کی موجودگی میں نہ کوئی امیر صلوٰۃ ہو سکتا تھا اور نہ کوئی انفرادی نماز پڑھ سکتا تھا اور نہ کوئی براہ راست اللہ کی اطاعت کر سکتا تھا۔

اس آیت کریمہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ فریضہ امامت سربراہ مملکت یا اس کی

عدم موجودگی میں کوئی نمائندہ حکومت سر انجام دے سکتا ہے۔ ہمارے ہاں جو یہ دستور ورواج ہے کہ محلہ کے نمازیوں کا مقرر کردہ امام نماز پڑھاتا ہے تو یہ مذھب کی نماز کی امامت ہے۔ دین کی صلوۃ کے اجتماعات کا بندوبست اس ملک کی اسلامی حکومت کرے گی۔ اوران اجتماعات کی امامت بھی عمال حکومت کریں گے۔جن اجتماعات میں حکومت کے اہم امور پر مشورہ کرنا درکار ہوگا، انہیں خود سربراہ مملکت یا دیگر نمائندگان مملکت ہی CONDUCT کرسکتے ہیں۔

صلوۃ کے علاوہ بھی ہم جن ارکان ومناسک کو خالص عبادت کہتے ہیں وہ بھی نظام کے ماتحت ہی سر انجام دیے جائیں گے۔زکوۃ، حج، عمرہ، جہاد، اجتہاد یہ سب نظام کے ماتحت ادا کیے جائیں گے اور یوں اللہ کی اطاعت براہ راست کرنے کے بجائے، نظام اسلامی کی معرفت ادا کی جائے گی۔ کیونکہ قرآن کریم کی رو سے اللہ کی اطاعت براہ راست کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے، اس کے لئے نظام قائم کرنا لازمی ہے۔پس مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے واحد، مکمل، اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیامیں نظام الٰہی (جو قرآن پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبس کہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اوراس کے رسول کے باغی، عادی مجرم، اورنافرماں ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔

################### ##################

عبادت کے معنی پرستش کرنا نہیں، بلکہ
اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے

انبیائے کرام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مکمل نظامِ زندگی لے کر آتے تھے، جو ان کی وحی پر مبنی ہوتا تھا۔ اس نظام کو قائم کرنا، اس نظام کی اطاعت کرنا، اور اس کے احکامات کے تابع زندگی بسر کرنا ہی اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا، اور اس کی عبادت کرنا ہے۔ کسی نبی کے دین میں کسی قسم کی پرستش کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی تھی۔ انبیائے کرام کا یہ سلسلہ الذہبی حضورؐ پر ختم ہوگیا۔ حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں انتہائی محنت شاقہ اور صحابہ کرامؓ کی بے دریغ قربانیوں کے ساتھ دین کو قائم فرمایا جس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضورؐ کے کچھ عرصہ بعد دین کا نظام متروض ہوگیا۔ اس کے بعد سے مسلمانوں میں ہر جگہ پرستش اور پوجا پاٹ کا ہی دور دورہ چلا آرہا ہے۔ آپ مسلمانوں کے چودہ سال کے طویل عرصہ پر نگاہ ڈال کر دیکھ لیں نہ کہیں حاکمیت الٰہیہ قائم کی گئی، نہ کسی دین کا نام ونشان ملتا ہے۔ ہم مسلمانوں میں بڑے بڑے مفکرین، آئمہ اور مصلحین پیدا ہوئے لیکن ان میں سے کوئی بھی پرستش یا مذہب کے باہر نہیں نکلا۔ مذہب اور پرستش لازم و ملزوم چیزیں ہیں۔ مذہب سے توہم پرستی پیدا ہوتی ہے، اور توہم پرستی سے خوف پیدا ہوتا ہے۔ توہم پرست منگل کے روز سفر نہیں کرتے، بدھ کے روز حجامت نہیں بنواتے، اگر قمر در عقرب ہے تو شادی نہیں کرتے، بڑے بڑے لیڈر، پیروں کے پاس جا کر زائچے بنواتے ہیں صدقہ خیرات بھی توہم پرستی کی وجہ سے باقی

ہے۔ یہ تمام خوف وہراس مذہب اور توہم پرستی کا لازمی نتیجہ ہے۔ ہم اسی مذہب، توہم پرستی، اور پرستش کی رسوم کی ادائیگی میں چاروں طرف سے گھرے چلے آرہے تھے کہ فطرت کے تقاضوں کے سبب، عنایت ایزدی اور رحمت باری حرکت میں آئی اور ایک عظیم شخصیت، جو اس دور کی مُنادیاً ینادی لا یمان تھی۔ اس نے حاکمیت اللہ اور دین الٰہی کو قائم کرنے کے لئے "تحریک طلوع اسلام" نام کی ایک عظیم و بلند پایہ تحریک کی ابتداء کی، تاریخ انسانیت میں نوح علیہ اسلام سے لے کر آج تک دین کے قیام کے لئے جس قدر تحریکیں برپا ہوئیں ان سب کی قیادت انبیائے کرام نے فرمائی ہے۔ لیکن اب چونکہ انبیائے کرام کا دور ختم ہو گیا ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ دین کے قیام کے لئے اب اُن کی اُمت ہی کوشش کرے گی۔ تحریک طلوع اسلام وہ پہلی تحریک ہے جو بغیر کسی نبی کی قیادت کے برپا کی گئی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر آپ اس تحریک کی عظمت اور اس کے عالی مقام کا اندازہ خود لگا سکتے ہیں۔ رسالہ صوت الحق اور اس کے بانی و مدیر بھی، اس عالی مقام تحریک کے داعی و معاون اور مددگار رہیں۔

دین کو مذہب میں تبدیل کرنے میں سب سے بڑا سبب عبادت کا غلط تصور ہوتا ہے۔ اگر عبادت کا یہ صحیح تصور کہ عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کرنا ہے، پیش نظر رہے، تو دین اپنی، اصلی صورت پر قائم و باقی رہتا ہے۔ لیکن اگر بد قسمتی سے عبادت کے معنی ہی پرستش اور پوجا کے لئے جانے لگیں تو دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ حاکمیت الٰہیہ کا قیام اور دین خداوندی کے اجراء کا دارومدار عبادت کے صحیح تصور پر منحصر ہوتا ہے۔

عبادت کے معنی اطاعت و محکومیت کے ہیں، عبادت کے مفہوم میں پرستش کا کوئی تصور داخل نہیں ہو سکتا، اس مضمون کا مقصد ماسکہ ہی یہ ہے کہ اس میں جناب کی خدمت عالی میں یہ بات پیش کی جائے گی کہ عبادت کا مفہوم صرف محکومیت، تابعداری اور غلامی ہے۔ اس میں کسی طرف سے بھی پرستش کا تصور داخل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن عبادت کے معنی میں پرستش کا مفہوم اس طرح داخل ہو گیا کہ "قرآن کریم عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے، اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، نزول قرآن کے زمانے میں دین

کہیں باقی نہیں رہا تھا ہر جگہ مذہب ہی مذہب تھا۔ مذہب میں اللہ کی محکومیت نہیں بلکہ اس کی پرستش کا تصور ہوتا ہے اس اعتبار سے عربی بولنے والے اہل مذاہب (اور مشرکین عرب) میں اس لفظ (عبادت) کا مفہوم پرستش میں بدل چکا تھا۔ بنابریں قرآن کریم میں جہاں اس لفظ کی نسبت ان کی طرف جائے گی تو اُن کے مفہوم کے اعتبار سے اس کے پرستش ہوں گے۔ لیکن جب یہ قرآن میں پیش کردہ اللہ کے تصور اور اس پر ایمان لانے والی جماعت (مومنین) کی طرف منسوب ہوگا تو اس سے مراد اللہ کی حاکمیت اور اس جماعت کی طرف سے اس کی محکومیت کا مفہوم سامنے آئے گا۔"

(اقتباس از مطالب الفرقان جلد اول ص36)

"لہٰذا قرآن حکیم جہاں اللہ کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں اس کے معنی اللہ کے نظام وقوانین کی برضا ورغبت اطاعت کے ہوں گے۔ اور جہاں طاغوت اور شیطان کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں اس سے مفہوم یا تو انسان کے خود اپنے جذبات کی اطاعت ہوگی یا دوسرے انسانوں کے احکام کی اطاعت۔ ان میں مستبد حکمران کی محکومیت اور مذہبی پیشواوں کی عقیدت مندانہ اطاعت شامل ہوگی۔ اور جہاں بتوں یا دیوی دیوتاوں کی عبادت کا ذکر ہوگا وہاں ان کی توہم پرستانہ پرستش مفہوم ہوگا۔ ان کی پرستش کا جذبہ محرکہ بھی وہی ہوتا ہے جو بادشاہوں کے سامنے جھکنے کا ہے" از مشتاق احمد خان۔

یہ دو مختصر لیکن بہت جامع اقتباسات جناب نے ملاحظہ فرمائے۔ اب تصریف آیات کے ساتھ عبادت قرآنی مفہوم پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھیں کہ نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں، اس کے مفہوم میں پرستش شامل نہیں ہوتی۔ عربی کی درسی اور متداول مشہور لغت "مصباح اللغاۃ" میں العبد کے معنی غلام اور العابد کے معنی خادم لکھے ہیں۔ اعبد الغلام۔ غلام بنانا، تعبدہ کے معنی، غلام بنانا اور اطاعت کے لئے بلانا تحریر کئے ہیں لغت کے ان بنیادی معانی میں کسی جگہ بھی پرستش کا تصور داخل نہیں ہوتا۔

(1) قرآن کریم میں آتا ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمْ

الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ (2/178) اے مومنوں، جولوگ (ناحق مار ڈالے جائیں ان کے بدلے میں تم کوجان کے بدلے جان لینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، اور غلام کے بدلے غلام، یہاں تو قرآن کریم نے عبد کا لفظ حُر کے مقابلے میں استعمال کیا ہے۔ عبد اطاعت کرتا ہے اپنے مالک کی پرستش نہیں کرتا دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ وَّ مَنْ رَّزَقْنٰہُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَہُوَ یُنْفِقُ مِنْہُ سِرًّا وَّ جَہْرًا ہَلْ یَسْتَوٗنَ (16/75) ایک مثال اللہ نے بیان فرمائی کہ ایک غلام ہے جو دوسرے کی ملک ہے اور کچھ بھی اختیار نہیں رکھتا اور ایک شخص وہ ہے کہ ہم نے اُسے اپنی بارگاہ سے روزی دے رکھی ہے تو وہ اس میں سے چھپاکے، دکھلاکے، (ہر طرح) خرچ کرتا ہے، کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں یہاں عبد کے مفہوم میں خود اپنے آپ کا مالک نہ ہونا، یعنی خود دوسرے کی ملکیت ہونا، اور کسی چیز کا بھی مالک نہ ہونا، سب کچھ بیان فرمایا گیا ہے، اس کا تقابل اس شخص سے کیا گیا ہے، جو صاحب رزق ہے، اور اس کو ظاہراً اور پوشیدہ دونوں طرح سے خرچ کرتا ہے، لیکن کسی جگہ پرستش کا کوئی تصور سامنے نہیں آتا۔

(2) ارشاد ہوتا ہے اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (19/93) (ترجمہ) سارے آسمان و زمین میں جو بھی ہے سب کے سب اللہ کے سامنے بندہ بن کر آئیں گے۔ قیامت کے دن ہر ایک کی حاضری کی نوعیت واضح فرمادی کہ سب اللہ کے مطیع و فرمانبردار ہوں گے، سب اللہ کے حضورؐ ایک بندے کی حیثیت سے حاضر ہوں گے اور جہاں تک بندے ہونے کا تعلق ہے، اس اعتبار سے سب برابر ہوں گے۔

(3) وَ لَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُہَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِیْ ہٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ (21/105-106) ترجمہ اور ہم نے توریت کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ رُوئے زمین کے وارث ہمارے نیک بندے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں عبادت کرنے والوں کے لئے ایک پیغام ہے اور

پیغام یہ بنیادی قانون ہے کہ دنیا کی حکمرانی میرے ان بندوں کے حصہ میں آئے گی جن میں اس کی صلاحیت اور قابلیت ہوگی اور جو ہمارے اطاعت گزار ہوں گے۔ آپ اس آیہ کریمہ پر غور فرمائیں کہ یہاں عابدین، اطاعت گزاروں کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ پرستش کرنے والوں کے لئے نہیں کیونکہ حکومت کے لئے صلاحیت اور قابلیت شرط ہے، پرستش نہیں۔

قرآن کریم میں بے شمار جگہ **الذین آمنو وعملو الصالحات** آیا ہے۔ یعنی وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمال صالحہ کئے۔ ہماری پیشوائیت نے ہمارے ذہن اس درجہ پرستش کے خوگر بنادیئے ہیں کہ ہم جب بھی یہ الفاظ پڑھتے ہیں تو ہمارے ذہن فوراً پرستش یعنی روزہ، نماز کی طرف منعطف ہوتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ان ہی علماء کرام کے مطابق یہ تمام آیات جن میں یہ الفاظ آئے ہیں، وہ سب مکی آیات ہیں۔ اور نماز کا حکم ہجرت سے چند ماہ پیشتر معراج شریف میں ہوا ہے اور روزہ تو ہجرت کے بعد دوسری ہجری میں فرض ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب نماز روزہ، اتنے بعد میں فرض ہوئے تو یہ وہ اعمال صالحہ نہیں ہوسکتے جن کا ذکر مکی آیات میں آتا ہے۔ قرآن کریم نے جن اعمال کو اعمال صالحہ کہا ہے وہ وہ اعمال ہیں جن سے انسانوں میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی قابلیت و استعداد پیدا ہوئی ہے جن سے تعمیری نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ ان اعمال کے حاملین کو قرآن نے صالحین کہا ہے اور انہیں کی وضاحت اس آیت میں عابدین سے کردی گئی ہے، اس جگہ دور دور تک پرستش کا شائبہ نظر نہیں آتا۔

(4) **وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ** (16/36) (ترجمہ) ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا (جو یہ کہتا تھا کہ) اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے بچو۔ یہاں عبادت اور طاغوت کو ایک دوسرے کی ضد کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ طاغوت کے متعلق فرمایا **يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ** (4-60) ان کا ارادہ یہ ہے کہ وہ طاغوت سے فیصلے کرائیں۔ یہاں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے فیصلہ نہ کرانے کو عبادت قرار دیا گیا ہے۔ مزید وضاحت کے

لئے عرض ہے کہ طاغوت سے اجتناب کے معنی یہ ہیں کہ معاملات کے فیصلے غیر اللہ کی قوانین کے مطابق نہ کرائے جائیں بلکہ ان کے فیصلے قوانین خداوندی کے مطابق کرائے جائیں، اسی کو اُعبــد واللــہ کہا گیا ہے یعنی اللہ کی محکومیت وعبودیت اختیار کرنا، اور یہی عبادت ہے۔ اسلامی حکومت کے فیصلوں کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہے، نہ کہ پرستش کی رسوم کا ادا کرنا۔

(5) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (9/31) (ترجمہ) ان لوگوں نے تو اپنے اللہ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور اپنے زاہدوں کو اور مریم کے بیٹے مسیح کو اپنا پروردگار بنا ڈالا ہے۔ حالانکہ اُنہیں اس کے علاوہ اور کوئی حکم ہی نہیں دیا گیا تھا کہ خدائے یکتا کی عبادت کریں اس کے علاوہ اور کوئی حاکم نہیں، ارشاد یہ ہورہا ہے کہ یہود و نصاریٰ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر، اپنے احبار ورہبان کے احکامات کی اطاعت کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں۔ یہاں یہ بات خوب واضح ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار ورُہبان کی اطاعت کرتے تھے، ان کی پرستش نہیں کرتے تھے یہاں جو عبادت کا لفظ آیا ہے وہ ان احبار ورُہبان کی اطاعت کرنے کے مقابل آیا ہے کہ احبار ورُہبان کی اطاعت کرنے کے بجائے انہیں اللہ کی اطاعت کرنی چاہئے تھی۔ پرستش کا ذکر نہ تو یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہوا ہے، اور نہ ہی اس کی تردید ہیں، وہاں بھی اطاعت کا ہی ذکر ہے اور ان کی تردید میں بھی عبادت کے معنی اطاعت ہی مقصود ہوسکتے ہیں۔

اس آیت کے بارے میں ایک حدیث شریف اس درجہ مشہور ہے کہ اس کا حوالہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عدی بن حاتم نے حضورؐ کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ یہود و نصاریٰ اپنے احبار ورُہبان کو رب تو نہیں مانتے، حضورؐ نے فرمایا کہ یہ بات نہیں ہے کہ جو وہ حرام کردیں اس کو وہ حرام مان لیتے ہیں اور جس کو وہ جائز قرار دے دیں، اس کو وہ جائز مان لیتے ہیں بولے یہ بات تو ٹھیک ہے، حضورؐ نے فرمایا بس یہی ان کو رب بنانا ہے

اور یہی ان کی عبادت کرنا ہے۔

(6) مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3/79) کسی بشر کی یہ شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، حکومت اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میری اطاعت کرو، اس آیہ کریمہ میں کونوا عبادا لی ہیں، میں پرستش کا مفہوم آ ہی نہیں سکتا کیونکہ کسی بھی رسول نے یہ نہیں کہا کہ میری پرستش کرو۔ اس لئے اس کی تردید ہی بے معنی تھی۔ یہاں ارشاد یہی ہو رہا ہے کہ کوئی رسول بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے احکام کی اطاعت کرو، یہاں عبادت کے معنی صرف محکومیت میں ہو سکتے، پرستش کسی حال میں بھی نہیں ہو سکتے۔

(7) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12/40) (ترجمہ) حکومت صرف اللہ کے لئے ہے اس کا حکم ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی اور کی محکومیت اختیار نہ کرو، اور یہی دین قیم ہے۔

اس آیہ کریمہ میں پہلے ان الحکم الا للہ، حکومت صرف اللہ کے لئے ہے اور اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ، اس کا حکم ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ یہاں اگر آپ عبادت سے مراد پرستش لیں گے تو یہ معنی بالکل بے ربط ہوں گے، یعنی یہ معنی ہوں گے کہ حکومت تو صرف اللہ کے لئے ہے۔ تم صرف اسی کی پرستش کرو۔ حالانکہ اللہ کی پرستش تو کسی ملک اور کسی حکومت میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس لئے یہاں درست معنی صرف محکومیت ہی ہو سکتے ہیں اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کی عبادت کے معنی ہی اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے، پرستش کی رسوم ادا کرنا نہیں ہے۔

(8) ارشاد ہوتا ہے لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (18/110) (ترجمہ) چاہیے کہ اللہ کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے، دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا (18/26) اللہ اپنی حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ ان دونوں آیات میں سے پہلی آیت میں عبادت کا لفظ آیا ہے اور اسی مفہوم کی ادائیگی کے لئے دوسری آیت

میں حکومت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں

(9) اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (36/60-61) اے آدم کی اولاد کیا میں نے تمہارے پاس یہ حکم نہیں بھیجا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرنا وہ یقیناً تمہارا کھلا دشمن ہے اور صرف میری عبادت کرنا کہ یہ سیدھی راہ ہے۔ اس آیت میں شیطان کی عبادت سے منع کیا گیا ہے اب ظاہر ہے کہ کوئی بھی شیطان کی پرستش نہیں کرتا، اس کی اطاعت ہی کر سکتے ہیں اس لئے عبادت کے معنی اطاعت کے ہی ہیں اور یہی حکم ہوتا ہے کہ میری اطاعت کرو، یہی راستہ درست ہے۔

(10) الَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ يَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰى (39/17) (ترجمہ) جو لوگ طاغوت سے بچے رہے اور اللہ کی طرف رجوع کیا ان کے لئے بشارت ہے۔ طاغوت کی وضاحت اس سے پیشتر کی جا چکی ہے کہ طاغوت ہر وہ اتھارٹی ہے جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق فیصلے کرتی ہے اس میں وہ لیڈر اور حکمران بھی شامل ہیں جو انسانوں کے وضع کردہ قوانین جاری کرتے ہیں، ان اداروں اور ان لیڈروں کی اطاعت کی جاتی ہے۔ ان کی پرستش تو کوئی بھی نہیں کرتا، یہاں **یعبدوھا** کے معنی اطاعت کرنے کے ہی ہو سکتے ہیں پرستش کرنے کے نہیں ہو سکتے۔

(11) سورۂ شعراء میں آتا ہے کہ فرعون سے حضرت موسیٰ کو اپنے احسانات جتلاتے ہوئے کہا تھا کہ اس نے حضرت موسیٰ کی پرورش کی تھی۔ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ نے فرعون سے فرمایا کہ تم اپنا یہ احسان مجھے اپنے اس ظلم عظیم کو جائز ثابت کرنے کے لئے جتا رہے ہو کہ تم نے بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا ہے اس لئے قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے فرمایا وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (26/22) ترجمہ، اور یہ بھی کوئی احسان ہے جسے تو جتلا رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو محکوم بنا رکھا ہے۔ غور فرمائیں کہ یہاں عبدت کا لفظ استعمال کیا گیا تھا کہ تو نے محکوم بنا رکھا ہے۔ یہاں سے عبادت کا صحیح مفہوم یعنی محکومیت خوب واضح ہو جاتا ہے۔

کیونکہ بنی اسرائیل فرعون کی محکومیت میں تھے، وہ اس کی پرستش نہیں کرتے تھے۔

(12) وَاِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ
فَقَالُوْۤا اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ (23/46-47)
(ترجمہ) اور ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فرعون اور اس کے امراء کی طرف بھیجا تو انہوں نے شیخی کی اور وہ سرکش لوگ تھے وہ آپس میں کہنے لگے کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں حالانکہ ان دونوں کی قوم ہماری محکوم ہے۔ یہاں تمام مترجمین اور مفسرین نے عبدون کا ترجمہ محکوم ہی کیا ہے کہ کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ ان کی قوم بنی اسرائیل، قوم فرعون کی پرستش کرتی تھی نیز یہ کہ ان دو آیات میں عبدون کا لفظ عالین کے مقابلہ میں لایا گیا ہے۔ عالین کے معنی سرکش اور مغرور کے ہیں اس لئے عبدون کے معنی محکوم کے ہوں گے، پرستندہ کے نہیں ہوسکتے۔

(13) ارشاد ہوتا ہے اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ (37/22) (ترجمہ) (اس وقت فرشتوں کو حکم ہوگا) کہ جو لوگ دنیا میں سرکشی کرتے تھے، ان کو اور ان کے ساتھیوں کو اور اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کرتے تھے ان سب کو اکھٹا کرو پھر انہیں جہنم کی راہ دکھاؤ۔ قرآن کریم میں مختلف مقامات پر جہنم میں لیڈروں اور عوام کے مکالمے درج ہوئے ہیں، جن میں لیڈر اور عوام ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں ملاحظہ ہو (33/68)
34/31، 37/27) یہاں بھی یہی حکم دیا جارہا ہے کہ عام لوگ جنہوں نے ظلم کیا اور ان کے ہم فکر لوگ اور ان لوگوں کو جن کی یہ اطاعت و فرمانبرداری کرتے تھے، انہیں جمع کرو، اور انہیں دوزخ کی راہ پر چلاؤ، یہاں "ما كانوا يعبدون" کا ترجمہ جن کی وہ اطاعت کرتے تھے ہی ہوسکتا ہے، جن کی وہ پرستش کرتے تھے۔ یعنی بت نہیں ہوسکتا، کیونکہ بتوں کو جمع کرکے، دوزخ کی راہ دکھانا، بے معنی بات معلوم ہوتی ہے، یہاں عبادت کے معنی صرف محکومیت کے ہوسکتے ہیں۔

(14) ارشاد عالی ہے فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا وَّ اشْكُرُوْا

نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (16/114) تو اللہ نے تمہیں جو چیزیں جائز و پاکیزہ دے رکھی ہیں ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اس کی محکومیت اختیار کرتے ہو۔ اگر تم اللہ کی محکومیت اختیار کر رہے ہو تو صرف حلال و طیب چیزیں کھاؤ اور حرام سے اجتناب کرو، پرستش حرام و حرام کی پابندی عائد نہیں کر سکتی۔

(15) قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (17/23)(ترجمہ) تیرے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کے علاوہ اور کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، آیہ کریمہ میں والدین کے ساتھ نیک سلوک کرنے پر اصرار کیا جا رہا ہے اس لئے فرمایا کہ بے شک والدین کی اطاعت تو فرض نہیں ہے، لیکن ان کے ساتھ حد درجہ نیک سلوک کرنا ضروری ہے۔ اطاعت تو صرف اللہ کی ہے، یہاں بیان اور مقابلہ اطاعت کا ہو رہا ہے، پرستش کا نہیں، کیونکہ والدین کی کوئی پرستش نہیں کرتا۔ حکم یہ ہو رہا ہے کہ اطاعت صرف اللہ کی ہے اور نیک سلوک والدین کے لئے۔ پرستش نہ والدین کے لئے ہے نہ اللہ کے لئے، اللہ کے لئے اطاعت کا حکم ہے اور والدین کے لئے نیک سلوک کا۔

قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر انبیائے کرام کی تعریف اور توصیف کے لئے مختلف الفاظ آتے ہیں ان میں سے چند پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں۔

(1) حضرت نوح کے لئے ارشاد ہوتا ہے اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (17/3) بے شک نوح بڑا شکر گزار بندہ تھا۔

(2) حضرت ابراہیم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ (11/75) بے شک ابراہیم بردبار، و نرم دل اور اللہ سے رجوع کرنے والے تھے۔

(3) وَ اذْكُرْ فِى الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19/41) قرآن میں ابراہیم کا بھی تذکرہ کرو، اس میں شک نہیں کہ وہ بڑے سچے نبی تھے۔

(4) حضرت ادریس کے لئے ارشاد ہوتا ہے اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (19/56) اس میں شک نہیں کہ وہ (ادریس) بڑے سچے نبی تھے۔

(5) حضرت موسیٰ کے لئے ارشاد ہوتا ہے اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19/51)

(6) حضرت اسماعیل کے لئے ارشاد ہوتا ہے اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (19/54)

یہ صرف چند آیات، جن میں انبیاء کرام کے لئے صدیق، صادق الوعد، شکور، اواہ، منیب، اور حلیم بیان کی گئیں ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں کسی جگہ بھی کسی نبی کی تعریف میں پرستش کرنے والا، یعنی پرستندہ کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ جب دین میں تو پرستش کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی، تو پھر نماز کے متعلق سوال سامنے آتا ہے کہ نماز کی کیا پوزیشن رہ جاتی ہے۔ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا حکم بالکل واضح ہے، صلوٰۃ انبیاء سابقہ کے دین کا بھی ایک حصہ تھی اور سابقہ امتوں پر بھی فرض تھی (19/55، 10/87، 20/132) ہم پر بھی صلوٰۃ فرض ہے جس کی ادائیگی ہم پر فرض ہے۔ دین یعنی مکمل ضابطۂ حیات تو شروع سے ایک ہی چلا آرہا ہے۔ لیکن اس کے جزوی احکامات اور اُن احکامات کی APPLICATION میں تبدیلی ہوتی چلی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ سابقہ اُمتوں کی صلوٰۃ وہ نہیں تھی جو ہم مسلمانوں پر معراج کے موقع پر فرض کی گئی تھی۔ اس لئے صلوٰۃ میں بھی وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوسکتی ہے کہ وہ پرستش کے زمرہ میں نہ آئے بلکہ وہ دین کے نظام کے قیام کا ذریعہ بنتی چلی جائے۔ قرآن کریم میں حکم ہوتا ہے اقیموا الصلوٰۃ اور اسی طرح حکم ہوتا ہے اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5-8) (ترجمہ) عدل قائم کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ عدل حضورؐ کے زمانہ میں بھی ہوتا تھا لیکن اس کا بالکل سادہ طریقہ تھا کہ دونوں فریقوں کو صلوٰۃ کے بعد روک لو، پھر دونوں فریق قسم کھائیں اور گواہوں کی شہادت ہو، اور اس پر فیصلہ صادر کردیا جائے (5/106) لیکن اب عدل کرنے کے بالکل مختلف طریقے ہیں جو بہت SOPHISTICATED ہیں۔ ان میں انگوٹھے کے نشانات DNA کے نتائج، فوٹوسٹیٹ کاپیاں، استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کریم میں دشمن کے مقابلہ کے لئے قوۃ فراہم کرنے کا حکم ہے۔ حضورؐ کے دور میں

تیر کمان، تلوار ڈھال، عمدہ گھوڑے، قوت جمع کرنے کا طریقہ تھا۔ اب اس دور میں ٹینک، اور NECLEAR WEAPONS استعمال ہوتے ہیں، آیت میں قوۃ کا لفظ نکرہ کے طور پر استعمال ہوا ہے، جس میں ہر قسم کی قوت شامل ہے اس میں معاشرہ کی معاشی خوش حالی بھی قوۃ میں شامل ہوسکتی ہے۔ سول سوسائٹی بھی قوۃ میں شامل ہے۔ قرآن میں جس طرح اعدلوا کا لفظ بطور حکم کے استعمال ہوا ہے، اسی طرح **اقیمو ا الصلوٰۃ** کا لفظ بطور ایک حکم کے آیا ہے۔ جس طرح عدل کے طریقے اور قوت جمع کرنے کے طریقے بدل سکتے ہیں۔ اسی طرح صلوٰۃ کے طریقے بھی بدل سکتے ہیں۔ اسلامی حکومت قائم کرنے کے لئے جو طریقے بھی استعمال کئے جائیں، ان سب پر اقامت صلوٰۃ کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

یہ بات کہ عدل کرنا اور قوۃ جمع کرنا تو دنیاوی معاملات ہیں، اس لئے ان میں تبدیلی ہوسکتی ہے، لیکن اقامت صلوٰۃ ایک عبادت ہے اور دینی معاملہ ہے، اس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی۔ تو یہ بھی ایک مغالطہ ہے قرآن کریم کی رُو سے دین و دنیا کی کوئی تفریق ہیں، اور نہ ہی عبادات معاملات سے کوئی الگ چیز ہیں، اس لئے جس طرح عدل کرنے، اور قوت جمع کرنے کے طریقے بدل سکتے ہیں، اسی طرح اقامت صلوٰۃ کے طریقے بھی بدل سکتے ہیں۔ اصل اور بُنیادی مقصد تو دین کا قیام ہے۔ ہر وہ کوشش جو اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کی جائے، وہ اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہوگی۔ ہم اپنی موجودہ نمازوں میں اسلامی حکومت کے قیام کی کوششیں شامل کردیں تو یہی نماز صلوٰۃ میں تبدیل ہوجائے گی اور پرستش کے زمرہ سے نکل جائے گی اور جس دن ہم نے نماز کو صلوٰۃ میں تبدیل کردیا، ہمارا ادبار ہمارے اقبال میں بدلنا شروع ہوجائے گا۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرو   یک کار ازیں دوکار می
یاتن برضائے یار باید دار   یا قطع نظر ز یار می باید کرو

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

قرآن کریم کی رُو سے نیکی کیا ہے

جب کوئی قوم بے عمل ہو کر، حد درجہ زوال پذیر ہو جاتی ہے، تو اس کے عمائدین اور اکابرین کا یہ شیوہ ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی خوش نما اور دلکش قسم کی باتیں کرتے ہیں۔ نئی نئی سکیمیں پیش کرتے ہیں۔ قوم کو آئندہ کے لئے خوش خبریاں سناتے ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں اور دعوؤں کے مطابق کام بالکل نہیں کرتے بلکہ اس کے برخلاف اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ ان کی قوم ان کی شان میں قصیدے پڑھتی رہے اور یہ سوال نہ کرے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والے لیڈروں کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3/188) ترجمہ انہوں نے کیا کرایا خاک بھی نہیں لیکن اپنی تعریف کے (ہر وقت) خواستگار رہتے ہیں۔ اس آیہ کریمہ نے ہمارے سابقہ اور موجودہ لیڈروں کا صحیح نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ پاکستان میں 62 سال سے یہی ہوتا چلا آرہا ہے۔ چند روز پیشتر جبکہ موجودہ حکومت کو ایک سال ہو گیا تھا۔ تو اس کی تعریف و توصیف میں اخبارات میں اس حکومت کی کامیابیوں کی ایک لسٹ شائع ہوئی تھی۔ اس لسٹ میں چند اور کاموں کا ذکر تھا اور اس میں ایک شق ان الفاظ میں بھی تحریر تھی "متاثرین مالاکنڈ" کی بحالی اور تعمیر نو میں غیر معمولی دلچسپی (ڈان مورخہ 10 اکتوبر 2009ء)

قرآن کریم نے جگہ جگہ یہودیوں کی پست اخلاقی بدکرداری اور ان کے جرائم کی نشاندہی کی ہے۔ ان کے جرائم میں سے ایک جرم کے متعلق کچھ مختصر سا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے میں سے ایک طبقہ کو مفلس و غریب بنا دیتے

تھے اور اس کے بعد انہیں ان کے گھروں سے نکال دیتے تھے، ان دربدر، خاک بسر لوگوں کو طاقتور قبائل قید کر لیتے تھے۔ اس کے بعد یہودی علماء اس قسم کے وعظ کرتے تھے جن میں قیدیوں کو چھڑانے کے ثواب بیان کئے جاتے تھے۔ چنانچہ یہودی ان قیدیوں کو چھڑانے کے لئے چندے کرتے تھے اور ان رقوم کو ادا کر کے ان قیدی یہودیوں کو قید سے چھڑاتے تھے۔ قرآن کریم ان سے کہتا ہے کہ اس تمام کام کی سرانجام دہی میں تم اپنے آپ کو کس طرح دھوکے میں مبتلا رکھتے ہو، قیدیوں کے آزاد کرانے کا ثواب تو تم کماتے ہو، لیکن اتنا نہیں سوچتے کہ ان کو اس حالت تک تم ہی نے پہنچایا تھا۔ ان کو اس حالت تک پہنچانا کس قدر بڑا جرم ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کرتے وقت تو تمہیں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ پھر خود ہی اپنے جرم کا مداوا کرنے کو تم نیکیاں شمار کرتے ہو حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (2/85) اصل بات تو یہ ہے کہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لئے منع تھا۔ قرآن کریم آگاہ کرتا ہے کہ جو لوگ اس قسم کے کام کرتے ہیں کہ خود ہی جرائم کرنا، اور خود ہی اس کا ازالہ کرنا، ان کے لئے دنیا میں بھی گھاٹا ہے وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (2/85) اور قیامت کے دن بھی وہ سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔" اُجڑے ہوئے لوگوں کو دوبارہ بسانا، خواہ وہ یہودی کرتے ہوں، یا یہ ہماری حکومت نے کیا، قرآن کریم اس کو نیکی شمار نہیں کرتا۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک یہ نیکی کیوں نہیں ہے، اس کا جواب ان چند مثالوں میں ملاحظہ فرمائیں۔

(1) میں اپنے کسی ماتحت سے اس کی دیانتداری کی وجہ سے خائف ہوں۔ اس کو بددیانتی کے کسی جھوٹے کیس میں ملوث کرا کر عملاً اس کو نوکری سے برخاست کرا دیتا ہوں وہ نوکری سے برخاست ہو کر، پیسہ پیسہ کا محتاج ہو جاتا ہے میں اس کی مالی حالت پر رحم کھا کر، وقتاً فوقتاً اس کی کچھ مدد کر دیتا ہوں۔ اس کی یہ مدد نیکی میں شمار نہیں ہو سکتی۔

(2) میں فراڈ کر کے، کسی شخص کی کثیر رقم بینک سے ناجائز طریقہ سے ہتھیا لیتا ہوں جس کا اس کو علم تک نہیں ہوتا۔ وہ شخص کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جاتا ہے تو میں اس کے ساتھ حسن سلوک کر کے، اس کی کچھ مدد کرتا رہتا ہوں، میری یہ مدد نیکی نہیں ہو سکتی۔

(3) سر گنگا رام سخت کٹر قسم کے ہندو تھے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ انہوں نے اسلام کا مطالعہ بھی کیا تھا، لیکن اس کے باوجود سخت ہندو رہے اور ظاہر ہے کہ وہ اسلامی نظام کے سخت مخالف تھے جو انسانیت کے تمام دکھوں کا واحد علاج ہے۔ انسانوں کی تمام مصیبتوں کی اصل وجہ باطل نظام ہوتا ہے۔ باطل نظام کا ساتھ دینا ایک ایسا جرم عظیم ہے جس کا مداوا کسی بھی طرح نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے ایک ہسپتال بھی لاہور میں قائم کیا۔ جس میں بے شمار مریضوں کا علاج ہوتا ہے، ہسپتال کا قائم کرنا، باطل نظام کی حمایت کرنے کا مداوا ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ معاشرے کو غلط بنیادوں پر قائم کرنے کے جرم عظیم کے مقابلے میں کوئی بھی نیکی اپنا وزن نہیں رکھتی۔

(4) ہندو معاشرے میں بڑے بڑے ساہوکار سُود پر مبنی کاروبار کر کے لاکھوں کروڑوں روپوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ ان کے کارخانوں میں جو مزدور کام کرتے ہیں وہ ان کا خون چوس لیتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے چھوٹے بچے خوراک اور تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ لیکن وہی ہندو سیٹھ "دان پون" اور خیرات کے کام کرتے ہیں۔ گھوڑوں اور دیگر جانوروں کے پانی پینے کے TROUGH بناتے ہیں۔ جس سے وہ جانور گرمی کی دُھوپ میں پانی پیتے ہیں۔ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر قائم کرنے کا وہ جرم عظیم جس کے وہ مُرتکب ہوتے ہیں۔ ان چند نیکیوں کی وجہ سے معاف کیا جاسکتا ہے خوب یاد رکھیئے انسانیت پر ظلم کرنے والے باطل نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں ثواب کا باعث بھی نہیں بن سکتیں۔ غلط نظام قائم کرنے والے اس قسم کی انفرادی نیکیوں کے باوجود ظالم رہتے ہیں۔

(5) بعض بڑے بڑے بادشاہوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بادشاہ بہت نیک تھے، نماز، نوافل، سنتوں اور تہجد کے پابند تھے۔ قرآن لکھ کر اپنی روزی کماتے تھے بیشک ان کی ذاتی نیکیاں لائق تعریف ہیں۔ لیکن اُن کا یہ جرم کہ وہ باطل نظام کو جاری رکھ کر، قرآن کریم کے نظام کے قیام میں رکاوٹ بن رہے تھے، انسانیت پر اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

(6) چینی، آٹا، چاول کے بڑے بڑے تاجر CARTEL بنا کر، ان اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کر کے، اربوں روپے ناجائز کما لیتے ہیں جبکہ غریب عوام آٹے، چاول اور چینی کے لئے ترستے ہیں۔ پھر یہی تاجر رمضان کے دوران سینکڑوں روزہ داروں کو مُفت راشن تقسیم کرتے ہیں۔ یہ ناجائز آمدنی حاصل کرنے کے بعد غُرباء کو راشن دینا کوئی نیکی نہیں ہے۔ اصل اور نہایت اہم بات جو ہمیشہ اور ہر وقت پیش نظر رکھنی ضروری اور لازمی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں معاشرہ قائم کرنے کے لئے کوئی احکامات نہیں دیئے گئے اس لئے ان تمام مذاہب میں عبادت کا مفہوم پرستش تک محدود ہو گیا ہے اور صرف چند رسوم کی ادائیگی کو عبادت قرار دے دیا گیا۔ اس کے بالکل برخلاف قرآن کریم نے دین پیش کیا۔ اس میں معاشرے کو قائم کرنے کے لئے احکام و قوانین دیئے گئے ہیں۔ قرآن کے کسی بھی حکم کی اطاعت کرنا عبادت کرنا ہی ہے۔ قرآن میں حکم ہوا يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (24/27)، اے ایمان والوں اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہ ہو۔ اس حکم کی اطاعت کرتے ہوئے جب آپ دوسروں کے گھروں میں بغیر اجازت داخل نہیں ہوں گے، تو اس حکم کی اطاعت عبادت الٰہی کے مرادف ہوگی۔ قرآن کریم میں حکم ہوتا ہے کہ جب قرض دو تو اس کو لکھ لیا کرو يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ (2/282) اے ایمان والو جب ایک میعاد تک کے لئے آپس میں لین دین کرو تو اس کو لکھ لیا کرو، جب آپ اس حکم کی اطاعت کرتے ہیں، تو یہ اللہ کی عبادت ہوتی ہے۔ چونکہ دین کے تمام احکامات کی اطاعت ہی عبادت ہوتی ہے، اس لئے اس میں الگ پرستش کے تصور کو کوئی راہ نہیں ملتی اور نیکی صرف پرستش تک محدود نہیں رہتی بلکہ دین کے تمام احکامات کی اطاعت عبادت اور نیکی بن جاتی ہے۔ قرآن کریم کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22/41) (ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم

انہیں رُوئے زمین پر قابو دیں تو یہ لوگ صلوٰۃ ادا کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، اچھے کاموں کا حکم کریں گے، اور بُری باتوں سے روکیں گے اور تمام اُمور کے فیصلے اللہ کے قانون کے مطابق کریں گے۔ اس آیہ کریمہ میں اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور تمام امور کا فیصلہ قرآن کے مطابق طے کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان پانچوں امور کو قرآن کریم ایک سطح (LEVEL) پر رکھتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں نماز پڑھنا، اور زکوٰۃ دینے کو عبادت میں داخل کر دیا جاتا ہے اور امر المعروف، نہی عن المنکر اور تمام امور کا فیصلہ قرآن کے مطابق کرنا، ان تین امور کو عبادت میں شامل نہیں کیا جاتا۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے ان پانچوں امور کی اطاعت عبادت ہے۔ دین میں عبادت کو معاملات سے الگ کر ہی نہیں سکتے ارشاد ہوتا ہے۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5/8) عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے مذہب میں تقویٰ کو پرستش کی انتہا خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن اس کو عبادت میں شامل کرتا ہے۔

مذہب میں تقویٰ کا مفہوم پرستش، نماز و نوافل، پڑھنا، تورع و تخشع، زاویہ گیری و گوشہ نشینی ہوتا ہے۔ لیکن دین میں تقویٰ کے یہ معنی نہیں ہوتے دین میں تقویٰ کے معنی اسلامی مملکت کے احکامات کی خلاف ورزی کے بُرے نتائج سے بچنے کے ہیں۔ ایک شخص لاہور سے بذریعہ ٹرین کراچی جاتا ہے وہ عملاً ریل کا ٹکٹ نہیں خریدتا راستہ میں اس کی CHECKING ہو جاتی ہے۔ اسے نہ صرف ریل کا کرایہ ادا کرنا ہوتا ہے بلکہ کرایہ کے علاوہ اس کو جُرمانہ (PENALTY) بھی ادا کرنا ہوتا ہے، اس جُرمانہ سے بچنے کا نام تقویٰ ہے ۔ ایک شخص موٹر چلا رہا ہے اور وہ سگنل کی پروا کئے بغیر سگنل کو CROSS کر جاتا ہے جس کے نتیجہ میں اس کی دوسری کار سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ کار کا اس ٹکر سے بچنا تقویٰ ہے۔

یہ بات بھی خیال شریف میں رکھیں کہ اسلامی حکومت میں جرم اور گناہ، یعنی CRIME اور SIN ایک ہو جاتے ہیں۔ جو جرم کرتا ہے وہ گناہ کا بھی مرتکب ہوتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں جو عام مفہوم کے مطابق مذہبی لوگ ہوں گے جو گناہ نہیں کریں گے وہ

جرائم بھی نہیں کریں گے۔ایک شخص سخت گرمی کے باوجود روزہ نہیں توڑتا،لیکن وہ سگنل عبور کرجاتا ہے۔ اسلامی حکومت میں سگنل عبور کرنا، روزہ توڑنے کے برابر ہوگا، اس لئے اسلامی حکومت میں جو شخص روزہ نہیں توڑے گا وہ سگنل بھی عبور نہیں کرے گا۔ ہمارے اس معاشرے میں جو لوگ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، وہ ٹیکس چوری کرتے ہیں اس میں وہ کوئی بُرائی نہیں سمجھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ نہ دینے سے گناہ ہوتا ہے، لیکن ٹیکس ادانہ کرنے سے کوئی گناہ نہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ ادانہ کرنا ان کے نزدیک گناہ ہے اور ٹیکس ادانہ کرنا گناہ نہیں ہے صرف جُرم ہے۔لیکن جب جُرم اور گناہ ایک ہوجائیں گے تو جو گناہ نہیں کرتا وہ جُرم بھی نہیں کرے گا۔ یہ وجہ ہے کہ اسلامی حکومت میں جرائم از خود کم ہوتے چلے جائیں گے۔

جرائم کی نوعیت بھی اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں میں مختلف ہوتی ہے۔ایک شخص سیکولر حکومت میں چوری کرتا ہے۔اس کو ایک سال کی سزا مل جاتی ہے۔معاشرے نے اس کو ایک سال کی سزا اس لئے دی کہ معاشرہ آئندہ چوریوں سے محفوظ ہوگیا اور چور کو بھی سزا مل گئی وہ آئندہ چوری سے باز رہے گا لیکن اس چوری کے جُرم سے اس کی ذات پر جو بُرے اثرات مرتب ہوئے تھے وہ اس کی ذات سے دُور نہیں ہوں گے۔اس کا مواخذہ برقرار رہے گا۔لیکن اگر کوئی شخص اسلامی حکومت میں چوری کرتا ہے، اور اس کو اس جُرم کے مطابق سزا مل جاتی ہے تو اس کو معاشرہ کی طرف سے بھی سزا مل گئی اور اس کی ذات کے بُرے اثرات بھی اس سے دور ہوجاتے ہیں کیونکہ اس نے اس چوری کی سزا میں اسلامی حکومت کی اطاعت کی اس سزا سے اس کے جرم اور اس کے گناہ دونوں کا ''کفارہ'' ادا ہوجاتا ہے۔غیر اسلامی حکومت میں معاشرہ کی سزا بھگتنے کے بعد اس جرم کا ازالہ نہیں ہوتا۔ اس کا گناہ برقرار رہتا ہے اور وہ اس کے لئے اللہ و رسول کے ہاں مسئول ہوگا۔

یہ اہم بات بھی ذہن عالی میں محفوظ رکھیں کہ پرستش صرف نماز ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام جو اسلامی نظام کے بغیر انفرادی نجات کے لئے سرانجام دیا جائے وہ پرستش کے زُمرہ میں آتا ہے۔سابقہ سطور میں جو چند مثالیں نیکی کے عنوان میں تحریر کی گئی ہیں وہ سب پرستش کے دائرہ میں آتی ہیں۔تجارت میں بُحران پیدا کرکے، اربوں روپے

لوٹ لینے کے بعد، غُرباء کو مُفت راشن تقسیم کرنا، پرستش کے ذیل میں آتا ہے اس کی دین میں کوئی گنجائش نہیں پرستش کی اصل اور بنیاد ہمارا روحانیت کے متعلق غلط اور خلافِ قرآن عقیدہ ہے۔ اگر روحانیت کے متعلق ہمارا عقیدہ درست ہو جائے تو پرستش اور تصوف کی پوری عمارت خود بخود زمین بوس ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ہماری موجودہ نماز کا تعلق ہے، تو یہ صلوٰۃ موقت کی عملی شکل تصور کی جاسکتی ہے۔ اسی موجودہ نماز میں، اسلامی حکومت کے قیام کے لئے مشورے، کوششیں اور عملی اقدامات شامل کر لئے جائیں، تو یہ نماز صلوٰۃ میں تبدیل ہوسکتی ہے اس کے نتائج بھی آنے شروع ہو جائیں گے، یہ مضمون یہاں ختم ہوتا ہے البتہ ادارہ صوت الحق' کی طرف سے ایک درخواست ضرور کی جاتی ہے۔

جیسا کہ آپ سب قارئین کرام کو علم ہے کہ صدر اوّل کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ دین کے قیام کی کوشش شروع کی گئی ہے۔ اس سے پیشتر ہمیشہ انبیاء کرام نے دین کا نظام قائم فرمایا تھا، یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نبی یا رسول کی قیادت کے بغیر دین کے قیام کی کوشش کی جارہی ہے۔ سارے اسلامی ممالک میں بالکل اندھیرا ہے۔ کسی جگہ بھی دین کا کوئی سُراغ نہیں ملتا۔ ہمارے ملکِ عزیز پاکستان میں سینکڑوں رسالے جو مذہب کے داعی ہیں، برآمد ہو رہے ہیں۔ ہماری حکومت بھی اسلام کے نام پر جو کروڑوں روپے صرف کررہی ہے، وہ صرف مذہب کا احیاء کررہی ہے۔ دین کے قیام کی کوشش کے لئے صرف دو رسالے جاری ہیں۔ یہ دو رسالے ہیں ماہنامہ صوت الحق' اور طلوع اسلام حتیٰ المقدر اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ چونکہ ہمارے ہاں ڈیڑھ ہزار سال کے عرصہ میں کبھی بھی دین کے قیام کی کوشش نہیں ہوئی، اس لئے ہمارے سارے لٹریچر میں، خواہ وہ تفسیر ہو یا احادیث کے مجموعے، فقہ ہو یا تاریخ، کسی جگہ کوئی راہ نمائی نہیں ملتی بانی تحریک اسلام، پر ہزار ہزار رحمتیں ہوں، کہ اس موقر رسالہ کو جو بھی راہنمائی ملتی ہے وہ صرف ان کے لٹریچر سے ملتی ہے۔ اُن کے انتقال کے بعد، دینی فکر اسی جگہ کھڑی ہے جس جگہ اُنہوں نے چھوڑی تھی۔ یہ ادارہ حتیٰ الوسع دینی فکر کو آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے۔ رسالہ صوت الحق کو، اور اس میں مضامین تحریر کرنے والوں کو، اپنی اخلاص نیت پر یقیناً اصرار ہے، لیکن ان کو اپنی

اصابت رائے کا کوئی دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔ اس لئے اس رسالہ کی دردمندانہ گذارش ہے کہ آپ سب حضرات اس رسالہ سے فکری تعاون فرمائیں، اور اس دینی فکر کو آگے بڑھانے میں مدد دیں، اس کے مضامین کا مطالعہ کرنے کے بعد اس رسالہ کو FEED BACK دیں۔ اس کے مضامین پر تبصرہ فرمائیں اور اپنی قیمتی آراء سے اس رسالہ کو آگاہ فرمائیں، کیونکہ مجموعی فکر سے ہی دین کے قیام کی راہیں واہوں گی۔ اگر خدانخواستہ، اس وقت یہ تحریک ناکام ہوگی تو آئندہ ایک ہزار سال تک اس کے دوبارہ برپا ہونے کی اُمید نہیں کی جاسکتی۔ اس بارے میں انقلاب ایران سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ مگر افسوس کہ وہ بھی مذہب کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکے۔ اور انہوں نے مذہب کو ہی بطور دین کے نافذ کرنے کی کوشش کی تھی جو ظاہر ہے کہ کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ تاہم اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین غالب آکر رہے گا اللہ تعالیٰ کے وعدے انسانوں کے ذریعے ہی پورے ہوتے ہیں۔ اب یہ ہماری اجتماعی کوشش پر منحصر ہے کہ جس قدر کوششیں کریں گے، اس محنت کے نتیجہ کے مطابق دین قائم ہوگا۔

دین کا قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں۔ انبیائے کرام کی ذاتِ مُبارک اس کا CORNER STONE ہوتی تھی۔ ان کی مبارک ذات اطاعت کا مرکز ہوتی تھی۔ اس وقت یہ تحریک مرکزی قیادت سے محروم ہے۔ تاہم نا اُمیدی اور مایوسی کی کوئی بات، نیت نہیں خلوص اور مقصد پر پُختہ یقین منزلیں جلدی طے کرا دیتا ہے۔

مُشکلے نیست کہ آسان نہ شود
مرد باید کہ ہراسان نہ شود

##

زمین کے اندر تمام سونا نیکی کا بدل نہیں ہوسکتا۔ افلاطون

اللہ تعالیٰ کے انسانیت کو علم دینے کے طریقے

@@@@@ @@@@ @@@@ @@@@@ @@@@ @@@@ @@@@@ @@@@ @@@@ @@@@@ @@@@@ @

ہم مسلمان چونکہ بحیثیت مجموعی مذہب زدہ اور تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں اس لئے انفرادی پرستش کو تعلق باللہ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔لیکن یہ ذریعہ بڑا کمزور اور مخفی CRYPTIC اور بعض اوقات پُر اسرا MY STERIOUS بھی بن جاتا ہے۔اس ذریعہ کی کوئی تعریف نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اس کے غلط وصحیح قرار دینے کا کوئی معیار ہمارے پاس موجود ہے۔ہر مذہب کے پیرو اس بات کے مدّعی ہیں کہ ان کی مقرر کردہ رسومات سے ہی تعلق باللہ قائم ہوسکتا ہے۔آپ غیر مذاہب سے صرفِ نظر کریں ہم مسلمانوں میں ہر پیر پرست اس بات کا مدّعی ہوتا ہے کہ اُن کے تجویز کردہ چند اوراد وظائف باطنی طور پر تعلق باللہ پیدا کردیتے ہیں۔چونکہ اس کا دارومدار احساسِ قلب پر ہوتا ہے، اسی وجہ سے دنیا میں باطل مذاہب کا وجود باقی رہتا ہے۔قرآن کریم کی رُو سے تعلق باللہ کا صرف ایک ذریعہ ہے اور وہ ہے وحی الٰہی اور اس وحی پر قائم شدہ نظام۔اب چونکہ وحی الٰہی صرف قرآن کے دفتین میں محفوظ ہے اس لئے اب تعلق باللہ کا واحد ذریعہ قرآن کریم ہے۔آپ خود خوب نگاہ دوڑا لیجئے اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ بن ہی نہیں سکتا۔

جب ہم قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہیں تو ہم تخاطب الٰہی سے مُشرّف اور مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوتے ہیں۔لیکن یہ شرف وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے۔ہاں اگر ہم اس کا نظام قائم کرلیں اور اس نظام کی اطاعت کرکے ہمہ وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق مستقل طور پر قائم ہوجاتا ہے **لَا انْفِصَامَ لَهَا** (2/256) اس میں کبھی شکست نہیں ہے۔اس تعلق میں کوئی اخفاء نہیں، کوئی پوشیدگی نہیں۔یہ تعلق علیٰ

الاعلان ہوتا ہے۔ ہر شخص کی آنکھوں کے سامنے، ڈنکے کی چوٹ پر قائم ہوتا ہے۔ چونکہ اس کے نتائج مسلسل سامنے آتے رہتے ہیں، تو ہر شخص اس کو خود اپنی نگاہوں سے دیکھ سکتا ہے۔ خود اس پر عمل کرتا ہے اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس میں کشف والہام اور القاء جیسے چور دروازوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ جن کے ذریعے ہمارے مذہب گزیدہ اور تصوف زدہ حضرات تعلق باللہ قائم کرنے کے مدعی ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انسانیت سے رابطہ قائم کرنے اور اس کو علم دینے کا واحد ذریعہ وحی الٰہی کا نزول ہے۔ اس کے علاوہ الہام، کشف، القاء کے تصورات سب قرآن کریم کے خلاف اور مسلمانوں کی تباہی اور ان کے زوال کا باعث ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے **وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِىْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ** (3/179)

اور اللہ ایسا بھی نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی باتیں بتا دے مگر اللہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے غیب بتانے کے واسطے چن لیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **عٰلِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ** (72/26-27) عالم الغیب صرف اللہ ہے وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا بجز اس کے کہ اپنے رسول کو اس امر کے لئے منتخب کر لے۔ ان دونوں آیات سے خوب اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانیت کو جو بھی علم دیتا تھا وہ صرف انبیاء کرام کی معرفت دیتا تھا، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منتخب ہوتے تھے۔ **اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ** (6/124) اور اللہ جہاں اپنی پیغمبری قرار دیتا ہے اس کو خوب جانتا ہے نیز ارشاد عالی ہے **واللّٰه يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ** (5/105) اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے یہ علم آخری بار حضورؐ کو دیا گیا اور اس کے بعد اس علم کے دروازے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا۔ جبکہ رسول اللہؐ کے متعلق واضح کر دیا گیا کہ ان کا یہ علم یعنی قرآن کریم ساری انسانیت کے لئے قیامت تک کے لئے ہے۔ **يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا** (7/158) اے رسول تم کہہ دو کہ میں تم سب لوگوں کے پاس اللہ کا بھیجا ہوا رسول ہوں۔ **كَآفَّةً لِّلنَّاسِ** (34/28) تمام لوگوں کے لئے **وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا**

یَلۡحَقُوۡا بِهِمۡ (62/3) اوران میں سے ان لوگوں کی طرف بھی بھیجا جو ابھی تک ان سے نہیں ملے۔ قرآن کریم کی رُو سے وحی اور کلام اللہ ایک ہی چیز ہے (48/15، 9/6، 2/75) اس لئے یہ وحی ارشادات یا خواب میں نہیں ہوسکتی۔ وحی کے لئے الفاظ میں ہونا شرط ہے اس کے لئے سورہ شوریٰ کی آیت کریمہ کو پیش نظر رکھنا لازم ہے۔

سورہ شوریٰ کی اس آیہ کریمہ کی توضیح اس سے بیشتر کئی مرتبہ پیشِ خدمت عالی کی جا چکی ہے۔ انسانیت کو علم الٰہی حاصل ہونے کے طریقوں کے بارے میں یہ آیت حجتِ قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے اور اس موضوع پر فیصلہ کن آیت ہے۔ لیکن حیرت یہ ہوتی ہے کہ ابتداء سے لے کر آج تک ہمارے تمام مفسرین کرام نے اس کی ایک ہی تفسیر کی ہے اور وہ تفسیر قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے۔ علماء کرام کی اس خلافِ قرآن اور غلط تفسیر سے اُمتِ مسلمہ کو جو نقصان ہوا ہے اس کا تدارک کسی طرح بھی نہیں ہوسکتا۔ ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر میں جو تین لغزشیں کی ہیں وہ اتنی واضح ہیں کہ ان کو DETECT کرنے میں نہ تو عربی قواعد کی بے انتہا مہارت کی ضرورت ہے اور نہ ہی کسی شانِ نزول یا کسی اور خارجی سہارے کی حاجت۔ صرف عقل عامہ کی ضرورت ہے۔ نشاندہی کرا دینے کے بعد آپ بھی ان غلطیوں کو APPRECIATE کریں گے۔

سب سے پہلے آیت کریمہ اور اس آیت کی وہ تفسیر پیش خدمت عالی کی جاتی ہے جو ہمارے علمائے کرام شروع سے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے **وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحۡيًا اَوۡ مِنۡ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوۡ يُرۡسِلَ رَسُوۡلًا فَيُوۡحِىَ بِاِذۡنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِىٌّ حَكِيۡمٌ** (42/51) (ترجمہ) اور کسی آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے مگر وحی کے ذریعے سے یا پردہ کے پیچھے سے، یا کوئی فرشتہ بھیج دے، غرض وہ اپنے اختیار سے جو چاہتا ہے پیغام بھیجتا ہے، بے شک وہ عالی شان حکمت والا ہے۔ ہمارے علماء کرام اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کسی بشر سے ہم کلام ہونے کی تین صورتیں ہیں۔

(1) بلا واسطہ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمائے جیسے حضرت موسیٰ نے طور پر کلام

فرمایا اور حضورؐ سے معراج شریف میں (2) بواسطہ فرشتہ کے حق تعالیٰ کلام فرمائے مگر فرشتہ متجسد ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے (3) تیسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ متجسد ہو کر نبی کے سامنے آئے اور اس طرح اللہ کا پیغام پہنچادے۔

اب آیت کریمہ کا درست مفہوم پیش خدمت کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے انسانوں کو دو اقسام میں تقسیم قرار دیا ہے۔ یعنی ایک تو رسول اور دوسرے رسولوں سے علاوہ عام انسان (7/6) پہلے رسولوں کے متعلق کہا گیا کہ اُن تک اللہ کا کلام کس طرح پہنچتا تھا۔ اس کے دو طریقے بیان فرمائے۔ ایک اُس وحی کے ذریعے جو جبرئیل کی معرفت بھیجی جاتی تھی۔ جیسے حضورؐ پر وحی آتی تھی یعنی بذریعہ جبرئیل جس کے متعلق ارشاد ہوا فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ (2/97) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہِ راست اس طرح کہ کلام تو سنائی دے، لیکن متکلم (یعنی اللہ) دکھائی نہ دے جیسے حضرت موسیٰ کی طرف وحی جیسا کہ سورۃ طٰہٰ میں نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى کے بعد فرمایا فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى (20/12) یہ دونوں طریقے اللہ تعالیٰ کے رسولوں کے ساتھ کلام کرنے کے تھے اس کے علاوہ وہ انسان جو رسولوں کے ماسویٰ ہیں تو ان کے ساتھ کلام کرنے کا یہ طریقہ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی طرف اپنا رسول بھیجتا اور اُن رسولوں کی معرفت اپنا کلام ان کو پہنچادیتا تھا۔ کسی بھی غیر رسول سے اللہ تعالیٰ کلام نہیں فرماتا تھا۔ غیر رسولوں کو اللہ کی وحی ہمیشہ رسولوں کی معرفت ملی ہے۔

آپ نے دونوں تفاسیر ملاحظہ فرمائیں۔ مضمون ذرا مشکل سا ہو گیا ہے، لیکن اس آیت کی وضاحت اور دُرست تفسیر بھی پیش خدمت کرنا بڑا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس تفسیر کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔ اب آپ علماء کرام کے تسامحات ملاحظہ فرمائیں۔

(1) اس آیت کی تفسیر میں ہمارے علماء کرام سے پہلا تسامح یہ ہوا ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے پوری انسانیت سے کلام کرنے کے طریقے بتائے ہیں صرف انبیاء کرام سے کلام کرنے کے طریقے نہیں بتائے۔ جبکہ ہمارے علماء کرام نے اس کو صرف انبیاء کرام تک محدود کر دیا ہے اور باقی انسانیت تک کلام کرنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔ چنانچہ دوسری تمام تفسیروں کی طرح تفسیر نمونہ میں اس آیت کی تفسیر کا سرنامہ یہ لکھا ہے "انبیاء کے اللہ

کے ساتھ رابطے کے ذرائع"۔ قرآن کریم نے **وما کان لبشر** (کسی انسان کے لئے ممکن نہیں) کہا ہے۔ **وما کان لنبی** نہیں کہا۔ ہاں اگر قرآن نے **ما کان لنبی** فرمایا ہوتا تو بے شک یہ تفسیر درست ہوتی لیکن اب جبکہ آیہ کریمہ تمام انسانیت کی احاطہ کر رہی ہے تو علماء کرام کی یہ تفسیر درست نہیں ہوسکتی۔ علماء کرام کی یہ پہلی فاحش غلطی ہے۔

(2) اُن کی دوسری غلطی یہ ہے کہ جب اس آیت کی صحیح تفسیر ہماری طرف سے پیش خدمت کی جاتی ہے اور ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ وحی صرف انبیاء کرام کو ملتی تھی تو ہمارے یہ علماء کرام ہمارے اس دعویٰ کی تردید میں فرماتے ہیں کہ وحی تو ارض وسما کو بھی ہوئی اور شہد کی مکھی کو بھی وحی ہوئی اس لئے یہ دعویٰ کہ وحی صرف انبیاء کرام کو ہوئی درست نہیں ہے۔ لیکن ذرا سے غور سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اس آیت میں صرف انسانیت تک وحی ہونے کے طریقے بتائے جارہے ہیں۔ انسانیت سے باہر جو وحی ہوئی، اس کا طریقہ یہاں بیان نہیں ہورہا ہے۔ وہ وحی تکوینی یا وحی جبلی تھی۔ اس کا انسانوں کی طرف وحی ہونے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں ہمارے یہ علماء کرام مسئلہ کو بالکل CONFUSE کردیتے ہیں۔ آیت میں تین طریقے صرف انسانوں سے کلام کرنے کے بتائے جارہے ہیں باقی رہا علماء کرام کا یہ اعتراض کہ اُمِ موسیٰ اور حواریوں کو بھی وحی ہوئی تھی جو انسانیت کے دائرہ میں تھے اور نبی نہیں تھے، تو اس کی تشریح "اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے رابطے کے طریقے" میں کردی گئی تھی جو رسالہ میں زیر طبع ہے اور انشاء اللہ جلد طبع ہوجائے گا۔ وہ ملاحظہ فرمالیں۔ بار بار ایک موضوع کے اعادہ سے محترم قارئین کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

(3) ہمارے مفسرین عظام کی تیسری غلطی یہ ہے کہ کلام کے پہلے طریقے یعنی الا وحیا کے بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ یہ وحی الہام کے طریقے پر ہوئی تھی اور اس وحی کا طریقہ یہ تھا کہ اس میں حضورؐ کے دل میں ایک مفہوم ڈال دیا جاتا تھا اور حضورؐ اس مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان فرمادیتے تھے۔ اور اس طرح کی تفسیر کے ذریعے ہمارے علماء کرام الہام اور وحی خفی (روایات) کے لئے ایک مخفی دروازہ کھول دیتے ہیں۔ لیکن آیہ کریمہ میں تو **یکلمه الله** کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کے واضح معنی یہ ہیں کہ یہ نزول کلام یعنی الفاظ کا

ہوتا تھا۔ صرف مفہوم نہیں ڈالا جاتا تھا۔ پھر ہماری تائید میں ایک بہت بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے وحی اور کلام اللہ کو ایک چیز ٹھہرایا ہے۔

وحی بغیر کلام کے ہو ہی نہیں سکتی۔ قرآن کریم میں حضورؐ کے متعلق ارشاد ہے۔ لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (75/16) وحی کو جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ دوسری جگہ ارشاد عالی ہے وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (20/114) اور اے رسول قرآن (پڑھنے) میں اس سے پہلے کہ تم پر اس کی وحی پوری کر دی جائے، جلدی نہ کرو، ان دونوں آیات کریمات سے واضح ہے کہ وحی الفاظ کے ساتھ نازل ہو رہی تھی جب ہی تو آپ کو حکم ہوا کہ اس کے پڑھنے میں جلدی نہ کرو۔ نیز آیت کریمہ میں وحی اور قرآن کو ایک ہی چیز قرار دیا گیا ہے جس سے پھوٹ کے یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ کشف والہام یا روایات وحی الٰہی نہیں ہو سکتے۔

آپ کی سہولت کی خاطر مفسرین کرام کی تسامحات کو مختصراً نمبروار درج کیا جاتا ہے تاکہ وہ آپ کو باسانی مستحضر (یاد) ہو سکیں (1) ان حضرات کی تفسیر کے مطابق ساری انسانیت کا احاطہ نہیں ہوتا بلکہ صرف انبیاء کرام کو علم دینے کے طریقے کا بیان ہوتا ہے۔ (2) آیت میں صرف انسانوں کو وحی ہونے کے مختلف طریقے واضح کئے گئے ہیں ہمارے مفسرین نے اس وحی کو کائناتی اور جبلی وحی سے مشتبہ کر دیا ہے۔

(3) مفسرین کرام کی تیسری غلطی یہ ہے کہ انہوں نے مجرد خیال و مفہوم کو وحی قرار دیا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کے مطابق وحی صرف کلام والفاظ کے ذریعے ہوتی تھی مفسرین وعلماء کرام کی جو تیسری غلطی تحریر کی گئی ہے، تو اس غلطی سے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچا ہے اور سارے غیر قرآنی نظریات اسی دروازہ سے مسلمانوں میں رائج کیے گئے ہیں۔ جب تک موجودہ علم نے ترقی نہیں کی تھی اور سائیکولوجی اور لسانیات سے متعلق علوم نے اتنی ترقی نہیں کی تھی اور ہمارے مفسرین کرام بھی ان باریکیوں سے واقف نہیں تھے، اس وقت تک تو وحی خفی (روایات) اور الہام کا نظر چلتا رہا ہے۔ لیکن اب کوئی بھی تعلیم یافتہ آدمی اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ کلام بغیر الفاظ ہو سکتا ہے۔

کیونکہ احساس (FELLING) یا تخیل IDEA بغیر الفاظ کے دوسرے کی طرف منتقل ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر تصور کے لئے ایک لفظ ہوتا ہے اور ہر لفظ کے لئے ایک تخیل ضرور ہوتا ہے۔ ان دونوں کا وجود ایک دوسرے کے اندر مدغم اور مضمر ہوتا ہے۔ کوئی تصور پید انہیں ہوسکتا جب تک اس کے ساتھ ہی فوراً اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ علامہ اقبال نے اس سارے مفہوم کو ایک شعر میں ادا فرمایا ہے۔

ارتباطِ حرف و معنے اختلاطِ جان و تن

جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس آیہ کریمہ کی تفسیر میں یہ تین غلطیاں وہ ہیں جو بہت واضح ہیں اور ہر شخص ان کو APPRECIATE کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ دو غلطیاں ایسی ہیں جو صرف علماء کرام کی توجہ خاص کے لئے پیش خدمت کی جاتی ہیں۔

(1) جب یہاں رسول کے معنی بخوبی لگ سکتے ہیں، تو تیسری قسم کی وحی میں رسول کے معنی فرشتہ لینا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ جب لفظ اپنے اصل لغوی معنی میں استعمال ہوسکتا ہے تو وہ ہی معنی لینا زیادہ مناسب ہے اور یہاں رسول کے معنی فرشتہ کرنے کے لئے کوئی قرینہ بھی موجود نہیں ہے۔ قریبی معنی چھوڑ کر بعید معنی لینا مناسب نہیں ہے۔

دوسری غلطی جو علماء کرام کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ تیسری قسم یعنی بذریعہ فرشتہ پیغام ارسال کرنا تو خود ہی پہلی قسم وحیاً میں داخل ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ یہاں وحی کی نوعتیں نہیں بتائی جارہی ہیں جس کی یہ قسمیں ہوں۔ یہ مکالمہ الٰہی کے تین طریقے بتائے جارہے ہیں۔ فرشتہ کا پیغام الٰہی پہچانا بھی وحی ہے جو پہلے طریقے یعنی وحیاً سے کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔

ہمارے مفسرین کرام آیہ کریمہ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91/8) (پھر اُس کو بدکاری اور پرہیز گاری کا الہام کردیا) سے الہام کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اس آیہ کریمہ کی وضاحت ایک مضمون جس کا عنوان ”اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے رابطے کے طریقے“ تھا اس میں کردی گئی ہے۔ یہ مضمون زیر طبع ہے۔ اس مضمون کو اس بارے میں

ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ البتہ ایک Point اس میں تحریر کرنے سے رہ گیا تھا کہ اگر بر سبیل تنزل علماء کرام کی تفسیر کو درست تسلیم کرلیا جائے تو کیا علماء کرام اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ فجور کا الہام بھی انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو خیر و برکت کا منبع و مصدر ہے اور انسانیت کو بھی خیر و نیکی کی ہدایت فرماتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ فجور کا الہام کرسکتا ہے۔ بات بڑی واضح ہے۔ آیت کریمہ میں جو نفس کے ساتھ ھا (اس کی) ضمیر استعمال کی گئی ہے اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ یہ تقوی و فجور انسانی نفس کا خود حاصل کردہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے نہیں۔

الہام ایک قطعی علم کا ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ قطعی علم کا ذریعہ صرف وحی الٰہی ہے۔ ہمارے علماء کرام کے اپنے قول کے مطابق وحی والہام میں اتنا فرق ہوتا ہے جس قدر سورج اور چراغ میں ہوتا ہے۔ جس نبی علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ وحی عنایت فرماتا تھا، اسے الہام کی کیا ضرورت تھی کیونکہ الہام ازسرتاپا ظنی و مشکوک ہوتا ہے۔

اس مضمون میں الہام کی تردید کے سلسلہ میں ہماری طرف سے اتنا ہی پیش خدمت ہے۔ البتہ یہ درخواست ضرور ہے کہ چونکہ یہ موضوع بہت اہم ہے، اور مسلمانوں کے زوال میں اس کا بڑا اہم کردار ہے اور اسی پر تصوف، تشیع و مرزائیت کا دارومدار ہے، اس لئے اس موضوع سے متعلق، طلوع اسلام اور رسالہ صوت الحق کے تینوں مضامین ملاحظہ سے گذار دیں کیونکہ۔

این کلام صوفیائے شوم نیست
مثنوی مولویٔ رُوم نیست

☆☆☆

مقام حدیث کے بارے میں چند توضیحات

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

صدرِ اوّل کے کچھ ہی عرصہ بعد مقام حدیث کی بحث شروع ہو گئی تھی۔ مُعتزلہ حُجیت حدیث کے قائل نہیں تھے۔ امام شافعی کی مشہور کتاب "الرسالہ" میں تحریر ہے کہ امام موصوف کی ایک منکر حدیث سے بحث ہوئی جو حُجیت حدیث کا قائل نہیں تھا۔ بحث کے CONTENTS سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب کوئی معتزلہ عالم تھے۔ لیکن پھر اُس دور میں یہ بحث جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد اس سارے عرصہ میں کوئی شخص یا کوئی جماعت حُجیت حدیث پر شک کرنے والی معلوم نہیں ہوتی۔ اس برصغیر میں تقریباً سو سال سے یہ مسئلہ پھر شروع ہوا ہے۔ اس کی ابتداء مولوی محمد عبداللہ صاحب نے اپنی مسجد سریانوالہ بازار، لاہور سے کی۔ 1929ء میں امرتسر میں اُمتِ مسلمہ اہل الذکر والقرآن کی داغ بیل ڈالی گئی۔ یہ جماعت حُجیتِ حدیث کی قائل نہیں ہے۔ اس جماعت کا موقف انتہا پسندانہ تھا۔ قیام پاکستان کے فوری بعد جنوری 1948ء سے تحریک طلوع اسلام شروع ہوئی۔ اس تحریک میں اعتدال ہے یہ تحریک بھی حُجیت حدیث کی قائل نہیں ہے لیکن اس کے نزدیک وہ احادیث جو قرآن کے خلاف نہ ہوں۔ ان کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ حُجیت حدیث کی تعریف اور وضاحت یہ ہے کہ احادیث بھی اسی طرح وحی ہیں جس طرح قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ چونکہ ہمارے علماء کرام کا نظریہ بطور ایک مسلمہ عقیدے کے چلا آ رہا تھا۔ اور سب مسلمان بھی اس کے قائل تھے۔ اس لئے علماء اہل قرآن کے لئے ضروری ہوا کہ وہ خود یہ ثابت کریں کہ احادیث وحی نہیں ہیں۔ اس کے لئے اُمتِ مسلمہ کی طرف سے لٹریچر آنا شروع ہوا شروع شروع میں ان کے پاس صرف چند ہی دلائل تھے۔ لیکن مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ ان کے

دلائل اس قدر وقیع و مُسکت ہو گئے کہ علماء اہل حدیث کو ان کا مقابلہ کرنا مشکل ہو گیا۔
حُجیت حدیث پر اب تک تقریباً دو سو کتابیں طبع ہو چکی ہیں جن میں فرقہ اہل قرآن اور تحریک طلوع اسلام دونوں کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہے ان میں چند کتابیں علمی انداز کی ہیں، باقی زیادہ تر کتابیں غیر علمی اور غیر سنجیدہ ہیں جن میں زیادہ تر خود ہی غلط باتیں ان کی طرف منسوب کر کے ان کی تردید کی گئی ہے۔ لیکن ان تمام کتابوں کے مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام احادیث کو وحی الٰہی ثابت کرنے میں بالکل ناکام رہے ہیں۔
اس پورے سو سال کے عرصہ میں جو دو سو کتابیں مقام حدیث کے بارے میں تحریر کی گئی ہیں ان کے لئے پوری ذمہ داری سے یہ تحریر کیا جاتا ہے کہ ان کتابوں میں سے کسی ایک نے بھی کوئی مُسکت دلیل احادیث کے وحی الٰہی ہونے پر تحریر نہیں کی ہے۔ ہمارے علماء کرام مقام حدیث کے بارے میں جو بھی دلائل دے سکتے ہیں ان میں سرفہرست یہ دو دلائل ہیں۔
(1) اگر آپ حدیث کو درست تسلیم نہیں کرتے تو آپ قرآن پر کس طرح ایمان لا سکتے ہیں کیونکہ احادیث نے ہی یہ بات بتائی ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے۔ وحی پر ایمان لائے بغیر قرآن کو کس طرح وحی تسلیم کیا جا سکتا ہے؟
(2) ہمارے علماء کرام کی دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ چند ایسی آیات پیش کرتے ہیں جن کے متعلق ان کا خیال ہے کہ ان آیات کو وحی خفی کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ اس مضمون میں علماء کرام کے ان دو اعتراضات کا جواب پیش خدمت کیا جائے گا۔ حضور علیہ السلام نے نبوت کا اعلان فرمایا اور اپنے جانثار صحابہ کرام کی مسلسل جدوجہد کے بعد مدینہ منورہ میں ایک ریاست تشکیل دی جو حضورؐ کے ہی دور میں دس لاکھ مربع میل پر مُحیط تھی۔ حضورؐ کے بعد خلافتِ راشدہ کا قیام ہوا۔ اس کا رقبہ مزید وسیع ہوا۔ خلافت راشدہ 32 لاکھ مربع میل پر محیط تھی۔ اس کی آبادی لاکھوں نفوس پر مشتمل تھی۔ بنو امیہ کا دور 132 ہجری نبوی تک رہا۔ اس سال سے بنو عباس کا دور شروع ہو جاتا ہے اسلام کی حدود سندھ تک پہنچ چکی تھیں اس زمانہ میں مردم شماری کا طریقہ شروع نہیں ہوا تھا۔ لیکن عقلاً یہ بات تسلیم کی جا سکتی ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد لاکھوں نفوس پر مشتمل ہو گی اس وقت تک حدیث شریف

کا کوئی مجموعہ تیار نہیں ہوا تھا۔ یہ ہزاروں لاکھوں کی تعداد کے مسلمان بغیر حدیث پڑھے مسلمان ہوئے اور ان مسلمانوں کا سب کا یہ عقیدہ تھا کہ قرآن کریم وحی الٰہی ہے۔ یہ لاکھوں کی تعداد کے مسلمان پشت در پشت، نسلاً بعد نسلاً بڑھتے چلے گئے۔ ان کے علماء و مبلغین بھی غیر مسلموں میں اسلام کی تبلیغ کرتے رہے۔ برصغیر ہندو پاک میں صوفیاء کرام نے اسلام کی اشاعت کی۔ مسلمان ہونے والوں نے کسی نے حدیث کی کتاب نہیں پڑھی۔ مسلمانوں نے پھر احادیث کے مجموعے تیار کئے، حدیثوں نے مسلمان نہیں بنائے، مسلمانوں نے حدیثیں جمع کیں۔ حدیث شریف کا سب سے پہلا مجموعہ امام بخاری کا تیار کردہ ہے۔ حدیثوں نے امام بخاری کو مسلمان نہیں کیا۔ امام بخاری نے حدیثوں کا مجموعہ تیار کیا۔ خلافت راشدہ اور بنو امیہ کے دور میں جس قدر بھی مسلمان تھے وہ حدیثوں کے بغیر ہی مسلمان ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی تعداد میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا چلا گیا، ان میں احادیث کی کوئی CONTRIBUTION نہیں ہے۔ ہمارے موجودہ دور کے تمام علماء کرام اس لیے مسلمان ہیں کہ ان کے آباء واجداد مسلمان تھے اور وہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے۔ ان علماء میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو پہلے مسلمان نہیں تھا اور احادیث کی کتابوں کا مطالعہ کرکے مسلمان ہوا ہے، ہم سب مسلمان نسلاً مسلمان ہیں۔ ہم میں سے کسی ایک نے بھی بخاری شریف یا مسلم شریف نہیں پڑھی۔ ہم چونکہ مسلمان ہیں اس لئے ہم قرآن کریم کو وحی الٰہی تسلیم کرتے ہیں۔ ضمناً عرض ہے کہ مشہور عالم دین حضرت مولانا عبیداللہ سندھی کا تذکرہ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ حضرت سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ساری عمر مسلمانوں اور اسلام کی خدمت میں گزار دی۔ ریشمی رومال کی تحریک میں انہوں نے ہزاروں روپوں کی TRANSACTIONS کرائی تھیں لیکن اپنے افلاس کا یہ عالم تھا کہ اُوکھلے سے جامع مسجد، دہلی تک پیدل آتے تھے۔ ان کے پاس کرایہ کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ اُن کی سوانح حیات میں کسی جگہ بھی متاہل زندگی کا حوالہ نہیں ملتا۔ وہ احادیث کے مطالعہ کے بعد مسلمان نہیں ہوئے تھے ان کا ایک ہم جماعت مسلمان لڑکا ایک کتاب "اسلام" نام کی پڑھ

رہا تھا۔ اس کتاب کے مصنف کا نام عبید اللہ تھا۔ یہ کتاب مولانا پر اثر کر گئی اور وہ مسلمان ہو گئے اور کتاب کے مصنف کے نام پر ہی اپنا نام رکھ لیا۔ وہ اس وقت جماعت ششم میں تھے نور اللہ مرقدہ۔ علماء کرام کی دوسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ اُنہوں نے قرآن کریم سے تقریباً دس آیات چُن لی ہیں کہ یہ آیات وحی خفی کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ لیکن علماء کرام کا یہ خیال درست نہیں ہے۔ وحی خفی کو تسلیم کئے بغیر چند تفاسیر طبع ہو چکی ہیں جن میں ان متذکرہ آیات کی تفسیر لکھی جا چکی ہے اس طرح علماء کرام کے اس دعویٰ کی عملاً تردید کر دی گئی ہے۔

اس بارے میں غور طلب بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کہتے ہیں کہ یہ آیات بغیر وحی خفی کے سمجھ میں نہیں آسکتیں کیونکہ ان کا حوالہ یا حل وحی خفی میں دیا گیا ہے۔ لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام (تقریباً دس) آیات میں سے کسی ایک کا بھی حوالہ احادیث میں نہیں ملتا۔ قارئین کرام کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ نکتہ وضاحت کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا، اس لئے اس نکتہ کی جو بہت اہم ہے، وضاحت پیش خدمت ہے۔

(1) مولانا جسٹس (Justice) محمد تقی عثمانی، ہمارے دور کے مشہور عالم ہیں ان کی کتاب "حُجیت حدیث" علماء کرام میں بہت مقبول ہے اور مزعومہ "منکرین حُجیت" کے لئے تریاق کا درجہ رکھتی ہے۔ مولانا صاحب موصوف نے اس نکتہ پر بہت اصرار کیا ہے کہ وحی خفی کی مدد کے بغیر یہ چند آیات سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ انہوں نے اس ذیل میں بارہ آیات پیش کی ہیں۔ اس خیال سے کہ قارئین کرام اس مسئلہ کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں، اس مضمون میں چند آیات کے نمونے پیش کئے جاتے ہیں ان کی کتاب "حُجیت حدیث" کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ تحریر فرماتے ہیں۔ **مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآئِمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ** (59/5)، ترجمہ، جو کھجوروں کے درخت کے تنے تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو ان کی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا سو خدا کے حکم کے موافق ہیں۔ اس آیت کریمہ میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے یہ درخت اللہ تعالیٰ کی اجازت سے کاٹے تھے۔ لیکن کوئی بھی شخص قرآن کریم کی کوئی آیت کریمہ نہیں بتلا سکتا

جس میں اس جنگ کے دوران درخت کاٹنے کی اجازت موجود ہو۔ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس اجازت کا کس طرح علم ہوا۔ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ اجازت رسول اللہ نے مسلمانوں کو دی تھی اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس اجازت کا علم "وحی غیر متلو" کے ذریعے ہوا"(اقتباس ختم، صفحہ 42)

محترم جناب مولانا صاحب نے اس پیرا گراف کی آخری سطر میں تحریر فرمایا ہے کہ اس اجازت کا علم "وحی غیر متلو" کے ذریعے ہوا تھا۔ لیکن آپ اس بات پر حیران ہوں گے کہ آپ احادیث کی ساری کتابیں چھان ماریں آپ کو کسی ایک کتاب میں بھی اس اجازت کا ذکر نہیں ملے گا۔ اس بات کو ذہن نشین فرمالیں کیونکہ آئندہ بھی اس کا ذکر کیا جائے گا کہ علمی زبان میں اس کو "**محکی عنه**" کہتے ہیں محترم جسٹس صاحب کی پیش کردہ آیات میں سے کسی ایک آیت کا بھی **محکی عنه**' احادیث کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔

(2) حضرت زیدؓ کے نکاح کے بارے میں جسٹس صاحب نے بہت تفصیل سے کام لیا ہے۔ اس کا صرف ایک متعلقہ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ اسی سیاق وسباق میں آیت کریمہ کا دوسرا حصہ زیادہ غور طلب ہے۔ الفاظ یہ ہیں کہ 'ہم نے آپ سے اس کا نکاح کردیا"۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا ارشاد واضح ہے کہ حضرت زینب سے آنحضرت کا نکاح اللہ تعالیٰ کے حکم پر ہی ہوا تھا یہ حکم قرآن کریم میں کہیں موجود نہیں۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ ایک اور مثال ہے جس میں "وحی غیر متلو" کے ذریعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم بھیجا گیا ہے(اقتباس ختم)

اصل میں حضرت مولانا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آیات میں جو حوالہ جات آتے ہیں وہ حضورؐ کو قرآن کے علاوہ وحی خفی کے ذریعے ملتے تھے۔ مثلاً سورہ حشر کی آیت میں درختوں کے متعلق جو حکم تھا کہ مسلمانوں نے یہ درخت اللہ کی اجازت سے کاٹے تھے تو وہ اجازت حضورؐ کو وحی خفی کے ذریعے ملی تھی اور یہ وحی خفی احادیث میں ہے۔ جب تک آپ احادیث کو نہیں مانیں گے، آپ اس آیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ لیکن حیرت یہ کہ یہ حکم حدیث کی کسی بھی کتاب میں نہیں ہے۔ اس طرح ان حضرات کا دعویٰ باطل ہوجاتا ہے۔ اسی طرح

حضرت اقدس اس آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ آنحضرت سے حضرت زینب کا نکاح اللہ کے حکم سے ہوا تھا اور یہ حکم قرآن میں نہیں ہے کیونکہ وہ حضورؐ کو وحی خفی کے ذریعے ملا تھا۔ یہاں پھر وہی صورتِ حال ہے کہ اللہ کا یہ حکم کہ حضورؐ حضرت زینب سے نکاح کریں حدیث میں بھی نہیں ملتا۔ ان کو علمی زبان میں آیت کا محکی' عنہ' کہتے ہیں۔ آیات قرآنیہ کا کوئی محکی' عنہ احادیث میں پایا ہی نہیں جاتا۔

(3) ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں۔ وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ ... الخ (ترجمہ) اور جب کہ پیغمبر نے اپنی کسی بی بی سے ایک بات چپکے سے فرمائی۔ پھر جب اس بی بی نے وہ بات بتلا دی اور پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی تو پیغمبر نے تھوڑی سی بات تو بتلا دی اور تھوڑی سی بات کو ٹال گئے۔ سو جب پیغمبر نے اس بی بی کو وہ بات بتلائی وہ کہنے لگی کہ آپ کو اس کی کس نے خبر دی آپ نے فرمایا کہ مجھ کو بڑے جاننے والے خبر رکھنے والے (یعنی اللہ) نے خبر کر دی (66/3) آیت اور ترجمہ کے بعد حضرت لکھتے ہیں۔ ''ترجمہ کے نمایاں الفاظ (پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی) اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس افشائے راز سے مطلع فرمایا تھا۔ لیکن یہ اطلاع بھی قرآن کریم میں کہیں نہیں ہے اور اس طرح اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن کریم کے سوا ایک اور قسم کی وحی کا نزول بھی رسول اللہ پر ہوتا تھا اور یہی ''وحی غیر متلو'' ہے۔

پورا اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ یہاں پھر حضرت مولانا صاحب نے فرمایا ہے کہ یہ افشائے راز قرآن میں نہیں ہے۔ آیت کریمہ میں جو الفاظ آئے ہیں کہ ''پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس کی خبر کر دی'' ۔ ان کے خیال میں پیغمبر کو یہ خبر وحی خفی کی معرفت ملی تھی لیکن اگر قرآن میں اس خبر کے کوئی الفاظ نہیں ہیں تو ان کی خبر کے الفاظ کسی حدیث میں بھی نہیں ملتے۔ ہاں اگر آیات کے محکی عنہ' احادیث میں ملتے ہوتے تو پھر بے شک یہ بات ثابت ہو جاتی کہ وحی خفی کا نزول بھی ہوتا تھا اور قرآن کریم کے سمجھنے میں احادیث کی ضرورت ہے۔ لیکن جب آیات کے محکی عنہ' احادیث میں موجود ہی نہیں ہے تو مولانا کا

(CLAIM) دعویٰ ہی غلط ہو جاتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ جو اعتراض ہمارے علماء کرام کرتے ہیں اس کی کیا حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ ہاں اگر ہمارے علماء کرام ان آیات کا محکی عنہ' کتب احادیث میں دکھادیں، تو بے شک ان کا اعتراض قابل غور ہو گا۔

مؤقر رسالہ صوت الحق بھی خاص قرآنی فکر کا داعی ہے اس ماہنامہ کا قرآنی تحریک میں ایک منفرد اور نمایاں مقام ہے۔ یہ رسالہ گذشتہ بیس سال سے خالص قرآنی فکر کی شمع کو اپنے خون سے سینچ رہا ہے۔ چاروں طرف کے اندھیروں میں یہ ایک روشنی کا مینار ہے۔ احادیث کے متعلق اس کا ایک اپنا منفرد نقطۂ نگاہ ہے۔ جو یہ چند الفاظ میں پیش کر دیتا ہے کہ جن احادیث کو خارج از قرآن وحی قرار دیا جاتا ہے، اول تو یہ نطق رسول ہی نہیں ہیں اور نہ ہی یہ اقوال رسول ہیں۔ بلکہ یہ ذخیرہ روایات ہے۔ کیونکہ اڑھائی سو سال تک جو الفاظ پشت در پشت اور نسلاً بعد نسلاً ایک زبان سے دوسری اور دوسری سے تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی زبانوں پر منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں ان کا اپنی اصل شکل میں رہنا بالکل ناممکن ہے لہٰذا یہ روایات تو احادیثِ رسول ہیں ہی نہیں۔ باقی رہا معاملہ حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی قدر کا، اُن کے متعلق صوت الحق کا یہ نظریہ ہے کہ اگر وہ ارشاداتِ گرامی وحی تھے اور دین کا جزو و حصہ تو حضورؐ کا فریضۂ رسالت تھا کہ انہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ صورت میں جمع کرا کر امت کو دے جاتے۔ چونکہ حضورؐ نے ایسا نہیں کیا، اس لئے ظاہر ہے کہ حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی قدر نہ دین کا جزو تھے اور نہ ضروریاتِ دین کا حصہ۔

ہمارے علماء و محدثین روایت بالمعنی کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور دیگر علماء سب اسی نظریہ کے قائل ہیں ظاہر ہے کہ جب روایت بالمعنی ہو گی۔ تو اس روایت میں حضورؐ کے اپنے الفاظ نہیں ہوں گے۔ صوت الحق نے وحی خفی کی تردید میں بے شمار مضامین طبع کیے ہیں۔ ان میں سے ایک مضمون "روایاتِ حدیث کے متعلق علماء کا نظریہ" ستمبر 2009ء کے شمارہ میں طبع ہوا ہے۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ کون کون سے محدثین و فقہاء روایات بالمعنی کے قائل تھے۔ مشہور مفسر قرآن جناب امین احسن اصلاحی صاحب نے "مبادئ تدبر حدیث" میں تحریر فرمایا ہے کہ ہمارے ذخیرہ

روایات میں 95 فیصد روایات بالمعنی ہیں۔ آپ خود غور فرمالیں کہ روایوں کے الفاظ کس طرح وحی ہوسکتے ہیں۔

اس بارے میں کہ یہ روایات حضوؐر کے الفاظ میں نہیں ہوسکتیں، فلہذا یہ وحی بھی نہیں ہیں، ایک قابل غور نکتہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔ آپ اس پر غور فرمائیں۔ آپ کے علم میں اضافہ ہوگا۔ حدیث کی مستند تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ "حضوؐر کے اقوال، افعال، اور تقریر" حضوؐر کی حدیث وسنت ہیں۔ تقریر سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص نے کوئی بات کہی یا کوئی فعل اختیار کیا اور اس کا یہ قول وفعل حضوؐر کے علم میں آیا اور حضوؐر نے اس پر سکوت فرمایا، تو حضوؐر کا یہ سکوت ایک معنوی رضامندی ہے۔ اس لئے یہ بھی سنت کی اصطلاح میں شامل ہے۔

ہمارے قارئین کرام غور فرمائیں کہ وہ احادیث جو اقوال رسول شمار ہوتی ہیں، ان کی تو روایت ہوسکتی ہے۔ ان کو آپ خوش فہمی کی وجہ سے اقوال رسول کہہ لیں۔ لیکن وہ احادیث جو افعال رسول کہی جاتی ہیں، ان کی تو کسی طرح بھی روایت نہیں ہوسکتی۔ ایسی احادیث جو افعال رسول میں شمار ہوتی ہیں ان میں سے چند احادیث پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔ پھر آپ غور فرمائیں کہ ان میں حضوؐر کے ایک لفظ بھی ہونے کا امکان ہے، احادیث فعلی کی مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

(1) مسلم میں لکھا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا جس زمانہ میں رسولؐ اللہ امہات المومنین سے بالکل الگ ہوکر گوشہ گیر ہوگئے تھے۔ میں مسجد میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ لوگ (پریشانی اور رنج میں) پتھروں سے زمین کرید رہے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ رسول اللہ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی۔ میں نے فوراً مسجد کے دروازہ پر کھڑے ہوکر بہت چیخ کر کہا رسول اللہ نے بیویوں کو طلاق نہیں دی اور آیت وَ اِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ (4-83) نازل ہوئی۔ پس میں نے استنباط معاملہ کیا (تفسیر مظہری جلد 4۔ صفحہ 115)

(2) حضرت ابوذرؓ کا بیان ہے کہ جب کبھی میں رسول اللہ سے ملا۔ آپ نے مجھ

سے مصافحہ ضرور کیا ایک روز حضورؐ نے مجھے بلانے کو میرے گھر کسی کو بھیجا۔ میں گھر پر موجود نہ تھا۔ گھر آ کر اطلاع ملی میں فوراً خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ تخت پر تشریف فرما تھے۔ مجھے چمٹا لیا اور یہ معانقہ بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ تھا۔ راوۃ ابو داؤد۔ (3) شعبی کا بیان ہے کہ جعفر بن ابی طالب (جب سفر سے) واپس آئے تو رسول اللہ نے ان کا استقبال کیا اور ان کو چمٹا لیا۔ اور دونوں آنکھوں کی درمیان چوما رواۃ ابو داؤد۔ (4) حضرت ابن عمر کا بیان ہے میں سفر میں رسول اللہ کے ساتھ رہا۔ حضورؐ نے وقت وفات (سفر میں) دو رکعت سے زیادہ نہیں پڑھائی رواۃ البخاری (تفسیر مظہری جلد 3، ص 155) (5) صحیح مسلم میں تعلیقاً مروی ہے کہ رسول اللہ نے حضرت حسان شاعر کے لئے مسجد میں ممبر رکھوایا۔ وہ مشرکین کی ہجو کا جواب دیتے اور آپ ان کے لئے دعا کرتے۔ (ابن کثیر جلد 1۔ صفحہ 151) (6) صحیح مسلم میں ہے کہ رسولؐ اللہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے اور اکثر آسمان کی جانب نظریں اُٹھا کر حکم کا انتظار کرتے تھے یہاں تک کہ یہ آیت قد نریٰ تقلبك نازل ہوئی، اور کعبہ شریف قبلہ مقرر ہوا۔

آپ نے ان روایات کو ملاحظہ فرمایا۔ یہ سب روایات صحاح ستہ کی ہیں جنہیں وحی کا درجہ دیا جاتا ہے۔ خدارا آپ خود انصاف فرمائیں کہ ان روایات میں کوئی ایک لفظ بھی حضورؐ کا ہے۔ وہ روایات جو حضورؐ کے فعل سے متعلق ہیں، ظاہر ہے کہ وہ تو کوئی دوسرا راوی ہی بیان کرے گا اس میں حضورؐ کے الفاظ کیسے آسکتے ہیں۔ اور یہی حال تقریر کا ہے۔ جن میں حضورؐ نے صرف سکوت فرمایا جن روایات میں حضورؐ نے سکوت فرمایا ظاہر ہے کہ راوی کے اپنے الفاظ ہیں ان روایات پر نطق رسول کا اطلاق کیسے ہوسکتا ہے۔

☆☆☆

مفلس عوام کو بڑی سے بڑی سیاسی آزادی مطمین نہیں کرسکتی۔ لینن

چشم آفریں دارم

ایک مشہور چینل کے چند مذہب زدہ روایت گزیدہ افسران بزم طلوع اسلام (سی بریز) میں درس قرآن کے دوران تشریف لائے ان کا درس قرآن میں تشریف لانا ہمارے لئے ایک خوش آئند بات ہے۔ درس کے بعد انہوں نے بظاہر کچھ وضاحتیں طلب فرمائیں لیکن ان کی گفتگو سے بالکل ابتداء میں ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ انہیں وضاحتیں درکار نہیں ہیں بلکہ ان کا ارادہ مناظرہ کرنے کا تھا۔ مناظرہ کبھی حق اور باطل کا معیار نہیں ہوتا ۔یہ صرف ایک mental gymnastic ہوتا ہے جس سے مناظر کی ego کو تسکین حاصل ہوتی ہے کہ میں نے اپنے مخالف کو ہرا دیا۔ صوت الحق کا ایسے حضرات کو یہی مشورہ ہے کہ مناظرہ بازی سے اجتناب فرمائیں کیونکہ مناظرہ احقاق حق اور ابطال باطل کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

البتہ حضرات گرمی قدر نے دو نکات ایسے پیش فرمائے جو قرآن کریم کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ اس لئے ان کی وضاحت ضروری سمجھی گئی ہے۔ پہلی بات تو انہوں نے یہ فرمائی کہ ختم نبوت کے بعد بے شک انبیاء کرام کا سلسلہ تو ختم ہو گیا لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت آتی ہے اور آتی رہے گی۔ ان کے نزدیک ختم نبوت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اب اللہ تعالیٰ کی طرف سے راہنمائی آنی بند ہو گئی ہے بلکہ ان کا خیال ہے کہ ختم نبوت کے بعد بھی ہدایت آسکتی ہے اور آرہی ہے۔ اس نظریہ کی تائید میں انہوں نے سورۃ قدر کی آیت کریمہ۔ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا (97-4) فرمائی ان محترم حضرات کے ان ہی دو نکات کا جواز پیش خدمت ہے۔

ختم نبوت کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ حضورؐ کے بعد اللہ تعالیٰ سے براہ راست کسی شخص کو بھی کوئی علم نہیں مل سکتا۔ صرف اسی موضوع پر میرا ایک مضمون "مسلمانوں کے زوال میں الہام کا کردار" ماہ جنوری 2010ء کے صوت الحق میں شائع ہو چکا ہے اور دوسرا مضمون "اللہ تعالیٰ کے انسانیت سے رابطہ کے طریقے" رسالہ طلوع اسلام میں زیر طبع ہے۔ ان دو مضامین میں صرف اسی موضوع پر گفتگو کی گئی ہے۔ میری درخواست ہے کہ یہ محترم حضرات ان مضامین کا مطالعہ فرمائیں۔

جہاں تک سورۃ القدر کی آیہ مبارکہ کا تعلق ہے اس کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ میں انسانیت کو انسانی اقدار دینے کا حوالہ دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کے نزول سے پیشتر تاریکیوں اور اندھیروں کا دور تھا کیونکہ قرآن کریم نے متعدد بار یہ فرمایا ہے لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (14-1) قرآن اس لئے نازل کیا گیا ہے تاکہ تم انسانوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آؤ۔ حیوانیت کی سطح تک تو اقدار کا تصور ہی نہیں ہوتا البتہ جب زندگی پیکر انسانی میں داخل ہوئی ہے تو اس کو اقدار کی ضرورت پیش آئی ہے۔ قرآن کریم نے اقدار عنایت فرما کر زندگی کو انسانی سطح سے متعارف کر دیا۔ آیت کریمہ اسی شرف و منزلت کا تذکرہ کر رہی ہے کہ جس رات یہ انسانی اقدار نازل ہوئی ہیں وہ رات ہزاروں راتوں سے بہتر تھی۔ یہ جو ہمارے ہاں ہر سال رمضان کے مہینے میں شب قدر کی تلاش کی جاتی ہے تو یہ بھی حدیث بے خبراں ہے۔ لیلۃ القدر صرف وہ رات تھی جس میں اقدار نازل ہوئیں۔ اب نہ دوبارہ اقدار نازل ہوں گی اور نہ دوبارہ لیلۃ القدر ہوگی۔

اس ساری غلط فہمی کی بنیاد آیہ کریمہ تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا کا درست مفہوم نہ سمجھنا ہے۔ ہمارے علمائے کرام اس کا ترجمہ "اُترتے ہیں فرشتے اور روح اس میں کرتے ہیں" یہ ترجمہ حضرت شیخ الہند کا ہے، اور شاہ عبدالقادر نے بھی بالکل یہی ترجمہ کیا ہے۔ لیکن یہ دونوں تراجم غلط ہیں اور انہی غلط تراجم پر ہی ان کی ساری غلط فہمی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ ہمارے علمائے کرام نے جو اس آیت کا غلط ترجمہ کیا ہے

تو وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ عربی قواعد یا عربی محاورات پر مہارت تامہ نہیں رکھتے تھے بلکہ صرف اس وجہ سے ہے کہ وہ یہ سارے تراجم روایات سے متاثر ہو کر کرتے تھے۔ اور روایات کے نظریات کی رعایت پیش نگاہ رکھتے تھے کہ کہیں بھی ان روایات کی تردید نہ ہو جائے۔ روایات سے متاثر ہوئے بغیر اس آیت مبارکہ کا اصل ترجمہ یہ ہے "اس رات میں ملائکہ اور روح اترتے تھے" یہاں معنی حال کے نہیں بلکہ ماضی کے ہیں۔ عربی قواعد میں اس کو مضارع حکائی کہتے ہیں۔ عربی قواعد کی تمام کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔ اس میں فعل مضارع صرف ماضی کے معنی دیتا ہے۔ اس کی امثلہ بھی ان کتابوں میں درج ہوتی ہیں۔ لیکن اس مضمون میں ان امثلہ سے صرف نظر کر کے اپنی تائید میں صرف قرآنی آیت پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔ کیونکہ قواعد عربیہ پر آیت قرآنیہ ہی آخری سند اور حجت ہوتی ہیں۔

(1) ارشاد عالی ہوتا ہے وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ (12-56) ترجمہ اور اسی طرح ہم نے یوسف کو سرزمین مصر میں اقتدار ارضی عنایت فرمایا۔ وہ جہاں جاتا تھا قیام کرتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیں یہاں يَتَبَوَّأُ اور يَشَآءُ دونوں مضارع ہیں۔ لیکن چونکہ ماضی کا واقعہ بیان ہو رہا ہے اس لئے اس کا ترجمہ ماضی میں ہوا۔ عقلاً بھی یہ بات ظاہر ہے کہ چونکہ حضرت یوسفؑ اس وقت موجود نہیں ہیں، اس لئے اس کا ترجمہ ماضی میں ہوگا۔ وہی حضرت شیخ الہند مرحوم جنہوں نے سورۃ قدر میں مضارع حکائی کا غلط ترجمہ نازل ہوتے تھے کے بجائے نازل ہوتے ہیں کیا تھا۔ اس جگہ اس کا درست ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس میں جہاں چاہتا۔ یہاں دونوں الفاظ یعنی يَتَبَوَّأُ اور يَشَآءُ کا ترجمہ حضرت اقدس نے ماضی میں کیا ہے۔ راغب نے يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ کا ترجمہ۔ وہ اس ملک میں جہاں چاہتے رہتے تھے کیا ہے۔ ایران کی موجودہ دور کی تفاسیر میں تفسیر نمونہ، ایک عمدہ تفسیر شمار کی جاتی ہے۔ اس تفسیر میں اس آیت کا یہ ترجمہ لکھا ہے۔ اس طرح ہم نے یوسف کو (مصر) کی زمین میں قدرت دی کہ اب جہاں چاہتا رہتا۔

(2) اسی طرح سورۃ مجادلہ کی ابتداء ہی اس آیت سے ہوتی ہے قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْٓ اِلَی اللّٰهِ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا (58-1) "سن لی اللہ نے بات اس عورت کی جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور شکایت کرتی تھی اللہ کے آگے اور اللہ سنتا تھا سوال و جواب تم دونوں کے (ترجمہ شیخ الہند) تفسیر مظہری نے اس آیت کا ترجمہ یوں تحریر کیا ہے۔ بے شک اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے معاملے میں آپ سے جھگڑ رہی تھی اور اپنے رنج کا اللہ سے شکوہ کر رہی تھی، اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ جلالین میں اس کا ترجمہ اس طرح دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے جھگڑ رہی تھی اپنے شوہر کے معاملے میں اور اللہ سے شکایت کر رہی تھی اور اللہ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس آیت میں بھی جو مضارع کے صیغے آئے ہیں ان مفسرین نے اس کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے۔

سورۃ نمل میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَیَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ یُّكَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ (27-83) اس کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے یوں کیا ہے "اور جس دن گھیر بلائیں گے ہر ایک فرقہ میں سے ایک جماعت جو جھٹلاتے تھے ہماری باتوں کو، پھر ان کی جماعت بندی ہو گی۔ حافظ فرمان علی نے اپنے مشہور ترجمہ میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اور اس دن کو یاد کرو جس دن ہم ہر امت میں سے ایک ایسا گروہ جو ہماری آیتوں کو جھٹلایا کرتے تھے جمع کریں گے پھر ان کی ٹولیاں علیحدہ علیحدہ کریں گے اس جگہ یکذب مضارع حکائی ہے اس لئے اس کا ترجمہ ماضی میں کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تین آیات کریمات کے ترجمہ سے قارئین کرام پر یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ اس زیر نظر آیت کا ترجمہ "اس (رات) میں فرشتے اور روح اپنے رب کے حکم سے اترتے تھے ہے۔ اب اترتے ہیں درست ترجمہ نہیں ہے۔

ختم نبوت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ملنے کی بنیاد اس آیت کے غلط ترجمہ پر رکھی گئی تھی۔ اب آیت کریمہ کی اس وضاحت کے بعد یہ آیت اس بارے میں مفید ثابت نہیں ہو سکتی۔ چونکہ آیت کی اس وضاحت سے ہی اس غلط عقیدہ کی تردید ہو جاتی

ہے۔ اس لئے آیت کا صحیح مفہوم پیش کرنے کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی۔ عندالضرورت وہ بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

آیۂ کریمہ کی جتنی وضاحت زیر بحث موضوع کے لئے ضروری تھی وہ تو ختم ہوئی تاہم ضمناً عرض ہے کہ قرآن کریم میں روح کا لفظ 20 مقامات پر آیا ہے اور ہر جگہ یہ لفظ وحی ،وحی لانے والا وحی پانے والا کے معنی میں استعمال رہا ہے اس روحانیت کے نہیں جو ہمارے ہاں لئے جاتے ہیں۔ رہی بات ملائکہ کی تو ملائکہ کا وجود مابعد الطبعیاتی حقائق میں سے ہے۔ ہم ملائکہ کی حقیقت وکنہ سے واقف نہیں ہیں، نہ اس کا ادراک کرسکتے ہیں۔ البتہ ہم ملائکہ پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ قرآن کریم نے ان کے متعلق جو افعال و خصوصیات بیان کی ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے۔ سورۃ انفال میں قرآن کریم کفار کے متعلق جو کچھ بیان کرتا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ وَ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (8-50) اے کاش تم دیکھتے جب فرشتے کافروں کی جان نکال لیتے تھے اور ان کے رخ اور پشت پر (کوڑے) مارتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے عذاب جہنم کے مزے چکھو۔

جو کافر مرتے تھے ہم ان کو دیکھتے ہیں لیکن ان کافروں کے چہروں اور پشتوں پر ملائکہ جو مار مارتے ہیں وہ ہم بالکل نہیں دیکھ سکتے۔ اس قسم کی آیات میں قرآن کریم اسی طرح کی غیر مرئی کیفیات کو بیان کرتا ہے جو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس زیر نظر آیت میں بھی ملائکہ وحی کو کس طرح لے کر آتے تھے ہم اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ ہمیں تو صرف اس بات پر ایمان لانا ضروری ہے کہ اس رات ملائکہ کے ذریعے وحی الٰہی کا نزول ہوا تھا۔ ایسا نہ تو دوبارہ نزول ہوگا اور نہ ہی لیلۃ القدر واقع ہوگی۔ اگر ملائکہ کے موضوع پر مزید معلومات درکار ہوں تو میرا مضمون ملائکہ کی حقیقت ملاحظہ فرمائیں یہ مضمون صوت الحق کے شمارہ اپریل 2004 میں طبع ہوا تھا۔

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ سیاست کو پیشے کے طور پر بھی اختیار کرلیں، اور اس کے ساتھ ساتھ

مسلمانوں کے زوال میں الہام کا کردار

**** **** *** **** *** **** *** **** **** *** **** *** **** *** **** *** **** *** **** **

اس دور میں ہم مسلمان چونکہ چاروں طرف سے مصائب و آلام میں گھرے ہوئے ہیں اس لئے زیادہ بہتر اور مناسب یہی بات ہے کہ اُن مسائل کو غور و فکر کا مرکز بنایا جائے جن کے عملی نتائج اس معاشرہ میں ایسے نکلتے ہوں کہ وہ مسلمانوں کی اصلاح کر کے، اُن کی پستی و زوال کو دور کر دیں اور عموماً ایسے مسائل سے اجتناب کرنا چاہیئے جن کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ الہام کا موضوع بھی بظاہر ایک ایسا ہی فکری و ذہنی موضوع معلوم ہوتا ہے جس کا اس دنیا کی عملی زندگی سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا، مذہب میں بے شک الہام کا یہی مقام ہے لیکن جیسا کہ آپ کو اس مضمون کے مطالعہ سے واضح ہوگا، دین میں الہام کا تعلق ہماری عملی زندگی سے ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی اسی زندگی میں برآمد ہوتے ہیں۔

اس بات پر سخت تحیّر و تعجب ہوتا ہے کہ ہم مسلمانوں میں بعض ایسے عقائد جو بالکل وضاحتاً، وصراحتاً قرآن کریم کے خلاف ہیں کس طرح نسلاً بعد نسلاً چلے آرہے ہیں اور ان پر کوئی غور و فکر ہی نہیں کرتا۔ مزید تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی خلاف قرآن عقیدہ ہم میں رواج پا جاتا ہے تو ہمارے سارے فرقے اس خلاف قرآن عقیدے پر متفق ہو جاتے ہیں اور کوئی ایک فرقہ بھی قرآن کے قریب نہیں آتا۔ اس قسم کے عقائد میں سے ایک عقیدہ الہام کا بھی ہے دُور دُور سے بھی الہام کا کوئی تعلق قرآن کریم سے نہیں ہے۔ حتیٰ کہ الہام کا لفظ بھی قرآن میں نہیں آیا ہے۔ لیکن یہ خلاف قرآن عقیدہ تیرہ سو سال سے چلا آرہا ہے، اور تمام فرقوں میں چلا آرہا ہے اور اس عقیدے سے مسلمانوں کو جو نقصان پہنچا

ہے اس کا اندازہ آپ کو اس مضمون کے مطالعہ سے واضح ہوگا۔

جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے کہ الہام کا تو لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔ اس عقیدہ کی اساس و بنیاد صرف ہماری موضوع روایات پر ہے، احمدیت، روحانیت، تصوف کا سارا دارومدار صرف اور صرف اس عقیدہ پر ہے۔ آپ یہ بُنیاد ذرا سی سرکا دیں، احمدیت و تصوف کی ساری عمارت دھڑام سے نیچے گر پڑے گی۔ یہ رسالہ چونکہ خالص قرآنی نظریات کا داعی ہے اور فرقہ بندی سے بلند ہے اس لئے یہ رسالہ عموماً شیعہ حضرات کے عقاید سے تعرض نہیں کرتا مُبادا کہ ان کے جذبات مجروح ہوں۔ لیکن ان کے وہ نظریات جن کے وہ خود مُدّعی ہیں، اور جن کی وہ کھلم کھلا تبلیغ کرتے ہیں، ان کے متعلق کچھ اظہار خیال کرنا غیر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ان حضرات کا بھی سارا دارومدار الہام پر ہے۔ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ ختم نبوت کے بعد وحی کا سلسلہ تو منقطع ہوگیا ہے۔ لیکن الہام کا سلسلہ جاری ہے اور حضرات آئمہ کرام کو الہام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست علم حاصل ہوتا تھا۔ شیعہ حضرات کے نزدیک جس طرح قول رسول حُجت ہوتا ہے، اسی طرح قول امام بھی حُجت ہوتا ہے۔ یعنی ان حضرات کے نزدیک الہام بھی بالکل وحی کی حقیقت اور اس کا ہی مقام و درجہ رکھتا ہے۔

احمدیت کے متعلق تو جس قدر بھی کم کہا جائے اسی قدر بہتر ہے کیونکہ مرزا صاحب کو اُن کے دعوے کے مطابق زیادہ اوقات میں وحی و الہام کی بارش ہوتی ہی رہتی تھی، وہ بارش بہت کم رُکتی تھی۔ بعض مخلص حضرات یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر احمدیت کے نظریات اس درجہ خلاف قرآن اور خلاف عقل ہیں تو اتنے بڑے بڑے تعلیم یافتہ، دانشمند لوگ کس طرح احمدیت کے چکر میں پھنس جاتے ہیں یہ حضرات اپنی تائید میں خصوصاً سر محمد ظفر اللہ خان صاحب، اور ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کا حوالہ بھی دیتے ہیں، بے شک سر محمد ظفر اللہ خان صاحب بین الاقوامی شہرت کے JURIST اور قانون دان تھے، اور ڈاکٹر عبدالسلام بھی بڑے مشہور سائنس دان تھے، لیکن ان دونوں حضرات، یا دیگر دانشور حضرات کے احمدی ہونے کے دو اسباب تھے۔

(1) یہ دونوں حضرات اپنے اپنے متعلقہ علم کے ماہر اور اسی بناء پر بین الاقوامی شہرت کے مالک تھے۔ یہ حضرات قرآن کے عالم نہیں تھے کہ انہوں نے قرآن پر بڑا غور و فکر کیا اور پھر اس غور و فکر کے نتیجہ میں اُنہوں نے احمدیت اختیار کی۔ ڈاکٹر عبدالسلام صاحب کی کوئی تحریر ان کے مذہب کے بارے میں کبھی سامنے نہیں آئی۔ البتہ سر محمد ظفر اللہ خان صاحب کی تحریریں موجود ہیں۔ ان کی ایک مشہور کتاب ''تحدیث نعمت'' ہے، جو اگرچہ ان کی سوانح عمری ہے۔ لیکن کہیں کہیں وہ اپنے مذہبی خیالات کا بھی اظہار کرتے ہیں اس کے علاوہ بھی اُن کے چھوٹے چھوٹے دو تین کتابچے ہیں ۔آپ اُن کی کتاب ''تحدیث نعمت'' اور ان کے ان کتابچوں کا مطالعہ فرمائیں، قرآن کریم کے متعلق ان کا مبلغ علم آپ کے سامنے آجائے گا اور یہ بھی واضح ہوجائے گا کہ ان کا مذہبی علم مولویوں کے علم سے بہتر یا بلند نہیں تھا۔ مدت ہوئی (غالباً 1954ء میں) انہوں نے ایک تقریر شاید ''زندہ مذہب'' کے عنوان سے کی تھی۔ طلوع اسلام نے ان کی اس تقریر کا تعاقب کیا اور ان کے نظریات کی تردید کی اور کھلی دعوت دی کہ اگر سر ظفر اللہ خان صاحب اپنے نظریات کے دفاع میں کچھ تحریر کرنا پسند فرمائیں تو رسالہ طلوع اسلام کے صفحات ان کے لئے حاضر ہیں ۔انہوں نے خود تو کچھ نہیں لکھا لیکن کچھ اور حضرات احمدیت کی تائید میں لکھنے کو تیار تھے۔ اس پر طلوع اسلام نے یہ پیشکش کی کہ اگر خود سر ظفر اللہ صاحب اپنی معروفیات کی وجہ سے کچھ تحریر نہیں کر سکتے ،اور دیگر حضرات تحریر کرنے کو تیار ہیں، تو ان حضرات کو چاہیئے کہ وہ سر ظفر اللہ سے اتھارٹی لے کر پھر تحریر کریں تو طلوع اسلام اس کو طبع کر دے گا، یا دوسری صورت یہ تھی کہ ربوہ سے مرزا بشیر الدین احمد صاحب کسی کو اتھارٹی دے دیں تو پھر ان حضرات کی تحریر طبع کر دی جائے گی۔ لیکن اس کے بعد احمدی حضرات میں سے کسی نے کچھ نہیں لکھا۔

دوسری وجہ ان حضرات کے احمدی ہونے کی یہ تھی کہ ان کے مخالف مولوی صاحبان کون سے بڑے عالم اور دانشور تھے۔ ان مولوی حضرات کے نظریات بھی خلاف قرآن اور خلاف عقل تھے۔ جب خلاف قرآن اور خلاف عقل نظریات تسلیم کرنے ہی

ٹھہرے تو وہ احمدیت کو کیوں نہ تسلیم کرتے جو اُن کا آبائی مذہب تھا نہ مولوی حضرات مذہب کے معیار سے بلند ہوئے اور نہ ہی احمدی حضرات۔ دونوں کے فکر کا دارومدار و منبع مذہب اور جھوٹی روایات تھیں۔ ان کے سامنے خالص قرآن اور دین تھا ہی نہیں۔ اس لئے اس دور کے مناظروں کے نتائج ہی سامنے نہیں آئے ہاں اگر وہ دین کے معیار تک پہنچتے اور قرآن خالص اُن کے سامنے ہوتا، تو احمدیت خود اپنی موت آپ مر جاتی۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ عزاسمہ ہے۔ **وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ** (42/10) اور جس کسی بات میں بھی تمہارا اختلاف ہو اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔ احمدی حضرات کی جو مشہور تفسیر "تفسیر صغیر" ہے اس میں بھی اس کا ترجمہ ہے "اور جس کسی (امر) میں تم اختلاف کرو، اس کا آخری فیصلہ اللہ ہی کے قبضہ میں ہے" تحریر کیا ہے۔ اللہ کے قبضہ سے مراد صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے اڑھائی سو سال بعد کی جمع کردہ روایات، اس میں کسی طرح بھی شامل نہیں کی جاسکتیں۔ اس آیت کریمہ کے مطابق ہر اختلاف کا فیصلہ کرنے کا مجاز صرف قرآن کریم ہے۔ صرف قرآن کریم کا فیصلہ ہی صحیح ہے۔ اس آیت کے بعد روایات کی کوئی حیثیت و مقام نہیں رہتا۔

اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے ہیں وہ صرف قرآن میں ہیں (5/9، 9/72، 24/55، 48/29، 57/10) روایات میں اللہ تعالیٰ کے وعدے نہیں ہو سکتے۔ مرزا صاحب نے مسیح موعود (وعدہ کیا گیا) اور مہدی معہود ہونے کے دعاوی کئے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں کسی جگہ بھی نہ تو حضرت مسیح کے آنے کا وعدہ کیا گیا ہے اور نہ ہی حضرت امام مہدی کے آنے کا عہد دیا گیا ہے اس لئے مرزا صاحب کے یہ دونوں دعاوی قرآن کے خلاف قرآن کریم پر ایک اتہام ہیں ان وعدوں کا دُور دُور قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ احمدی حضرات مرزا صاحب کو ان ہی ناموں سے پکارتے ہیں، مرزا صاحب کے یہ دونوں نام قرآن پر الزام و اتہام ہیں۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل مسئلے، الہام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے شروع سے ہی انسان کی یہ خواہش چلی آرہی ہے کہ اللہ تعالیٰ براہ راست ہر شخص سے کلام کرے،

لیکن اللہ تعالیٰ ہر شخص کو اس کا اہل نہیں گردانتا کہ اس سے براہ راست خطاب کرے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہر شخص سے براہ راست خطاب کرنے لگے اور اس کو براہ راست ہدایت دینا شروع کردے، تو اس سے انسان کا ارادہ و اختیار ختم ہوجاتا ہے۔ اور وہ اس خطاب کے مطابق عمل کرنے کا پابند ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تدبیر کہ وہ انبیاء کرام کی معرفت انسانیت سے خطاب کرے، اس میں انسان کا کامل اختیار وارادہ برقرار رہتا ہے کہ وہ چاہے انبیاء کے پیغام پر ایمان لائے اور خواہ ایمان نہ لائے۔ لیکن انسان کی یہی خواہش رہی کہ اللہ تعالیٰ اس سے براہ راست خطاب فرماتا رہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (2/118) (ترجمہ) اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انہوں نے بھی اسی طرح کی بات کہی تھی ان سب کے دل ایک جیسے ہو گئے، جو لوگ یقین رکھنے والے ہیں ان کے لئے ہم نشانیاں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔

آیت کریمہ میں جو ارشاد ہوا کہ اس سے پیشتر بھی علم نہ رکھنے والوں نے اللہ تعالیٰ سے براہ راست خطاب کرنے کا مطالبہ کیا تھا، تو اس کا تذکرہ سورہ مدثر میں ہے جب ارشاد ہوا بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّؤْتٰى صُحُفًا مُّنَشَّرَةً (74/52) (ترجمہ) ان میں ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کو (کلام خداوندی) کے کھلے اوراق ملیں دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ اللّٰهِ (6/124)

اور جب ان کے پاس کوئی آیت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم جب تک نہیں مانیں گے جب تک کہ ہم کو بھی اسی طرح نہ دیا جائے جیسا کہ اللہ کے رسولوں کو دیا گیا۔ ایک جگہ ان کے مطالبہ کو اس طرح بیان کیا کہ ایمان لانے کے لئے ان کا مطالبہ تھا کہ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ (17/93) (ترجمہ) جب تک کہ تو ہم پر ایک کتاب نہ اتار لائے

جس کو ہم پڑھیں۔ قرآن کریم سورہ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت میں، ان مقامات کا حوالہ دے کر فرماتا ہے کہ یہ بے علم لوگوں کا کوئی نیا مطالبہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے قبل بھی وہ اس قسم کے مطالبے کرتے چلے آرہے ہیں۔ آیت زیرِ غور میں قرآن کریم بے علم لوگوں کے دو مطالبوں کا تذکرہ کرتا ہے اُن کا پہلا مطالبہ تو یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ ان سے براہ راست بات کرے، اس آیت میں اس خاص مطالبہ کا جواب نہیں دیا گیا، کیونکہ یہ مطالبہ اس قدر جہالت پر مبنی تھا کہ اس کا جواب نہ دینا ہی بہتر خیال کیا گیا۔ ان کا دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ اُن کو کوئی VISIBLE نشانی دکھائی جائے جس سے متاثر ہو کر وہ ایمان لے آئیں اس مطالبہ کا جواب بھی دوسرے مقامات میں کئی جگہ دیا جا چکا تھا۔ البتہ اس آیت میں ایک بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اللہ سے براہ راست علم حاصل کرنے کے مطالبے میں ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ ان کے دل اور افکار ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ اور اس آیت میں اس قابل مذمت مطالبے اور ذہنیت کو CONDEMN کیا گیا ہے۔ ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ سے براہ راست علم حاصل کرنا چاہتا ہے اس کا دل اُن ہی بے علم لوگوں کی مانند ہے جن کا ذکر متذکرہ آیات میں آیا ہے۔ ان آیات کے مطابق جو شخص بھی الہام کا دعویٰ کرتا ہے قرآن کے مطابق وہ بے علم ہے اور اس کا دل بھی ان سابقہ بے علم اور ایمان نہ لانے والوں کی مانند ہوتا ہے، اور اُن کے لئے ہی قرآن نے تَشَابَهَتْ قُلُوبُهُمْ فرمایا ہے

الہام کے بارے میں ایک اصولی بات تو یہ ہے کہ جب قرآن کریم میں نہ تو الہام کا لفظ آیا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی ذکر آیا ہے، تو اس کا واضح جواب تو صرف یہی ہے کہ الہام کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن چونکہ ہمارے علماء کرام صرف ایک آیت سے اس کی سند لاتے ہیں، اس لئے اس آیت پر غور کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس آیت کا ترجمہ اور اس کا مفہوم ملاحظہ فرمائیں، اس کے بعد اس پر تبصرہ پیش خدمت کیا جائے گا۔

(1) ارشاد ہوتا ہے فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (91/8) (ترجمہ) پھر سمجھ دی اس (نفس) کو ڈھٹائی کی، اور بچ کر نکلنے کی (ترجمہ حضرت شیخ الہند) حضرت علامہ عثمانی نے اس آیت کی تفسیر میں تحریر فرمایا۔ "اعتدال مراجع کار اور حواس ظاہری و باطنی اور قوائے

طبیعہ حیوانیہ ونفسانیہ، اس کو دے اور نیکی اور بدی کے راستوں پر چلنے کی استعداد رکھی۔

(2) مشہور تفسیر ضیاء القرآن میں ارشاد ہے" انسان میں نیکی کرنے اور بُرائی کرنے کی دونوں صلاحیتیں موجود ہیں۔اب اس کی مرضی کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے یا بُرائی کو اختیار کرتا ہے۔"

(3) تفسیر "تدبر قرآن" میں اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں تحریر ہے،" یہ عمل تسویہ کی تفصیل ہے۔ انسان کی تخلیق کا تکمیلی مرحلہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بعد اندر ایک نور یزدانی ودیعت فرمایا جس سے اس کے اندر یہ استعداد بیدار ہو کہ کیا چیز اس کے لئے نیکی ہے اور کیا چیز بدی اور شر۔ سابقہ سورت میں اسی حقیقت کی طرف وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90/10) الفاظ سے اشارہ گذر چکا ہے۔

(4) قدیم اور مستند تفسیر مظہری میں مرقوم ہے" الہام فجور وتقویٰ کا معنی یہ ہے کہ اللہ نے ہر شخص کے سامنے خیر وشر اور اطاعت ومعصیت کا راستہ کھول دیا ہے تاکہ خیر اور اطاعت کا اختیار کرے اور شر اور معصیت سے پرہیز کر رکھے۔"

صرف یہ ایک آیت ہے جس سے ہمارے علماء کرام الہام کی سند دیتے ہیں اور الہام، تصوف، روحانیت، احمدیت، سب کی بنیاد صرف یہ ایک آیت ہے۔ آپ نے چار مستند تفاسیر سے اس آیت کی تفسیر ملاحظہ فرمائی۔ ان چاروں تفاسیر میں اس آیت سے کسی جگہ بھی الہام کی نشاندہی نہیں ہوتی۔ ہمارے علماء کرام کے نزدیک الہام کی یہ تعریف (DEFINITION) ہے، جو تفسیر جلالین میں مرقوم ہے" کسی تصور وخیال کا غیر شعوری طور پر منجانب اللہ کسی کے دل ودماغ میں آجاتا ہے اس کو اصطلاحی طور پر الہام کہا جاتا ہے۔" تمام علماء کرام کے نزدیک الہام کی یہی تعریف ہے۔لیکن ان تفاسیر نے جو اس آیت کی توضیح کی ہے، اس سے اس اصطلاحی الہام کا کوئی دور دور سے بھی تعلق پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ الہام کے ایک معنی تو لغوی ہیں جس کی رُو سے ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کی تفسیر کر دی ہے۔لیکن الہام کے ایک اصطلاحی معنی ہیں جو ہمارے صوفیاء نے اپنی طرف سے بنا لئے ہیں۔ اس اصطلاحی معنی کی کوئی گنجائش اس آیت سے

نہیں نکلتی۔ہمارے علماء کرام عمداً، جان بوجھ کر، ان اصطلاحی اور لغوی معنی میں خلط ملط (CONFUSION) پیدا کرتے ہیں۔جب وہ آیت کا ترجمہ اور تفسیر کرتے ہیں تو وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ وہ الہام کے لغوی معنی لیں، اسی لئے وہ آیت کا صحیح مفہوم بیان کرتے ہیں، جو آپ نے اوپر ملاحظہ فرما لیا۔لیکن جب وہ اپنے نظریات ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس جگہ وہ الہام کے اصطلاحی معنی لے کر، اپنے نظریہ کے مطابق تصوف کے سلاسل اور پرستش کے طور طریقے جاری کرتے ہیں۔

اس آیت کی جو تفسیر چار مستند تفاسیر سے پیش خدمت عالی کی گئی ہے اس کے بعد اگرچہ اس کی مزید ضاحت کی ضرورت نہیں تھی تاہم بر سبیل احتیاط، اس کو مزید واضح کیا جاتا ہے

جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرما لیا ہے کہ صاحب تدبر قرآن، حضرت مولانا اصلاحی صاحب نے فجور و تقویٰ کے الہام کو وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90/10) ہم نے اس کو دونوں راستے دکھا دیئے کے مرادف بیان کیا ہے۔یعنی ان کے نظریے کے مطابق بھی نفس انسانی کے اندر حق و باطل کی تمیز کرنے کی کوئی صلاحیت ودیعت نہیں کی گئی ہے، بلکہ نفس انسانی کے اندر ہی اس کا فجور و تقویٰ رکھا ہوا ہے۔یہ اس کے اندر صلاحیت موجود ہے۔اب جس کا جی چاہے اپنی ذات کو بنا لے، اور جس کا جی چاہے بگاڑ دے نفس انسانی کے اندر جس انداز سے اس بات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے، یہ چاہے تو غلط روش پر چل کر اپنے اندر انتشار (فجور) پیدا کرے یا اس انتشار سے محفوظ رکھ کر مستحکم (تقویٰ) ہو جائے۔ اس بارے میں ایک دو نکات اور بھی توجہ کے قابل ہیں۔

اس آیت میں 'نفس' کا لفظ نکرہ استعمال ہوا ہے، اس میں اچھے بُرے، مومن کافر کی کوئی تمیز و تفریق نہیں ہے۔ظاہر ہے کہ ہمارے علماء کرام کا جو مصطلحہ الہام ہے وہ غیر مسلم کو نہیں ہو سکتا، اس لئے اس آیت سے وہ موہومہ الہام ثابت نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ الہام تو ہر شخص کو ہو گیا ہے۔

جیسا کہ الہام کی کی تعریف میں بیان کیا گیا ہے، الہام ایک ایسا تصور یا خیال ہوتا ہے جو غیر شعوری طور پر منجانب اللہ دل یا دماغ میں آ جاتا ہے۔ہمارے علماء کا عقیدہ

ہے کہ یہ خیال بغیر الفاظ کے الہام ہوتا ہے۔حالانکہ کوئی خیال بغیر الفاظ کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔بغیر الفاظ کے صرف خیال کا دل یا دماغ میں آجانا PSYCHOLOGICALLY IMPOSSIBLE ہے۔علم نفسیات کے مطابق اس کا امکان ہی نہیں ہے۔پہلے تو یہ عقیدہ چل سکتا تھا۔لیکن اب جدید علوم کی روشنی میں اس نظریہ کا امکان ہی نہیں ہوسکتا۔اس مضمون کی تحریر کے وقت متعلقہ کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔

اگر ذرا سی محنت کر کے، الہامات جمع کر کے ان کا تفحص کیا جائے تو آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی موضوع پر مختلف مُلہم علیہ حضرات کو مختلف و متضاد الہام ہوئے ہیں۔کسی کو الہام ہوا ہے کہ امام مہدی شافعی المذہب ہوں گے، اور کسی کو الہام ہوا ہے وہ حنفی المذہب ہوں گی۔متعلقہ کُتب سے ایسے الہامات کو جمع کر کے ان کا مطالعہ، ایک دلچسپ تحقیق ثابت ہوگی۔اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ علم میں تضاد نہیں ہوسکتا۔اس کی طرف سے عطا کردہ علم کی یہ شان نہیں ہوسکتی۔پھر الہام صرف صاحب الہام پر حجت ہوتا ہے، مُلہم علیہ کے علاوہ دیگر حضرات کے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

یہ بات خوب ذہن نشین فرمالیں کہ الہام کی مذہب میں تو گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن دین میں اس کی کوئی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی دین کی رُو سے نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست علم مل سکتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی براہِ راست اطاعت ہوسکتی ہے۔علم خداوندی بھی رسول کی معرفت ملتا ہے، اور اطاعتِ خداوندی بھی رسول کے معرفت ہوسکتی ہے۔رسول کے بعد علم صرف قرآن سے مل سکتا ہے، اور اللہ کی اطاعت صرف جانشین رسول کی اطاعت کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔نہ کسی کو براہِ راست علم مل سکتا ہے نہ کوئی براہِ راست اطاعتِ خداوندی کرسکتا ہے۔جس طرح براہِ راست علم ملنے کے تصور نے قرآن کو عملاً منسوخ کردیا ہے، اسی طرح براہِ راست اللہ کی اطاعت کرنے کے تصور نے اطاعت کو پرستش میں بدل کر دین کے قیام کی راہ مسدود کردی ہے۔خدا سے براہِ راست علم ملنا، اور اللہ تعالیٰ کی براہِ راست اطاعت کرنا، ان دونوں عقیدوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔یہ دونوں عقیدے ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔یہ دونوں عقیدے مذہب کے

داعی اور دین کے دشمن ہیں۔ جب تک ہم مسلمان ان دونوں عقیدوں سے جان نہیں چھڑا تے ، ہزار ہا کوششوں کے باوجود کبھی اپنے زوال و ادبار سے باہر نہیں نکل سکتے ۔

حقوق اللہ و حقوق العباد کی وضاحت

ایک صاحب نے حقوق العباد کے بارے میں استفسار فرمایا ہے۔ جواب حاضر ہے

ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آپس میں انسانوں کے باہمی معاملات کو اچھی طرح ادا کرنا، حقوق العباد پورا کرنا ہوتا ہے، اور جو رسوم پرستش کرنے کی ہیں وہ حقوق اللہ شمار ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص پابندی سے نماز نہیں پڑھ رہا ہے تو اس کے لئے کہا جائے گا، کہ وہ حقوق اللہ اچھی طرح ادا نہیں کر رہا ہے۔ عیسائیت میں اس طرح کی ھویت موجود تھی کہ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا حصہ قیصر کو، غالباً اسی تصور کے زیر اثر ہمارے ہاں بھی یہی عقیدہ رواج پا گیا ہے، مذھب میں چونکہ انفرادی پرستش ہوتی ہے، اس لئے اس میں تو یہ عقیدہ چل گیا، لیکن دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہماری اصول فقہ کی کتابوں میں بھی حقوق پر بحث ہوتی ہے، لیکن چونکہ وہ فقہ مذھب کے زیر اثر تصنیف کیا گیا ہے، اس لئے اس میں بھی حقوق اللہ و حقوق العباد میں تفریق کی گئی ہے۔ اصول فقہ کے مطابق حقوق اللہ وہ ہیں جن میں کسی ایک شخص کے فائدے کے بجائے تمام مسلمانوں کا فائدہ مقصود ہوتا ہے ان حقوق کی خلاف ورزی سے نقصانات ہوتے ہیں۔ اور ان کی انجام دہی سے منافع حاصل ہوتے ہیں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد جو وجہ امتیاز ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے فقہا کے نزدیک حقوق اللہ کی تعمیل کرانا خود حکومت کا فرض ہے جبکہ شخصی قوانین کی پابندی کرنا، اس شخص کی مرضی پر موقوف ہوتا ہے۔ جس کے حقوق میں مداخلت کی گئی ہے۔ مثلاً سرقہ کے جرم میں حد کا جاری کرنا حقوق اللہ میں شمار ہوتا ہے۔ یہ جرم ایسا ہے کہ اس میں ضرر رسیدہ شخص کو اس بات کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ جرم معاف کردے۔ یہ PUBLIC RIGHTS بھی کہلاتے ہیں۔

لیکن وہ معاملات جو حقوق العباد کہے جاتے ہیں۔ جیسے معاہدات کی تکمیل ذاتی جائیداد وغیرہ کی حفاظت، ان حقوق کا حاصل کرنا، ان حضرات کی مرضی پر منحصر ہوتا ہے، جن کے حقوق تلف کئے گئے ہیں۔

قرآن کریم میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی کوئی ثنویت (DUALISM) نہیں ہے۔ قرآن کریم میں تمام حقوق انسانوں کے ہی ہیں۔ ایک جگہ واضح طور پر حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (2/180) بھی آیا ہے۔ یعنی متقین کے ذمہ اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اس قانون (وصیت) پر خود عمل کریں، بلکہ دوسروں پر بھی یہ واجب ہے کہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ لیکن حقوق اللہ کا کوئی ذکر کسی جگہ بھی نہیں ہے۔ اس قسم کی جو آیات ہیں وَالَّذِيْنَ فِىْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (70/24) اور ان کے مال میں سائل و محروم کا ایسا حق ہے جو تمہیں معلوم ہے وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَ الْمِسْكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ (17/26) قریبی رشتہ دار اور مسافر کو اس کا حق دے دو۔ تو ان آیات میں بھی در حقیقت انسانوں کا حق ہی جتلایا گیا ہے سارے قرآن میں صرف ایک جگہ "اللہ کے حق" کا اشارہ آتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ وہ بھی انسانوں کے حقوق ہی ہیں وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ يَوْمَ حَصَادِهٖ (6/141) ترجمہ اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کر دو۔ اس آیت میں جس چیز کو اللہ کا حق کہا گیا ہے۔ یہ وہی حق ہے جسے دوسرے مقامات پر محتاجوں کا حق بتایا گیا ہے جس طرح اللہ کو قرض دینے سے مراد ہے۔

حقوق اللہ حقوق العباد سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ ہر دنیاوی کام جس کا فیصلہ وحی الٰہی کے مطابق کر دیا جائے وہ دینی بن جاتا ہے اور یہی سب حقوق العباد ہو جاتے ہیں ارشاد ہوتا ہے وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11/6) اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ ہر انسان کا حق ہے کہ اس کو رزق حاصل ہو۔ اسلامی نظام میں حقوق اور فرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں ارشاد ہوتا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا (24/27) اے ایمان والو! اپنے گھروں کے علاوہ دوسروں کے گھروں میں

داخل نہ ہو یہاں تک کہ ان سے اجازت حاصل کرلو۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ دوسرے کے گھر میں بغیر اجازت داخل نہ ہو، اسی طرح ہر شخص کا حق ہے (RIGHT) ہے کہ اس کے گھر میں کوئی شخص بغیر اجازت کے داخل نہ ہو۔ وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ (2/233) مائیں اپنی اولاد کو پورے دو سال دودھ پلائیں، ہر ماں کا فرض ہے کہ وہ بچے کو دو سال دودھ پلائے، ہر بچہ کا حق (RIGHT) ہے کہ وہ اپنی ماں سے دو سال تک دودھ حاصل کرے۔ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5/8) انصاف کرو کیونکہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ ساری زندگی عدل قائم رکھے، دوسرے لوگوں کا حق ہے، کہ ان سے عدل سے برتاؤ کیا جائے۔ اس طرح حقوق وفرائض ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ عموماً رسوم عبادات کو حقوق اللہ میں شامل کیا جاتا ہے کہ نماز پڑھنا، روزہ رکھنا، زکوۃ دینا، حقوق اللہ ہیں۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں ہے۔ اقامت صلوٰۃ سے فحشاء اور منکر کی روک تھام ہوتی ہے (29/45) عبادت الٰہی سے اس زمین میں حکومت وتمکن حاصل ہوتا ہے اور معاشرہ کا خوف امن میں تبدیل ہو جاتا ہے (24/55) ان سے سارے انسانی حقوق پورے ہوتے ہیں۔ روزہ سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے یعنی احکام وقوانین کے وہ غلط نتائج جس سے انسانیت کو نقصان ہوتا ہے، اس سے حفاظت مل جاتی ہے۔ ادائیگی زکوٰۃ سے بھی انسانوں کی خدمت اور ان کے حقوق کی بجا آوری ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت کے قوانین وضوابط کی اطاعت کرنے سے لوگوں کے معاملات ومفادات کا تحفظ ہوتا ہے، اور اس طرح حقوق العباد ہی پورے ہوتے ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تقسیم کسی طرح بھی نہیں ہو سکتی۔

وہ ایمان جو خالی الفاظ کا مجموعہ سمجھ لیا جائے اور جس کی تصدیق اعمال حیات نہ کریں برف کا ایسا تودہ بن جاتے ہیں۔ جو رگوں میں دوڑانے والے خون گرم کے ہر قطرہ کو منجمد کر کے رکھ دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

روحانیت کا روایتی قرآنی مفہوم

میرا ایک مضمون ''خالص قرآن فہمی کے دو چشمے'' موقر رسالہ صوت الحق کی اشاعت بابت اکتوبر 2003ء میں طبع ہوا تھا جس میں فرقہ اہل قرآن اور تحریک طلوع اسلام کے نظریات کو TRACE کر کے، ان دونوں تحریکوں کی ذہنی قربتوں اور فاصلوں کو بیان کیا گیا تھا۔ قارئین کرام نے اس مضمون میں بہت دلچسپی لی۔ خاص طور پر اُن حضرات نے جو کافی عرصہ سے ان دونوں تحریکات سے وابستہ تھے۔ اس مضمون سے یہ بخوبی واضح ہوتا تھا کہ چونکہ دونوں تحریکوں کے نزدیک آخری سند اور حُجت صرف قرآن کریم ہے۔ اس لئے اصولی نظریات میں ان دونوں تحریکوں میں اتفاق ہے۔ لیکن چونکہ ہر شخص کی سوچ میں نئی نئی راہیں نکلتی ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ انسانوں کی سوچ میں اختلاف ہونا ضروری ہے۔ غلطی کرنا انسانی سوچ کا خاصہ ہے۔ انسانی سوچ غلطی سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ جن حضرات نے علم منطق کا تھوڑا بھی مطالعہ کیا ہوگا، انہیں بخوبی علم ہوگا کہ مناطقہ علم منطق کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ علم منطق انسانی سوچ کو غلطی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کی تعلیم کی ترغیب دیتے ہیں۔ لیکن حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہی مناطقہ جو منطق کی یہ تعریف کرتے ہیں، خود منطقی مباحث میں ایک دوسرے سے اختلاف کرتے چلے آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی ایک سوچ اور نتیجہ میں غلطی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے کسی نے خوب کہا۔

مرازِ منطق آید بوئے خامی   دلیلِ او دلیلِ نا تمامی

یہ صرف اور صرف وحی الٰہی کا خاصہ ہے جو غلطی سے محفوظ، اور مبرا ہوتی ہے اور اپنے متبعین کو غلط سوچ سے محفوظ رکھتی ہے۔ ہم مسلمانوں میں جب درس و تدریس اور

تصنیف وتالیف کی ابتداء ہوئی۔تو قرآن کریم کے ساتھ روایات کو وحی کی حجت کا درجہ اس سے پیشتر دیا جاچکا تھا۔نیز یہ کہ دین مذہب میں تبدیل ہو چکا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہم مسلمانوں میں خالص قرآنی نظریات کبھی پہنچنے ہی نہ پائے۔قرآن کریم غلط وصحیح ،حق و باطل کے پرکھنے کی ایک ایسی میزان تھی (اور ہے) کہ جو متعین طور سب کے سامنے موجود ہے۔قرآن کریم میں بھی یہی حکم تھا وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (42/10)تم آپس میں جس چیز میں بھی اختلاف رکھتے ہو،اس کا فیصلہ اللہ(کی کتاب) کے حوالہ ہے،لیکن چونکہ روایات خود بھی وحی قرار دی جاچکی تھیں۔اس لئے انہیں ہی حق وباطل کے پرکھنے کا ایک معیار قرار دے دیا گیا۔لیکن دقت یہی تھی کہ روایات خود مشکوک وظنی تھیں،نیز یہ کہ روایات صحت وسقم کے پرکھنے کے سارے معیار و ذرائع خود ظنی ومشکوک تھے۔پھر اس پر مستزاد یہ ہے کہ حدیث نے قرآن کو بھی اپنے ساتھ لپیٹنے کی کوشش کی،اس طرح خود غلط،مضمون غلط،املا غلط،انشا غلط والی کیفیت ہمارے سارے لٹریچر میں سرائیت کرگئی۔اور قرآن کریم کی واضح وصاف تعلیم سامنے نہ آسکی۔

ہمارا موجودہ دور اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ پاکستان میں یہ دو تحریکات شروع ہوئیں۔اور انہوں نے خالص قرآنی نظریات پھیلانے میں اپنا حق ادا کردیا۔اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل موضوع ''روح'' کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

''روح'' کے متعلق ان دونوں تحریکات نے خوب خوب تحریر کیا۔اس بارے میں دونوں تحریکات میں کچھ اختلافات ہے،ورنہ زیادہ تر اتفاق ہی ہے۔البتہ ہماری پیشوائیت جو نظریات پیش کرتی چلی آرہی ہے۔چونکہ وہ قرآن کے خلاف اور رولیات سے ماخوذ ہیں۔اس لئے ان دونوں تحریکات نے ان کی تردید وتغلیط کی ہے۔اب آپ کے سامنے سب سے پہلے روایات پر مبنی پیشوائیت کا نظریہ پیش کیا جاتا ہے۔اس کے بعد ان دونوں تحریکوں کے نقطہ نگاہ،ان کے اتفاق اور اختلاف کے نقاط پیش خدمت عالی ہوں گے یہ بات آپ کی صوابدید پر چھوڑی جاتی ہے کہ ان تینوں نظریات میں سے آپ کا رجحان اور میلان طبعیت کس طرف ہے۔ادارہ صوت الحق کی درخواست ہے کہ کسی بھی نظریہ کو ترجیح

دینے کے وجود سے اس ادارہ کو بھی مطلع کریں تاکہ اس موضوع پر آپس میں مشاورت ہو سکے۔ اب آپ پہلے روایتی نظریہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) ترمذی نے اس حدیث کو حضرت ابودرداء کی روایت سے اس طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا اللہ نے آدم کو جس وقت پیدا کیا تو ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ پھیرا جس سے چھوٹی چیونٹیوں کی طرح ان کی ساری گوری نسل نکل پڑی۔ اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کوئلہ کی طرح سیاہ نکل پڑی۔ دائیں طرف والوں کے متعلق اللہ نے فرمایا یہ جنت کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی اطاعت کی پروا نہیں اور بائیں شانے والوں کے متعلق فرمایا کہ یہ دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے ان کی نافرمانی کی پروا نہیں (تفسیر مظہری جلد 3-4، صفحہ 284)

(2) حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ حضورؐ سے اس آیت (7/172) کا مطلب دریافت کیا تو حضورؐ نے فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی پشت پر اپنا دستِ قدرت پھیرا جس کی وجہ سے آپ کی ہونے والی ساری اولاد ظاہر ہو گئی

(3) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے انہوں نے کہا۔ فرمایا رسول اللہ نے جب پیدا کیا اللہ نے آدم کو تو ہاتھ پھیرا اس کی پشت پر۔ پس گریں اس کی پشت سے ارواح جن کا اللہ خالق ہے آدم کی اولاد سے قیامت کے دن تک۔

ہمارے علماء کرام کا نظریہ یہ ہے کہ میثاق کے روز ہی اللہ تعالیٰ نے کروڑوں کی تعداد میں ارواح بنائی تھیں۔ اور جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو ان پیدا شدہ ارواح میں سے ایک روح اس کے اندر ڈال دی جاتی ہے، مشہور تفسیر "ضیاء القرآن" میں تحریر ہے، ان احادیث صحیحہ کی موجودگی میں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل کریں۔ جو قادر مطلق اپنی قدرت کاملہ سے قیامت کے دن سب اولاد آدم کو میدان حشر میں جمع فرما سکتا ہے۔ اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ وہ پشت آدم سے ان کی ساری اولاد نکال کر، اپنی بارگاہ میں پیش کر دے۔ (تفسیر ضیاء القرآن جلد دوم ص 101) جیسا کہ اوپر تحریر کیا گیا کہ ہمارے علماء کرام کی سوچ قرآن پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ ان کی سوچ کا اصل

چشمہ روایات میں ہے جس کی وجہ سے وہ خلاف قرآن عقائد کو اختیار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہمارے اس خیال کی سند اور تائید تفسیر ضیاء القرآن نے فراہم کر دی۔

ان چند وضعی روایات کی وجہ سے علماء کرام نے روح کا یہ تصور CONCEPT اختیار کیا ہوا ہے جو نہایت مضحکہ خیز ہے خیال رہے کہ روح کا یہ غلط تصور ہی انفرادی پرستش، تصوف، نجات، ایصال ثواب، خانقاہیت، رہبانیت، تقشف، تخشع، الہام، مراقبہ، مجاہدہ، وسیلہ، قرب خداوندی، سب کی بنیاد و اساس فراہم کرتا ہے۔ ان سب رسوم و نظریات سے انفرادیت کی خوب آبیاری ہوتی ہے، اور ان سب چیزوں کا مذہب کی دنیا سے تعلق ہے۔ یہ سب نظریات ورسول ہی دین کے قیام میں سب سے زیادہ مانع ورکاوٹ ہیں۔ ہماری پیشوائیت ان سب نظریات کی قائل ہے۔ اسی وجہ سے ان کے سامنے نہ دین کا تصور ہے اور نہ ہی وہ قیام دین کے لئے کوشاں ہوتے ہیں۔ دین کے قیام کے لئے سب سے پہلے روح، روحانیت اور عبادت گزاری کے تصورات کو قرآن کریم کے مطابق کرنا ہوگا۔

اب آپ علماء کرام اہل قرآن کا نظریہ روح ملاحظہ فرمائیں۔ فرقہ اہل قرآن میں روح کے مسئلہ کے متعلق سب سے پہلے سرتاج مفسرین، مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم نے اپنی تفسیر میں تقریباً ستر (70) صفحات پر مشتمل ایک مضمون بعنوان ''روح الانسان کما بین القرآن'' تحریر فرمایا۔ اس کے علاوہ محترم اتھام جناب سرحد صاحب نے دو مضامین ''روح کا تجزیہ'' کے موضوع سے تحریر کئے ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ بھی ''تفسیر القرآن بالقرآن'' میں متعدد مقامات پر 'روح' کے متعلق علمی بحث کی گئی ہے۔ یہ مواد متفرق مقامات پر بکھرا ہوا ہے۔ ان حضرات نے روح کا خالص قرآنی نظریہ پیش کیا ہے اور ہر مقام پر قرآنی آیات تائید میں پیش کی گئی ہیں۔ ان حضرات کے نظریات کا ملخص تحریر کیا جاتا ہے۔

روح کے متعلق روایتی نظریہ یہ ہے کہ ہر جنین میں سابقہ پیدا شدہ ارواح میں سے ایک روح چُن کر ڈال دی جاتی ہے۔ جس سے بچہ میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ روایتی نظریہ ہی غلط ہے کیونکہ انسانی جنین مُردہ ہوتا ہی نہیں جسم کی ہر چیز زندہ ہوتی ہے۔

خون کے جراثیم تک زندہ ہوتے ہیں مرد اور عورت کے اجسام سے جو مادہ تولید برآمد ہوتا ہے، وہ بھی زندہ ہوتا ہے وہ مُردہ نہیں ہوتا۔ یہ کوئی نظری بات نہیں ہے۔ اب تو میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ خلاف قرآن عقائد چل ہی نہیں سکتے۔ میڈیکل سائنس بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مادہ تولید میں زندگی ہوتی ہے۔ اسے زندہ کرنے کے لئے روح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

(2) رحم مادر میں جنین جو مراحل طے کرتا ہے اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنسَانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِىْ قَرَارٍ مَّكِينٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا** (23/13)

اور بے شک ہم نے ابتداء انسان کو گیلی خمیر شدہ مٹی سے سُلالہ (AMO EB A) سے پیدا کیا۔ پھر اس جرثومہ حیات (AMO EB A) کو نطفہ کی شکل میں نر و مادہ کے خاص حصہ جسم میں رکھ دیا۔ پھر ہم نطفہ کو علقہ کی شکل میں تبدیل کرتے ہیں۔ پھر علقہ کو مضغہ بنا دیتے ہیں۔ پھر اُسے ہڈیوں کے سانچے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں۔

آپ ملاحظہ فرمائیں کہ جنین جو مراحل طے کرتا ہے اس کا مکمل نقشہ کھینچ دیا گیا ہے، آپ غور فرمائیں کہ کیا بے جان نطفہ یہ مراحل طے کر سکتا ہے؟ پھر یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ جنین کے پورے مراحل بیان کر دیئے گئے ہیں لیکن کسی جگہ بھی ادخال روح کا کوئی تذکرہ ہی نہیں ہے۔ حالانکہ روایتی نقطہ نظر سے ادخال ان سب سے اہم مرحلہ ہوتا ہے۔ جنین کے ان مراحل کا تذکرہ کرنے سے قرآن کریم نے روح کی بالکل نفی کر دی ہے۔

(3) روایتی نظریہ یہ ہے کہ "میثاق" کے روز رُوحیں پیدا کر دی گئی تھیں اور ان کا ایک ذخیرہ اکھٹا کر لیا گیا تھا۔ لاکھوں کروڑوں برس پیشتر پیدا شدہ روحوں پر وقت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ نہ ان میں بچپن کی بے زبانی و بے شعوری ہوتی ہے۔ نہ ضعیف العمری کی کمزوری وہ ایک ہی حال میں رہتی ہیں۔ لیکن ہم اپنے تجربہ میں جو مشاہدہ کرتے ہیں وہ اس بات کی

تائید نہیں کرتا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچپن میں قویٰ کمزور ہوتے ہیں، جوانی میں یہ طاقتور ہوتے ہیں اور بڑھاپے میں پھر کمزور ہو جاتے ہیں اگر روح جسم کے علاوہ کوئی اور شے ہے ،تو وہ جسم کے تغیر میں اس کے ساتھ کیوں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ علماء اہل قرآن کے اس نظریہ کو آپ ان کے اپنے الفاظ میں ہی ان دو اقتباسات میں ملاحظہ فرمائیں۔

''مشاہدہ تو یہ ہے جس سے کسی ذی شعور شخص کو مجال انکار نہیں کہ جوں جوں بچہ بڑھتا ہے اسی قدر اس کی طاقت، ہوش وحواس اور فہم و فراست میں بھی ترقی ہوتی جاتی ہے۔ مگر جب قوائے انسانی میں اضمحلال شروع ہو جاتا ہے تو ساتھ ہی طاقت اور باقی سب خوبیاں بھی ناپید ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور بڑھاپے میں جسم از کار رفتہ ہو جاتا ہے۔ اگر روح اس سے الگ چیز ہے تو وہ کیوں جسم کے ساتھ بے کار ہو کر رہ جاتی ہے؟ حالانکہ اس کو جو بقول بعضے جسمانی عوارضات سے مبرا ہے عمر کے ہر مرحلے پر اپنی لایموت، مستعد اور زیرک زندگی کا ثبوت دیتے رہنا چاہیے۔ یہ جسم کے ہر تغیر میں اس کے ساتھ برابر کی شریک کیوں رہتی ہے؟ حتیٰ کہ جب جسم کا ایک حصہ (دماغ) پاگل ہو جاتا ہے، تو یہ اس کے ساتھ پاگل کیوں ہو جاتی ہے۔ اور جب یہ حقیقت ہے کہ اس کی قوت و اضمحلال جسم کی قوت و اضمحلال پر منحصر ہے تو ثابت ہوا کہ جسم سے الگ روح کا کوئی وجود نہیں۔ بلکہ انسانی شعور انسانی اجزائے ترکیبی ہی کا نتیجہ ہے جسے غلط طور پر روح کے نام سے موسوم کیا جا چکا ہے۔''

محترم جناب سرمد صاحب کے مضمون ''نظریہ روح کا تجزیہ'' کا دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں ''نہ جسم سے الگ روح کا کوئی وجود موجود ہے نہ وہ جسمانی عوارضات سے مستغنی ہے اور نہ موت کے قانون سے بری۔ اور جب یہ ثابت ہو چکا کہ انسانی شعور جسم کی توانائی کے ساتھ ساتھ توانا ہوتا ہے اور جسم کے اضمحلال کے ساتھ ساتھ مضمحل ہو جاتا ہے تو ثابت ہوا کہ شعور جسے غلطی سے روح کا نام دے دیا گیا ہے، انسانی جسم کا ہی حصہ ہے ۔اس کی پیدائش کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس کی طاقت کے ساتھ طاقت پکڑتا ہے، اس کی کمزوری سے کمزور ہو جاتا ہے اور اس کی مدت پر مر جاتا ہے اور جب اللہ قیامت کے دن مردہ جسموں کو دوبارہ زندہ کرے گا، تو یہ بھی زندہ ہو جائے گا روح نامی الگ کوئی چیز ہرگز

موجود نہیں۔"

مولوی محمد عبداللہ صاحب اور دیگر علماء اہل قرآن کے سارے لٹریچر کا ملخص یہ ہے کہ روح جسم سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ جسم انسانی کی ہر چیز مٹی سے بنتی ہے۔ اسی طرح اس کی 'روح' بھی مٹی سے ہی بنتی ہے۔ اس کو باہر سے داخل نہیں کرتے اور موت کے وقت 'روح' (شعور) اپنے بدنوں میں ہی فنا ہو جاتی ہے، جس طرح چراغ بجھنے سے اس کی روشنی ختم ہو جاتی ہے یا گھڑی کے بگڑ جانے سے اس کی رفتار ختم ہو جاتی ہے۔ پھر قیامت کے روز وہ جسم سمیت زندہ کی جائے گی۔ اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے اعمال کی سزا و جزا دے گا۔ ان حضرات نے اپنے نظریات و عقائد کی تائید میں ہر ہر موقع پر آیاتِ قرآنی نقل کی ہیں۔ اس مضمون میں بوجہ اختصار تمام آیات اور ان کے پیش کردہ دلائل تحریر نہیں کئے جاسکتے جن حضرات کو اس موضوع سے دلچسپی ہو وہ مولوی محمد عبداللہ صاحب کی تفسیر خود ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ اب اس موضوع کے بارے میں تحریک کا موقف آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

علامہ پرویز صاحب قرآن کریم میں آمدہ لفظ روح کو نفس انسانی یا ذات کے لفظ سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا موقف ہے کہ ہر انسانی بچے کو ایک ملکہ صلاحیت، استعداد، ایک الوھیاتی توانائی دی جاتی ہے۔ اس توانائی کی نشوونما کرنا انسانی زندگی کا مقصد ہے۔ اس توانائی کی نشوونما قوانین خداوندی کے اتباع سے ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے جو اقدار عنایت فرمائی ہیں ان کے مطابق زندگی گزارنے سے اس توانائی میں ترقی وارتقاء ہوتا ہے ۔جب کبھی بھی انسان کے ذاتی مفاد اور قرآنی قدر میں تصادم آپڑے۔ تو قرآنی قدر کو ترجیح دینے سے نفس انسانی کی بالیدگی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم میں بھی نشوونما ہوتی ہے۔ پیدائش کے وقت انسانی بچہ بہت چھوٹے جسم کا ہوتا ہے، لیکن مرور ایام کے ساتھ ساتھ تو یہی بچہ پانچ چھ فٹ تک چلا جاتا ہے، اس کا جسم بھی توانا و مضبوط ہو جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح نفس انسانی میں بھی نشوونما کی گنجائش ہوتی ہے۔ جسم کی پرورش فطری قوانین کے مطابق ہوتی ہے، جبکہ نفس انسانی کی پرورش وحی الٰہی پر عمل کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے

جہاں انسان وحی کا محتاج ہوتا ہے۔ نفس انسانی صفات خداوندی کو اپنے میں منعکس کرنے سے ترقی پاتی ہے۔ جس قدر صفات خداوندی کا انعکاس کسی ذات میں ہوگا، اسی درجہ وہ ذات نشوونما یافتہ ہوگی اور اسی کو دوسرے الفاظ میں قرب خداوندی کہا جاتا ہے۔ جب انسانی ذات ترقی یافتہ ہو جاتی ہے تو اس کا ہر ردِ عمل قانون خداوندی کے مطابق ہوتا چلتا ہے ۔جس قدر ردِ عمل قوانین خداوندی کے مطابق ہوگا، اتنا ہی اس ذات میں تقویٰ بڑھ چکا ہوگا جب نفس انسانی مضبوط ہو جاتی ہے تو موت کے صدمے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا، نفس انسانی ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔علامہ اقبال کا مشہور شعر ہے۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے
کہ جان مرتی نہیں مرگ بدن سے

احسان دانش نے بھی اس کو اس طرح کہا ہے۔

موت کے صدمے سے کم ہوتی نہیں تابندگی
اس طرف بھی زندگی ہے، اُس طرف بھی زندگی

اگر یہ ذات ترقی یافتہ ہے، تو یہ اگلی نوع میں منتقل ہو جائے گی، اور یہی اس کی جنت ہے۔لیکن اگر ذات کی تربیت نہیں ہوتی ہے تو یہ مرنے کے بعد اسی نوع میں رہے گی اور یہ اس کی جہنم ہے۔ نفس انسانی کے موضوع پر صفحات کے صفحات تحریر کیئے گئے ہیں موقع بہ موقع اس کی وضاحت و صراحت کی گئی ہے۔ تحریک کے نزدیک اس موضوع کی بڑی اہمیت ہے اور اسی اہمیت کی وجہ سے اس بارے میں بے شمار تحریر موجود ہے۔

(1) دونوں تحریکوں میں اس بات پر اتفاق ہے کہ روح کا روایتی تصور قرآن کریم کے خلاف ہے یہ تصور روایات کا دیا ہوا ہے۔اور اس تصور پر جس قدر عقائد متفرع ہوئے ہیں وہ سب غلط ہیں۔ جس جگہ روحانی اقدار تحریر کیا جاتا ہے، آپ اس کو قرآنی اقدار پڑھیں۔

(2) دونوں تحریکوں کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآنِ کریم نے روح کا لفظ، مزعومہ روح، SOUL یا SPIRIT، کے لئے استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ قرآنِ کریم نے اس کو وحی کے

معنی میں استعمال کیا ہے۔روح کا لفظ قرآنِ کریم میں بیس 20 مقامات پر آیا ہے، لیکن کسی جگہ بھی یہ روح کے معنی میں نہیں آیا، جو ہمارے پیش نظر ہے۔ یہ سب جگہ وحی، وحی لانے والا، یا وحی پانے والا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

(3) دونوں تحریکوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ سے مراد وہ انسانی صلاحیت ہے جس سے انسان غور و فکر تدبر و تعقل کرتا ہے۔ یہ صلاحیت صرف انسان کو دی گئی ہے۔

(4) دونوں تحریکوں کا اس بات میں اختلاف ہے کہ روح یا شعور زندگی کے بعد ختم ہو جاتا ہے یا زندہ رہتا ہے۔ مولوی محمد عبداللہ مرحوم نے اپنی تفسیر میں بہت واضح طور پر تحریر کیا ہے کہ یہ شعور انسانی موت کے بعد مر جاتا ہے اور قیامت کے دن دوبارہ پیدا کیا جائے گا جبکہ طلوع اسلام کا موقف ہے کہ نفس انسانی جسم کی موت کے ساتھ نہیں مرتی بلکہ زندہ رہتی ہے۔ یہ موت کے بعد بھی مزید مراحل طے کرتی ہے۔ یہ دونوں تحریکیں روح کے روایتی مفہوم کی تردید کرتی ہیں۔ اور اس مفہوم کے تمام متفرعات کو غلط شمار کرتی ہیں۔ جو متفرعات روایات پر ہی قائم ہیں۔ خصوصاً انفرادی پرستش اور تصوف۔ تصوف مسلمانوں کے زوال کا باعث ہے اور اسلامی نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ تصوف سے متعلق اب تک جو بحثیں ہوتی رہی ہیں چونکہ وہ سب مذہب کے نقطہ نگاہ سے ہوتی تھیں، اس لئے تصوف کے درست اور غلط ہونے پر اختلاف ہوتا رہا ہے۔ جہاں تک دین کا تعلق ہے تو دین میں تو تصوف کے متعلق کسی بحث کا امکان ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تصوف تو دین کا عین نقیض ہے۔ دین میں اجتماعی اطاعت ہوتی ہے، اور یہ اطاعت صرف نظام کے ذریعے ہوتی ہے۔ جبکہ تصوف کی تو بنیاد ہی پرستش پر ہے جو انفرادی ہوتی ہے، اس میں نظام کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لئے جب تک روح کا روایتی تصور، انفرادی پرستش، اور تصوف ہم مسلمانوں میں باقی رہے گا، مسلمان کسی طرح بھی اسلامی نظام قائم نہیں کر سکیں گے اور چونکہ مسلمانوں کے دنیاوی مقاصد، اتباع دین سے ہی حاصل ہوتے ہیں، اس لئے دنیاوی مقاصد و مفادات بھی حاصل نہیں کر سکیں گے، اور اسی قعر مذلت میں پڑے رہیں گے۔

oooooooooooooooooooooooooooo

اسلام اور جمہوریت

==================

تقریباً ایک سو سال سے ہمارے یہاں یہ بحث چلی آرہی ہے کہ اسلام میں جمہوریت ہے یا نہیں، پہلے یہ بحث عموماً علمی کتابوں تک محدود تھی۔ اب چونکہ میڈیا عام ہوگیا ہے۔اس لئے اس قسم کی گفتگو پریس اور TV چینلو پر بھی ہونے لگی ہے اگر چہ واضح اور دوٹوک بات ان دونوں ذرائع پر بھی سامنے نہیں آئی۔ تاہم دانشورو مفکرین اور ہمارے علماء کرام اس بارے میں اپنی اپنی رائے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ موضوع صرف پاکستان کے علماء و مفکرین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے علمی حضرات بھی اس بحث میں حصّہ لے رہے ہیں۔

اس مسئلہ کے بارے میں کہ اسلام میں جمہوریت ہے یا نہیں مختلف آراء اس لئے بھی ہیں کہ سب مفکرین کے سامنے نہ تو ایک اسلام ہے اور نہ ہی جمہوریت کی واضح تعریف ہے۔ خصوصاً چونکہ اسلام کی مختلف تعبیرات پیش کی جاتی ہیں،اس لئے اس مسئلہ کا جواب بھی مختلف سامنے آتا ہے۔ اسلام کی مختلف تعبیرات کی وجہ سے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔

قرآن کریم نے اسلام کو بطور ایک دین کے پیش کیا تھا لیکن ہم مسلمانوں نے اس کو مذہب میں تبدیل کردیا۔ مذہب ہمیشہ قوموں کے زوال کا باعث ہوتا ہے۔ ہم مسلمانوں کے زوال کا باعث بھی مذہب ہے۔دین میں کوئی مصالحت نہیں ہوتی۔ وہاں پورے کے پورے نظام میں داخل ہونا ہوتا ہے **ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً** (2/208) مذہب میں اس کے خلاف ہوتا ہے۔مذہب کے پیروؤں میں چونکہ احساس کمتری

ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر مقبول عام نظریہ کے لئے دعویٰ کر دیتے ہیں کہ ہمارے مذہب میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اپنے زوال کے بعد سے ہم نے بھی ہر مقبول عام اصول کو اسلام میں شامل کر لیا ہے۔

سترہویں صدی عیسوی سے انگلستان میں جمہوریت کا فروغ شروع ہوا تھا یہ وہ دور تھا جب 1603ء میں ملکہ الزبتھ فوت ہو چکی تھی اور TUDOR (ٹیوڈر) خاندان ختم ہو کر، STUARTS، برسر اقتدار آئے تھے۔ اس خاندان کے سارے دور میں وہاں جمہوریت کے حصول کی کشمکش جاری رہی تھی۔ اسی دوران وہاں CIVIL WAR بھی ہوئی، اور چارلس (CHARLES) کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن وہاں جمہوریت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ یہ بات خوب اچھی طرح ذہن نشین فرما لیں کہ یورپ کا نظام اور وہاں کا کلچر جمہوری نہیں ہے وہاں کا کلچر CAPITALISTIC ہے۔ یورپ کا صرف اندازِ حکومت جمہوری ہے۔ چونکہ ہندوستان ہمارا پڑوسی ملک ہے اور ہم وہاں کے حالات سے زیادہ واقف ہیں، اس لئے اس مثال کو آپ ہندوستان کے تناظر میں زیادہ آسانی سے سمجھ سکیں گے۔ ہندوستان کا کلچر خالص ذات پات پر منحصر ہے یعنی وہاں CAST SYSTEM جاری ہے، اور کاسٹ سسٹم کبھی بھی جمہوریت سے COMPATABLE نہیں ہو سکتا، دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن ہندوستان میں جمہوریت چل رہی ہے۔ لیکن وہاں کا نظام اور کلچر اب بھی ذات پات پر مبنی ہے۔ بالکل یہی صورت یورپ میں سمجھ لیں۔ اس مختصر سی تمہید کے بعد اب اصل مسئلہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

جمہوریت کی اساس و بنیاد اس بات پر ہوتی ہے کہ قانون سازی میں عقل انسانی بالکل آزاد ہوتی ہے۔ جس طرف اکیاون 51 ووٹ ہو جائیں، وہ بات حق ہو جاتی ہے۔ اگر کسی مسئلہ پر باون 52 فیصد آراء اتفاق کر لیں تو وہ مسئلہ درست قرار دے دیا جائے گا، لیکن اگر کچھ عرصہ کے بعد، ان باون فیصد ووٹ سے، چار ووٹ الگ ہو جائیں، اور یہ چار ووٹ اقلیت کا ساتھ دے دیں، تو اب ان چار ووٹوں کی وجہ سے، ان کی بات حق ہو جائے گی۔ کسی مسئلہ کی اپنی ذاتی حیثیت INTRINSIC VALUE نہیں ہوتی۔ حق و باطل کا کوئی

خارجی معیار ہی نہیں ہوتا۔حق و باطل کا معیار صرف ووٹ کی گنتی ہوتی ہے اور بس۔یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں ہم جنسی جیسی قبیح رسم کی اجازت ہے۔کیونکہ وہاں کی اکثریت اس کی حامی ہوگئی تھی۔دوسری سب سے بڑی قباحت جمہوریت میں یہ ہے کہ اس میں عالم و جاہل ،عقلمند و ابلہ،سب ایک معیار پر رکھے جاتے ہیں۔اس میں انسانوں کو گنتے ہیں۔ان کی اہمیت پیش نظر نہیں رکھی جاتی،علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو

کہ از مغز دو صد خر، فکر انسانی نمی آید

قرآن کریم کے عطا کردہ نظام کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس میں قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہوتا ہے اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (12/40)حکومت کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔انسان کی حکومت انسان پر قطعاً حرام ہے۔کسی انسان یا انسانوں کی اکثریت کو قانون سازی کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔جب قرآن کریم نے زنا کو حرام قرار دے دیا تو سو فیصد ووٹ بھی اس کو حلال قرار نہیں دے سکتے۔اسلامی حکومت ایک ایسی ایجنسی ہوتی ہے جو قرآن کریم کے قوانین کا اجراء کرتی ہے۔قوانین جاری کرنے والے پہلے خود ان قوانین کی اطاعت کرتی ہیں اور اس کے بعد وہ دوسروں سے اس کی اطاعت کرواتے ہیں۔اس حکومت کا سربراہ سب سے زیادہ ان قوانین کا پابند ہوتا ہے (6/163)اُسے کسی قسم کی استثنیٰ یا PRIVILEGE حاصل نہیں ہوتی۔

اسلامی حکومت کی جو مستقل اقدار ہوتی ہیں،ان اقدار کے اندر اندر مشورہ کرنے کا حق ہوتا ہے(42/38)خود حضور کو بھی حکم تھا کہ وہ انتظامی امور میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کریں(3/159)قرآن کریم کی مستقل اقدار کے اندر اندر پوری جمہوریت رائج ہوتی ہے۔قرآن کریم کی مستقل قدر ہے لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17/70)ہم نے بنی آدم کی تکریم کی،اس مستقل قدر کے خلاف کوئی قانون نہیں بن سکتا۔لیکن کسی حکومت میں انسان کی تکریم کے کیا کیا ذرائع ہو سکتے ہیں،اس بارے میں پورا پورا مشورہ کیا جائے گا ۔قرآن کریم نے مشورہ کا تو حکم دیا لیکن کسی حکومت میں مشورہ کرنے کے طریقہ کی کوئی

نشاندہی نہیں کی۔ حالات کے بدلنے سے مشورے کے طریقے بدلتے رہیں گے اور ان طریقوں کا بدلنا جمہوری رائے سے ہوگا۔ خلافتِ راشدہ میں چاروں خلفاء مشورہ سے منتخب کئے گئے تھے، لیکن ان کی مشاورت کے طریقے مختلف ہوتے رہے۔ قرآن کریم کی مستقل قدر ہے وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59/9) مومن اپنے پر ایثار کرتے ہیں خواہ انہیں تنگی ہی کیوں نہ ہو، ایثار کرنے کے طریقوں پر مشورہ ہوگا۔ حضرت عمرؓ کے دور میں جب عراق فتح ہوا تو بہت بڑا وسیع رقبہ زمین کا مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ اس وقت فوجی مجاہدوں کی اکثریت کی رائے یہ تھی کہ زمین کے رقبہ جات ان میں تقسیم کر دیئے جائیں۔ کئی دن تک اس مسئلہ پر مشورہ ہوتا رہا۔ اکثر صحابہ کی رائے تقسیم کے حق میں تھی۔ حضرت عمرؓ برابر اس بارے میں غور و فکر کرتے رہے۔ ان کے سامنے سورہ حشر کی آیہ کریمہ آئی جس میں انصار و مہاجرین کے حق کے علاوہ ارشاد تھا وَالَّذِينَ جَاءُوا مِن بَعْدِهِمْ (59/10) (ترجمہ) اور وہ لوگ جو ان کے بعد آئیں۔ اس آیت کے سامنے آنے کے بعد حضرت عمر نے فرمایا کہ چونکہ اس میں بعد والوں کا بھی حق ہے اس لئے اس کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ آیہ کریمہ کے سامنے آنے کی وجہ سے حضرت عمر کی رائے سے صحابہ نے بھی اتفاق فرمایا اور زمین تقسیم نہیں کی گئی۔

ایک صورت یہ بھی ہے کہ قرآن کریم چونکہ ابدی ضابطہ حیات ہے۔ اس لئے اس میں اصول دے دیئے گئے ہیں، اور جزئیات کا تعین حکومت وقت کرتی ہے۔ قرآن کریم نے زکوٰۃ کا حکم کئی مرتبہ دیا ہے۔ لیکن اس کی شرح خود نہیں بتائی۔ یہ بات نہیں ہے کہ قرآن کریم اس کی شرح بتانا بھول گیا ہے۔ بلکہ عمداً اس کی شرح اس وجہ سے نہیں بتائی گئی کہ حالات کے مطابق اس کی شرح میں کمی بیشی کی جا سکے۔ یہ کمی بیشی لوگوں کی آراء کے مطابق ہوگی۔ جزئیات کے مقرر کئے جانے میں بالکل جمہوریت ہوگی۔ قرآن کریم نے مسافر کو روزہ میں رخصت دی ہے، لیکن قرآن کریم نے سفر یا مسافر کو DEFINE نہیں کیا۔ مسافر کی تعریف حکومت مشورہ سے کرے گی۔ انسانوں کو قانون سازی کا اختیار نہ ہونے کے علاوہ اسلامی نظام کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں نہ تو فرقہ

بندی ہوسکتی ہے اور نہ ہی مختلف سیاسی جماعتیں بن سکتی ہیں۔ اسلام میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ جس طرح دین میں فرقہ بندی شرک ہے، اسی طرح دنیا میں بھی پارٹی سسٹم کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے۔ اسلام کا جمہوری مشاورتی نظام PARTY LESS ہوتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔ نمائندگی کا طریقہ علاقہ وار قرار دیا جاسکتا ہے، یا نمائندگی کا طریقہ معاشی طبقات کی بنیاد پر کردیا جائے۔ قرآن کریم نے جمہوری مشاورت کا کوئی طریقہ خود مقرر نہیں فرمایا، لیکن مشاورت قرآن کریم کی ایک مستقل قدر ہے، اور یہی اسلامی جمہوریت ہے نہ اس سے زیادہ نہ اس سے کم۔

=======☆☆☆=======

انتباہ

مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے، اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے تحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی، عادی اور نافرمان ہیں، خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں۔ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے۔ اور غیر اسلامی نظام میں جس قدر رزق حاصل ہوتا ہے وہ

قطعاً حرام ہے۔ اس رزق کا ایک ایک لقمہ حرام ہے۔

اسلامی سزائیں

$$

اگر چہ مسلم لیگ نے بڑی جد و جہد کے بعد پاکستان تو حاصل کر لیا، لیکن مسلم لیگ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے قیام سے پیشتر پاکستان کے آئین کے متعلق کوئی SPADE WORK کرتی۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ اگر چہ پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، لیکن اس کے باوجود ہماری پیشوائیت کا بڑا حصہ، اس کے قیام کے خلاف تھا، اور اب بھی خلاف ہے، جمعیت العلماء ہند، ہماری پیشوائیت کی نمائندہ جماعت تھی، وہ پاکستان کے قیام کے خلاف تھی پاکستان بننے کے بعد چونکہ قائداعظم کا جلد انتقال ہو گیا تھا، اس لئے پھر کوئی واضح تصور اسلامی حکومت کا سامنے نہیں آیا۔ ابتداء ہی سے ہمارا لبرل طبقہ اسلامی حکومت کے قیام کے خلاف چلا آ رہا ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام، جنہوں نے قیام پاکستان کی ڈٹ کے مخالفت کی تھی، انہوں نے یہاں آ کر، اسلامی حکومت کا نعرہ بلند کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اسلامی حکومت کے لئے صرف LIP SERVICE ہی کرتے ہیں۔ ان کے سارے نظریات، اور سارے اعمال اسلامی حکومت کے قیام میں رکاوٹ ہیں۔ نظریاتی طور پر وہ اسلامی حکومت کے قائل ہو ہی نہیں سکتے۔ اس موضوع پر صوت الحق میں بہت کچھ تحریر کیا جا چکا ہے۔ تجدید یادداشت کے لئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے علماء تصوف میں ڈوبے ہوئے ہیں اور ذاتی نجات کے قائل ہیں اور اسی وجہ سے انفرادی پرستش کے قائل ہیں۔ اسلامی حکومت میں انفرادی پرستش کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی۔ اس میں اجتماعی اطاعت ہوتی ہے، انفرادی پرستش نہیں ہوتی۔ اس فکری بحران CONFUSION کی وجہ سے ہمارے عوام بھی

بحران کے شکار ہیں۔ چونکہ ان کے سامنے اسلامی حکومت کے ثمرات ونتائج نہیں ہیں، اس لئے وہ بھی اس کے قیام کے زیادہ حامی ومددگار نہیں ہیں ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ہمارے عوام اور لبرل طبقہ کو یہ بات دلنشین کرائی جاتی کہ دین کے اتباع سے خودبخود دنیاوی مقاصد حاصل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ہم نے قیام پاکستان سے پیشتر دوقومی نظریہ پر عمل کیا۔ دوقومی نظریہ پر عمل کرنا دین کا اتباع تھا۔ صرف اس ایک نظریہ کے اتباع سے ہم نے پاکستان حاصل کرلیا۔ اگر ہم اس بارے میں دین کا اتباع نہ کرتے اور متحدہ قومیت پر عمل کرتے جو دین کے خلاف تھا تو ہم پاکستان جیسی نعمت سے محروم رہتے۔ قرآن کریم کا وعدہ ہے کہ دین کے اتباع کی وجہ سے کوئی متنفس بھوکا نہیں رہ سکتا۔ (11/6، 6/151، 17/31) دین کے اتباع سے اس دنیا میں ایسا معاشرہ قائم ہوتا ہے جس میں کسی قسم کا خوف وحزن نہیں رہتا (2/38) دین کے اتباع سے نہ صرف اس دنیا میں اقتدار حاصل ہوتا ہے بلکہ صرف مسلمانوں کے پاس ہی اقتدار رہ جاتا ہے، دوسری اقوام اس کے مقابلہ میں نہیں آسکتی (63/8) کیونکہ اس آیت میں لام حصر کے لئے آیا ہے کہ اقتدار غلبہ صرف اور صرف مسلمانوں کے پاس رہے گا۔ چونکہ ہم نے دین کا اتباع نہیں کیا، تو اس کے ثمرات ونتائج بھی ہمارے سامنے نہیں آئے، اس سے ہمارا لبرل طبقہ متاثر ہوتا، اس کے برخلاف ہمارے مذہبی طبقہ نے تشدد اور انتہا پسندی اختیار کرلی، اس کی بناء پر ہمارے عوام اور جدت پسند حضرات اسلام سے اور برگشتہ ہوگئے۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا ایک ویڈیو (VIDEO) دکھلایا گیا تھا جس میں ایک لڑکی کو کوڑے مارے جارہے تھے۔ اس کے دیکھنے سے ہمارے عوام میں اضطراب ہوا اور یہ ایک عام اعتراض پیدا ہوا کہ اسلام میں کوڑے کی سزائیں بہت ہوتی ہیں جو مہذب معاشرہ کے خلاف ہیں۔

اسلامی سزاؤں کے بارے میں عرض ہے کہ اسلامی قانون میں سزاؤں کے دو نام تجویز کئے گئے ہیں۔ وہ سزائیں جو قرآن کریم نے مقرر فرمادی ہیں وہ حدود کہلاتی ہیں اور وہ سزائیں جو اسلامی حکومت، حالات کے مطابق، وقتاً فوقتاً خود تجویز کرتی رہتی ہیں وہ تعزیرات کہلاتی ہیں۔ قرآن کریم نے صرف زنا قذف بغاوت اور چوری کی سزائیں مقرر فرمائی

ہیں جو حدود کہلاتی ہیں ۔قرآن کریم نے جو احکام دیئے ہیں ان کا اطلاق ہر شخص پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ وغیرہ ہر شخص پر ایک جیسے نافذ ہوتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ آزاد آدمی پانچ وقت نماز پڑھے اور غلام تین وقت کی ۔لیکن قرآن کریم نے جرائم کی سزاؤں میں رخصت دی ہے اس میں اگر آزاد کو سو کوڑے مارنے کا حکم ہے، تو غلام کو پچاس کوڑے لگیں گے۔

البتہ یہ بات بڑی غور طلب ہے کہ ہمارے اس دور کے بعض اہل قرآن اور روشن خیال فقہا کا یہ خیال ہے کہ قرآن کریم نے جو سزائیں مقرر فرمائیں ہیں وہ انتہائی سزائیں MAXIMUM ہیں ۔ کیونکہ جرائم کی نوعیت اپنے خصوصی حالات میں ہمیشہ ایک جیسی رہتیں۔ مثلاً ایک شخص محض دشمنی کی وجہ سے قتل کر دیتا ہے۔ دوسرا شخص صرف غلط فہمی کی وجہ سے قتل کر دیتا ہے بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ ساری بات ہی وہم پر موقوف تھی ۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ حالات آدمی کو قابو سے باہر کر دیتی ہے اگر کوئی شخص اپنی نگاہ سے، اپنی بہن یا بیوی یا بیٹی کو رنگے ہاتھوں خود موقع پر دیکھ لے تو وہ یقیناً بھڑک اُٹھے گا ۔ اس میں جرم کی نوعیت بالکل الگ ہوگئی ۔ جرم کے حالات کی نوعیت اور اس کی PROVOKATION کے پیش نظر فقہا کا خیال ہے کہ جرم کی سزائیں فرق ہوسکتا ہے، ان کے نزدیک قرآن کی مقرر کردہ سزائیں انتہائی سزائیں ہیں۔

چوری کی سزا کے متعلق خود قرآن ارشاد فرماتا ہے **جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ** (5/38) یعنی یہ سزا ایک تو ان کے جرم کا بدلہ ہے۔ نیز یہ سامان عبرت بھی ہے **نکالًا من اللہ** ہمارے اہل قرآن فقہا کا یہ خیال ہے کہ وہ سزا جس سے دوسروں کو عبرت دلائی جائے وہ انتہائی سزا ہوتی ہے، اور اسی نکال کے لفظ پر وہ اپنی دلیل کی بنیاد رکھتے ہیں۔ نیز سزا کا اندازہ جرم کے مطابق ہوتا ہے، نہ کم نہ زیادہ **بمـا کسبا**۔ کیونکہ ایک ہزار روپے کی چوری کی سزا اور ہوگی اور ایک لاکھ روپے کی چوری کرنے کی سزا دوسری ہوگی۔ قرآن کریم اصحاب سبت کے واقعہ کے متعلق ارشاد فرماتا ہے۔ **فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَ** (2/66) پس ہم نے اس واقعہ کو ان لوگوں کے واسطے جن کے

سامنے ہوا تھا اور جو اس کے بعد آنے والے ہیں عبرت بنادیا یہ ظاہر ہے کہ اصحاب سبت کو سبت کی پہلی بے حرمتی کی یہ سزا نہیں دی گئی تھی وہ اس کے عادی ہو چکے تھے۔ جب ان کی اصلاح کی امید باقی نہیں رہی تب اللہ نے انہیں یہ سزا دی جسے قرآن کریم نے نکال (عبرت) سے تعبیر کیا۔

دوسری دلیل فقہاء اہل قرآن یہ دیتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو مسلسل تبلیغ کی۔ اس کو خدا سے ڈرایا مگر وہ حضرت موسیٰ کو مسلسل جھٹلاتا رہا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ٥ فَحَشَرَ فَنَادٰى ٥ فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ٥ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى (79-22.23.24.25) پھر وہ پیٹھ پھیر کر چل دیا (اور موسیٰ کو شکست دینے کی ناکام کوشش کرتا رہا) چنانچہ اس نے جادوگروں کو جمع کیا اور پھر یہ اعلان کیا کہ میں تمہارا پروردگار ہوں، آخر خدا نے اس کو پکڑ لیا، اگلی پچھلی خطاؤں کی عبرتناک سزا کے لئے۔ فرعون نے حضرت موسیٰ کو مدت تک جھٹلایا۔ جس کی تفصیل قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔ آخر اسے دریا میں بمعہ فوج کے غرق کر دیا۔ اس آخری اور شدید ترین سزا کو قرآن کریم نے ''نکال'' کہا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ نکال وہ آخری سزا ہوتی ہے جب مجرم عادی ہو اور وہ حد سے گذر جائے۔ یہ مقررہ حدود آخری اور انتہائی سزائیں ہوتی ہیں۔

البتہ یہ بات بالکل درست ہے کہ قرآن کریم نے بدنی CORPOPXAL PUNISHMENTS مقرر فرمائی ہیں۔ اس میں یہ حکمت ہے کہ ایک تو بدنی سزاؤں سے صرف مجرم ہی متاثر ہوتا ہے، اس میں اس کے کنبے، خاندان کے لوگوں کو کوئی تعلق نہیں ہوتا جس کے برخلاف اگر مجرم کو قید خانہ بھیج دیا جائے تو اسے تو روٹی کپڑا ملتا رہے گا مگر اس کے کنبے والے، اس کے بیوی بچے بھوکے مر جائیں گے۔ یعنی جرم ایک شخص کرتا ہے اور سزا دوسرے لوگ بھگتتے ہیں۔ یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ بدنی سزائیں بہت موثر ہوتی ہیں۔ جیل میں قید ہونے کی سزا بالکل بھی موثر نہیں ہوتی اور اس بات کے گواہ ہم پاکستانیوں سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے۔ ہمارے بڑے بڑے لیڈر اور سیاستدان اکثر جیل برڈ رہے ہیں۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات بھی نہیں ہے۔ اس بات کا اعتراف خود

سیاستدانوں کو بھی ہے۔لیکن جیل کی سزائیں انہیں جرائم سے نہیں روک سکیں۔کیونکہ انہیں جیل میں ہر طرح کی آسائش میسر ہوتی ہے۔ان میں سے کسی ایک کو بھی ،ایک مرتبہ بدنی سزامل جاتی،توسب ٹھیک ہوجاتے۔البتہ ضرورت ہوتو قیدخانے بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ قید کی سزادینا کوئی غیر اسلامی سزا نہیں ہے۔ضرورت کے پیش نظر یہ سزادی جاسکتی ہے اور تعزیرات میں تواب یہی سزائیں دی جائیں گی۔

تیسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی مقرر کردہ سزائیں صرف اسلامی حکومت میں دی جاسکتی ہیں۔یہ نہیں ہوسکتا کہ صدر صاحب اگر بل پر دستخط فرمادیں تو شریعت نافذ ہوجائے گی اور سزائیں ملنی شروع ہوجائیں گی۔قرآن کریم کے مطابق ہر مسلمان پر اسلامی حکومت قائم کرنا فرض ہوتا ہے۔جب وہ حکومت قائم ہوجائے، عوام اس حکومت کے نتائج وثمرات سے مستفید ہوجائیں اس کے بعد سزاؤں کا دور آتا ہے ۔جس ملک میں غربت وافلاس عام ہو،اس میں چور کے ہاتھ نہیں کاٹے جاسکتے نیز قرآن کریم میں ارشاد ہے۔**اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** (22/41) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار دے دیں تو یہ لوگ صلوٰۃ قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے ،اور اچھے کاموں کا حکم کریں گے،اور بری باتوں سے روکیں گے۔اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کو اقتدار مل جائے تو وہ صلوٰۃ کا نظام یعنی قرآنی حکومت قائم کریں گے ،سب شہریوں کی نشوونما کا انتظام کریں گے ،اس کے بعد وہ معروف یعنی اسلامی حکومت کے احکامات کو جاری کریں گے،اور حکومت نے جس کام کو منع کیا،اس سے روکیں گے۔ قرآن کریم نے نھوا عن المنکر کو چوتھے درجہ میں رکھا ہے۔جب اقامت صلوٰۃ،یعنی اسلامی نظام قائم نہیں ہوجاتا، نھوا عن المنکر ہو ہی نہیں سکتا۔پھر ارشاد ہوتا ہے **وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْكَرِ وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** (29/45) نظام صلوٰۃ قائم کرو،کیونکہ صلوٰۃ کا نظام ہی فحشا اور منکر سے روک سکتا ہے ۔**وَ لَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ** اور قانون خداوندی ہی سب سے بڑا درجہ رکھتا ہے۔نیز ارشاد

ہوتا ہے۔ یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ عَنِ الْمُنْکَرِ (31/17) یہاں بھی نہو عن المنکر سے پیشتر اقامت صلوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن کریم کی ان آیات کریمات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے، کہ قرآن کی بدنی سزائیں، صرف قرآنی نظام میں ہی دی جا سکتی ہیں، اگر کوئی نظام انسانوں کا وضع کردہ، یا سوشلزم وکمیونزم جاری ہو، انہیں قرآنی سزائیں نہیں دی جا سکتیں۔ قرآنی سزائیں صرف ان مجرموں کو ملیں گے جو قرآنی نظام کے ثمرات وفوائد حاصل ہونے کے بعد بھی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اللہ کی طرف سے انسانیت کو علم دینے کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ کی ذات ایسی عالی مقام، ایسی باعظمت اور ایسے انوارِ تجلیات کا مظہر ہے کہ کوئی بشر اس سے رو در رو ہونے کی تاب نہیں لا سکتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت قرآن میں مذکور ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کی تو ان کو جواب ملا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے۔ میری تجلی کی تاب پہاڑ بھی نہیں لا سکتے تو تم اس کا تحمل کس طرح کر سکو گے۔" تدبر قرآن، جلد 7 صفحہ 191۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو جو بھی علم دیا وہ جبرئیل کی معرفت اپنے خاص منتخب بندوں کو دیا جو انبیاء و رُسل کہے جاتے ہیں اور ان انبیاء و رُسل کی معرفت اللہ تعالیٰ نے انسانیت سے کلام فرمایا ہے۔ یہ علم جو جبرئیل کی معرفت انبیاء کرام کو ملا یہ وحی کہلاتا ہے۔ یہ بات ذہن عالی میں محفوظ رکھیں کہ

(1) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانیت کو جو بھی علم ملا وہ صرف وحی کے ذریعے ملا وحی کے علاوہ کوئی اور ذریعہ اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنے کا نہیں تھا اور نہ ہے (72/26، 3/179، 4/163، 42/51)

(2) رسول اللہ کو پورا قرآن کریم جبرئیل کی معرفت ملا ہے۔

(3) کوئی شخص قیامت تک یہ ثابت نہیں کر سکتا کہ رسول اللہ کو اپنی ساری زندگی میں ایک بات بھی جبرئیل کے واسطے کے بغیر ملی ہو، جبرئیل کا واسطہ ہونا لازمی شرط ہے۔

(4) انبیاء کرام کے علاوہ کسی شخص پر بھی جبرئیل نہ نازل ہوسکتا ہے، اور نہ ہی کلام کرسکتا ہے اور چونکہ حضرت مریم نبی یا رسول نہیں تھیں اس لئے وہ اس بات کی ہی مستحق نہیں تھیں کہ جبرئیل ان سے بات کرے۔

قومیتوں کا تصور اور اسلام

جب اس کرۂ ارض پر انسانوں نے مل جل کے رہنا شروع کیا تو وہ ایک ہی گروہ اور ایک ہی معاشرہ تھا۔ جس میں کسی قسم کی تفریق نہیں تھی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انسانوں کے گروہوں میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوگئی۔ وَ مَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا (10/19) شروع میں نوع انسان ایک ہی امت تھی پھر ان میں اختلافات پیدا ہوئے۔ ان اختلافات کو دور کر کے پھر انسانوں کو ایک امت بنانے کے لئے انبیاء کرام کا سلسلہ شروع ہوا۔ انسانوں میں سب سے پہلی تفریق خاندانوں میں ہوئی۔ خاندانوں کے بعد اس نے قبائل کی صورت اختیار کی، اور اب ہمارے موجودہ دور میں اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی جس کی عملی شکل یہ ہے کہ اس کرۂ زمین پر لکیریں کھینچ دی گئیں اور اس طرح مختلف ممالک وجود میں آگئے۔ ایک ملک کی چار دیواری کے اندر بسنے والے لوگ ایک قوم کے افراد قرار پاگئے اور اس طرح انسانیت ملکوں کی حدود میں تقسیم ہوگئی، ایک اس تقسیم کے بعد ایک ملک دوسرے ملک کا دشمن ہونا شروع ہوگیا۔ اس تفریق نے انسانیت کو جو نقصان پہنچایا، اس کے لئے سابقہ دور میں Hundered Year War، اور اس زمانہ میں دو عظیم جنگیں اس کی گواہ ہیں۔ لیکن سلسلہ انبیاء کرام نے ابتداء سے ہی کہنا شروع کر دیا تھا کہ یہ معیار تفریق باطل ہے۔ اصل معیار تقسیم فکر و نظر یا ضابطہ حیات کی ہم آہنگی ہے۔ انسانوں میں سے وہ لوگ جو مستقل اقدار کے پابند ہوں، وہ ایک گروہ ہے، اور جو مستقل اقدار کے تصور کے قائل نہ ہوں وہ دوسرے گروہ ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ

كَافِرٌ وَّمِنكُمْ مُّؤْمِنٌ (64/2)، اللہ نے تم سب کو پیدا کیا پھر ایک گروہ نے مستقل اقدار سے انکار کیا، لیکن دوسرا گروہ مستقل اقدار پر ایمان لے آیا۔ اور اس طرح انسانیت دو گروہوں میں بٹ گئی۔ مستقل اقدار پر ایمان لانے والے گروہ کو اصطلاح میں مومن اور اس سے انکار کرنے والے گروہ کو کافر کہتے ہیں۔ انسانیت کی تقسیم کا بس یہی ایک معیار واصول ہے جس کے مطابق دنیا میں دو قومیں آباد ہیں۔

انبیائے کرام نے اس اصول کو صرف نظری طور پر ہی پیش نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس پر عمل کر کے بھی دکھایا ہے۔ اس اصول کے مطابق جب قوم بننا شروع ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا دوسری طرف تھا۔ کیونکہ وہ مستقل اقدار پر ایمان نہیں لایا تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم کے باپ نے مستقل اقدار یعنی وحی الٰہی پر ایمان لانے سے انکار کر دیا، تو حضرت ابراہیم نے نہ صرف اپنے باپ سے، بلکہ پوری قوم سے تعلق منقطع کر لیا۔ وَ اَعْتَزِلُكُمْ وَ مَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (19/48) میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو ان سب سے الگ ہوتا ہوں بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا (60/4) تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عداوت و نفرت پیدا ہو گئی ہے اسی طرح حضرت لوط سے کہا گیا کہ تیری بیوی بھی تیرے اپنوں میں سے نہیں ہے کیونکہ وہ ان کی جماعت میں شامل نہیں ہوئی تھیں (66/10) اسی معیار کے مطابق حضورؐ نے ایک عالمگیر برادری تشکیل کی تھی جب فرمایا اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (49/10) سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں، خواہ ان کا رنگ، نسل، زبان، وطن کوئی بھی ہو۔ اصول و معیار تو صرف ایک ہے۔ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ (14/36)، جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے، وہ کسی قبیلہ کا فرد، اور کسی وطن کا باشندہ ہو، وہ میرے اپنوں میں سے ہے، اور میرے اپنے جو دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے لئے غیر ہیں۔

حضورؐ نے اس اصول کے مطابق ایک قوم کی تشکیل کی جس میں حبش کا بلال، فارس کا سلمان، اور روم کا صہیب اپنی قوم کے افراد قرار پائے، اور اپنے علاقہ و خاندان

کے افراد، ابوجہل وابولہب غیر قوم کے افراد قرار پائے۔ قومیت کی تشکیل کا یہ عملی مظاہرہ بدر اور اُحد کے میدانوں میں کھل کے سامنے آگیا۔ جب حضرت ابوبکرؓ ایک طرف تھے اور ان کا بیٹا عبدالرحمٰن دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ اِدھر تھے اور ان کا باپ عتبہ اُدھر تھا۔ حضرت علی مسلمانوں کے ساتھ تھے، تو ان کے حقیقی بھائی عقیل کفار کے ساتھ۔ یہ وہ تقسیم انسانیت تھی جو وطن، نسل، زبان، رشتہ داری کے تمام روابط مراسم توڑ کر، خالص کفر وایمان کے اصول ومعیار پر قائم ہوئی تھی۔ یہ وہ جماعت تھی جس کے متعلق ارشاد ہوا تھا کہ یہ لوگ **بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ** (8/72)، ایک دوسرے کے دوست اس کے برخلاف کفار کے لئے ارشاد ہوا، **وَ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِيرٌ** (8/73) اور جو لوگ کافر ہیں وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور (یاد رکھو) اگر تم آپس میں ایک دوسرے کی مدد نہیں کرو گے تو روئے زمین پر فتنہ برپا ہو جائے گا، اور بڑا فساد ہوگا۔

اسلام میں قوم کا تصور یہی ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں، اور ان کی سوا دیگر ساری انسانیت ایک الگ قوم ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا ؎

کسے کو پنجہ زد ملک ونسب را — نداد ے دعوت دین بولہب را
اگر قوم از وطن بودے محمد — نداد ے دعوت دین بولہب را

نیز فرمایا۔

از رنگ وخون بالا تر است — قیمت یک اسودش صد احمر است
گر نسب را جزو ملت کردۂ — رخنہ در کارِ اخوت کردہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆

جو معاشرہ انفرادی مفاد خویش کے نظریہ پر قائم ہوگا وہ تباہ وبرباد ہو جائے گا اور جس نظام کی بنیادیں نوع انسان کے مفاد کلی پر ہوں گی وہی انسانیت کی ربوبیت کا ضامن اور انسانی ذات کی نشو ونما کا کفیل ہوگا۔

☆☆☆☆☆

طارق فتح صاحب کی کتاب کا تعارف

موقر رسالہ 'صوت الحق' چونکہ خالص قرآنی فکر کا داعی ہے، اس لئے یہ پاکستان میں خصوصاً اور ساری دنیا پر عموماً نگاہ رکھتا ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی بات قرآنی تعلیم کے خلاف تحریر کی جائے تو یہ اس کا نوٹس لے لیتا ہے اور اپنے معزز قارئین کرام کو بھی اس سے آگاہ کرتا رہتا ہے۔ گذشتہ سالوں میں کافی مضامین اس بارے میں اس رسالہ میں طبع ہو چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں زیر نظر مضمون تحریر کیا جا رہا ہے۔ مشہور انگریزی اخبار ''دی نیوز'' مورخہ 29 جون 2008 میں ایک مضمون طارق فتح صاحب کے متعلق طبع ہوا ہے۔ شروع میں ان کا نہایت مختصر تعارف ہے پھر ان کا ایک انٹرویو ہے جو نیوز ایجنسی نے اُن سے TORANTO میں لیا ہے۔ اس کے بعد ان کی کتاب پر تبصرہ ہے ان کی کتاب کا نام THE TRAGIC ILLUSION OF AN ISLAMIC STATE CHASING A MIRAGE ہے۔ یہ کتاب کینیڈا سے شائع ہوئی ہے اس کے پبلشر JOHN WILEY AND SONS ہیں۔ یہ کتاب 410 صفحات پر مشتمل ہے۔ زیر نظر موجودہ مضمون میں طارق فتح صاحب کے تعارف اور ان کے انٹرویو کے چند اقتباسات کا اردو ترجمہ پیش خدمت ہے۔ پھر ان کی کتاب پر جو تبصرہ زُبیر مسعود صاحب نے کیا ہے۔ اس کا آزاد ترجمہ پیش خدمت کیا جائے گا۔ کتاب غالباً ابھی پاکستان میں دستیاب نہیں ہے۔ لیکن تبصرہ خود اتنا جامع ہے کہ کتاب کے مجموعی فکر سے بخوبی آگاہی ہو جاتی ہے۔ اس کے مطالعہ کے بعد قارئین کرام کو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کریم کے متعلق اس دور میں مسلمانوں کے کیا

نظریات ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ اس کتاب کے نظریات و مشمولات کس درجہ قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ یہ بات قابل مدح وستائش کہ ان ممالک میں تقریر و تحریر پر کوئی قدغن و پابندی نہیں ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں پاکستان میں یہ آزادی بالکل مسلوب ہے۔ اور ایک ایک مضمون میں یہ بات پیش نظر رکھنی ہوتی ہے کہ کوئی بات تشدد پسند حضرات کے نزدیک قابل اعتراض نہ ہو۔ اور قرآنی مضامین میں تو اس کا اہتمام اور بھی ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں تو زیادہ تر نظریات قرآن کے خلاف ہی مروج ہیں اس لئے قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق کچھ تحریر کرنا، یہاں زیادہ قابل گرفت ہوتا ہے۔

بہرحال اب آپ طارق فتح صاحب کا مختصر سا تعارف اور ان کے انٹرویو کے چند اقتباسات، اور ان کی کتاب پر جو تبصرہ ''دی نیوز'' نے شائع کیا ہے، اُسے ملاحظہ فرمائیں اس تبصرہ پر قرآن کریم کا محاکمہ رسالہ 'صوت الحق' کی طرف سے پیش کیا جائے گا۔

''طارق فتح ایک سیکولر مسلمان ہیں۔ وہ ایک مصنف اور سیاسی کارکن ہیں۔ وہ اب کینیڈا میں مقیم ہیں۔ وہ پین اسلام ازم کے مخالف ہیں۔ چونکہ مسلمانوں سے متعلق اُن کے نظریات نہایت انقلابی ہیں۔ اس لئے اُن کی سخت مخالفت ہوئی اور انہیں قتل کی دھمکیاں بھی دی گئیں۔ لیکن وہ ایک بہادر شخص ہیں۔ اور وہ جو کچھ سوچتے ہیں اس کو کہنے سے نہیں ڈرتے۔ وہ کراچی میں 1949ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین تقسیم ملک کے بعد ممبئی سے پاکستان آئے تھے۔ وہ بائیں بازو کی تحریکوں کے ممبر تھے۔ دو مرتبہ ان کو قید کی سزا بھی ہوئی۔ 1970ء سے انہوں نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور ''SUN'' میں ان کے مضامین طبع ہوئے۔ پھر وہ پاکستان ٹیلیویژن (PTV) سے منسلک رہے ضیاء الحق کے دور کے شروع میں وہ 1977ء میں سعودی عرب چلے گئے جہاں انہوں نے دس سال ایڈورٹائزنگ (ADVERTISINC) کا کام کیا۔ 1987ء میں وہ کینیڈا چلے گئے جہاں وہ کینیڈا کے اخبارات میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے مسلم کینیڈین کانفرنس (M.C.C.) کی بنیاد رکھی جو آزاد فکر مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جو مسلمانوں کی دوسری قدامت پسند تنظیموں کا توڑ کرتی ہے۔ اُنہوں نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جس میں اُنہوں نے لکھا ہے کہ انقلابی

سیاسی مسلمانوں نے قرآن وسُنت کے اصل اسلام کو اپنے سیاسی مصالح کی وجہ سے مسخ کردیا ہے۔ یہ کتاب تجویز کرتی ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی ریاست کا خیال چھوڑ دینا چاہئے اور اسلام کی رُوحانی کیفیت کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کتاب سے ایک مفید مباحثہ شروع ہوگیا ہے۔ طارق فتح مسلمانوں کو اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ وہ تشدد کو ترک کردیں کیونکہ تشدد اسلام کی امن وسلامتی کی اقدار کے خلاف ہے''۔ اب آپ انٹرویو کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں سوال (ازطرف نیوز ایجنسی) آپ نے مسلم کینڈین کانگریس (M.C.C) کیوں بنائی؟ جواب (ازطرف طارق فتح) 9/11 کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ اگر مسلمان اس انقلابی اسلام کے خلاف کھڑے نہیں ہوئے تو ہماری آئندہ کی نسلیں مغرب میں بہت نقصان اٹھائیں گی۔ کیونکہ مغرب والے انہیں تشدد پسند سمجھیں گے۔ (دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان قیادت سیاست اور مذہب کو آپس میں ملا کر ایک کررہی ہے۔ لہٰذا ہم اس کام کے لئے کھڑے ہوئے ہیں کہ سیاست کو مذہب سے الگ کردیں۔

سوال۔ سیکولر اسلام کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔

جواب۔ سیکولر اسلام کوئی چیز نہیں۔ البتہ سیکولر مسلمان ضرور ہوتے ہیں۔ جس کے بہترین نمائندے مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی تھے۔ یہ دونوں عالم باعمل تھے۔ انہوں نے اپنے عقیدہ اخلاقیات کو وسعت دی اور شریعت کے نفاذ کی کوئی کوشش نہیں کی۔ عبداللہ انعیم جو اٹلانٹا میں قانون کے پروفیسر ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت ہیں۔ ایسی دوسری شخصیت محمد محمود طہٰ کی ہے جو سوڈان مین اسلامی سکالر تھے۔ انہوں نے سوڈان میں شریعت کے نفاذ کی مخالفت کی تھی۔ سوڈان میں وہ (REPUBLICA BROTHERS) کے صدر تھے۔ سوڈانی حکومت نے، اخوان المسلمون سے ان کے متعلق فتویٰ طلب کیا اور اس فتویٰ کے مطابق حکومت نے اُنہیں موت کی سزا دے دی۔

سوال۔ آپ کے خیال میں ISLAMIST کی کیا تعریف ہے۔

جواب۔ اسلامسٹ وہ مسلمان ہے جو اسلام کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ پارلیمنٹ کو قانون سازی نہیں کرنی چاہئے۔ اس کے برخلاف

(اصلی اور صحیح) مسلمان وہ ہے جو اسلام کے پانچ ارکان پر ایمان رکھتا ہے۔ جن میں سے کوئی ایک رکن بھی اسلامی ریاست کا متقاضی نہیں ہے۔ اب آپ کتاب پر تبصرہ ملاحظہ فرمائیں

☆☆☆☆☆☆

''طارق فتح کا خیال ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں کبھی بھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی بلکہ یہ نام ہی ایک فریب ہے۔ تاریخی حقائق کو پیش کر کے وہ مسلمانوں کو باطل نظریات سے باہر نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) حاکم بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے وہ اس زمین پر اللہ کے نبی تھے۔ وہ تمام انسانیت کے لئے پیغمبر تھے جنہوں نے پوری انسانیت کے لئے ایک میزان چھوڑی کہ اس کے مطابق ایک متوازن معاشرہ قائم کیا جائے۔ خلافت راشدہ کا تجزیہ کرتے ہوئے، فتح کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر کی قائم کردہ خلافت اسلامی حکومت نہیں تھی بلکہ یہ پہلی عرب حکومت تھی۔ یہ خلافت پورے جزیرۃ العرب پر پھیلی ہوئی تھی اور عرب ہی اس پر فخر محسوس کرتے تھے۔ اس خلافت راشدہ نے تہذیب انسانی میں اسی طرح اضافہ کیا جس طرح دیگر اقوام اس میں اضافہ کرتی چلی آرہی ہیں۔ اس ریاست کا اصل تشخص عرب اور قریشی تھا اس ریاست میں عالم گیریت ومساوات کے اسلامی اصولوں کا درجہ تھا۔ اگر یہ اسلامی حکومت ہوتی تو اس میں سندھی اور بربر دوسرے درجے کے شہری نہ ہوتے کہ انہیں جبراً جزیہ دینا ہوتا تھا۔ حالانکہ جزیہ تو غیر مسلموں پر عائد کردہ ایک ٹیکس ہے۔

اسلامی ریاست کے مُغالطہ پر بحث کرتے ہوئے وہ اسلامی حکومت اور ''اسلامی کیفیت'' STATE OF ISLAM میں تمیز وتفریق کرتے ہیں۔ پہلی یعنی اسلامی حکومت تو صرف ایک ''وہم'' ہے جو سیاسی اسلام کی پیداوار ہے۔ جبکہ سیاسی اسلام سوسائٹی پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے برخلاف ''اسلامی کیفیت'' ایک فرد کی اپنی اخلاقی وروحانی مرضی ہوتی ہے جو اس فرد کی اپنی ذاتی زندگی کی راہ نمائی کرتی ہے۔

دوسری قسم کے اسلام پر فتح کو کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ اُن کے خیال میں اس اسلام کی اساس روحانی اقدار پر ہے اور یہ اسلام موجودہ جمہوریت کے مطابق بھی ہے اس

اسلام نے مسلمانوں کو شاعری، موسیقی، حساب اور سائنس سے مالا مال کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے اسلام کے متعلق ان کا خیال ہے کہ اس کا تعلق تشدد سے ہے۔ اور یہ عورتوں اور اقلیتوں کو زیر کرتا ہے۔ سیاسی اسلام مغربی آزادی پسند جمہورتوں کے مخالف ہے ۔ اور اس کے پیش نظر ایک موہوم طرف کا اقتدار ہے۔ طارق فتح اسلام کی تعریف کرتے ہیں کہ اسلام امن و آزادی کا مذہب ہے اور مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اسلامی حکومت قائم کرنے کے خواب کو ترک کردیں اس کے بجائے وہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ اپنے اندرون میں رُوحانی جذبہ کے ساتھ ''اسلامی کیفیت'' پیدا کریں اور روزانہ کی زندگی میں سیکولر زندگی اختیار کریں۔

طارق فتح پاکستان، ایران اور سعودی عرب کے موجودہ سیاسی اسلام کو بھی زیر بحث لاتے ہیں ۔ اور یہ بیان کرتے ہیں کہ کس طرح ان ممالک میں اسلامی نظریات کی ترویج کی گئی، کس طرح ان پر عمل کیا گیا اور ان کے کیا نتائج برآمد ہوئے۔ اُنہوں نے یہ بھی واضح کیا کہ کس طرح ناقابل اعتماد لیڈروں نے، اس وہم وخیال کو استعمال کرکے، لوگوں پر اقتدار حاصل کیا۔ اُنہوں نے مزید واضح کیا کہ کس طرح ان ممالک کی تھیوکریٹک (THEOCRATIC) ریاستوں میں عورتوں اور اقلیتوں سے بدسلوکی کی گئی، اور کس طرح یہ اپنے مخالفین سے سختی سے پیش آئے۔ طارق فتح جہاد، حجاب، شریعت، اسلامی بینکنگ، تشدد کو زیر بحث لائے ہیں اور مغرب پر اسلام کا غلبہ حاصل کرنے پر بھی بحث کی ہے۔ اس کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ یہ کتاب قابل مطالعہ ہے۔ مسلمانوں میں جو موضوعات زیر غور آرہے ہیں۔ وہ ان پر اپنا منفرد اور واضح نظریہ دیتے ہیں۔"

آپ نے طارق فتح صاحب کا تعارف، انٹرویو اور ان کی کتاب پر جامع تبصرہ ملاحظہ فرمایا۔ انہوں نے اپنی کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو بنیادی مسائل بیان کئے اور ان کا جواب بھی دیا ہے تو ضروری ہے کہ ان کے پیش نظر قرآن کریم ہونا چاہئے تھا۔ اور اس کی آیات کا حوالہ دینا بھی ضروری تھا۔ اصل کتاب کا تو اندازہ نہیں کیا جاسکتا لیکن تبصرہ میں کسی آیت کا حوالہ نہیں ہے۔ نہ ہی تبصرہ میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ فتح

صاحب نے کسی آیۃ کا حوالہ دیا ہے یا نہیں۔ ابتدائی زندگی میں وہ سوشلزم سے متاثر تھے لیکن اس کے بعد وہ مذہب کی طرف آئے ہیں اور انہوں نے جو کچھ اپنی کتاب میں تحریر کیا ہے وہ مذہب کی ہی ترجمانی کرتا ہے اور مذہبی نقطۂ نگاہ سے اُن کے پیش کردہ نظریات دُرست معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ دینی اعتبار سے ان کے نظریات محلِ نظر قابلِ انتقاد، اور خلافِ قرآن ہیں۔ صرف برسبیل تذکرہ یہ بات گوش گذار کی جاتی ہے کہ فتح صاحب بھی لبرل خیالات سے اسلام کی طرف راجع ہوئے ہیں اور بڑی کثیر تعداد میں آج کل غیر مسلم حضرات اسلام قبول کررہے ہیں۔ اخباری اطلاعات اور کمپیوٹرز کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں آج کل روزانہ پانچ سو آدمی مسلمان ہورہے ہیں۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ ان حضرات کے سامنے وہ کون سی کشش ہے جس سے یہ حضرات مسلمان ہورہے ہیں۔ قرآن کریم اور دین میں تو بے شک یہ قوت اور کشش ہے کہ وہ ہر ذہن اور سعید آدمی کو اپنی طرف کھینچ لے۔ لیکن ہماری موجودہ زبوں حالات اور ہمارے موجودہ نظریات، اور ڈیڑھ ہزار سال کی پرانی شریعت اس قابل نہیں کہ اس کو اختیار کیا جائے۔ مزید حیرت ہوتی ہے کہ ہم مسلمان جو قرآن وسنت پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود سمجھتے ہیں کہ سابقہ مدون کردہ شریعت، اس دور کا ساتھ نہیں دے سکتی لیکن اس کے برخلاف برطانیہ میں اس کے اجراء کی تجاویز ہورہی ہیں۔ وہاں کے مقامی انگریز جج صاحبان تو کافی عرصہ سے اس شریعت کی حمایت کررہے تھے۔ لیکن اب چندماہ سے وہاں کی سب سے بڑی مذہبی شخصیت ARCH BISHOP OF CANTEBERY WILLIAMS ROWAN، جو آرک بشپ آف کنٹری بری ہیں اور لارڈ PHILLIPS نے بھی اسلامی شریعت کے نفاذ کی حمایت کردی ہے۔ ان موجودہ واقعات سے آپ اندازہ فرمائیں کہ اگر قرآن کریم کے اپنے درست نظریات، اور ان نظریات کی اساس پر تشکیل کردہ نظام اگر کسی جگہ قائم ہوجائے تو دکھی انسانیت کے لئے کس درجہ امن کا گہوارہ ہوگا۔ طارق فتح صاحب کی کتاب میں مندرجہ ذیل نکات قابل غور ہیں۔

1۔ انہوں نے تشدد کی مذمت کی۔

2۔ اُنہوں نے اسلامی حکومت قیام کی تردید کی۔ اور اس لئے اُنہوں نے دو دلائل دیئے۔ (1) اسلامی تاریخ میں اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ (2) ارکان اسلام کی ادائیگی میں اسلامی حکومت کی ضرورت نہیں رہتی۔

3۔ حضورؐ حاکم بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔ وہ نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔

4۔ اسلامی حکومت قائم کرنے کے بجائے مسلمانوں کو اپنے اندر روحانی کیفیت پیدا کرنی چاہیئے۔

جہاں تک تشدد کی مذمت کا تعلق ہے، اس میں دو آراء نہیں ہوسکتیں۔ قرآن کریم نے تشدد کی سخت مذمت کی ہے۔ رسالہ 'صوت الحق' میں اس موضوع پر اتنا تحریر کیا جا چکا ہے کہ اس کو دوبارہ تحریر کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔

دوسری شق کے سلسلہ میں یہ عرض ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کی تردید میں انہوں نے جو دو دلائل پیش کیئے ہیں وہ بالکل درست ہیں۔ اور جس شخص کے سامنے بھی یہ دو نکات ہوں گے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا۔ اور ہماری T.V چینلو کے پروگراموں میں بھی آزاد خیال مفکرین یہی دو دلائل پیش کرتے ہیں۔ لیکن پھر اسی بات کا اعادہ کیا جاتا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے میں ان مفکرین کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس کا اصل سبب ہی یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلام مذہب کی حیثیت سے آیا ہے۔ دین کا تصور ان تک نہیں پہنچا۔ یہ بات تو اپنی جگہ بالکل درست ہے کہ مسلمانوں نے اسلامی حکومت کبھی قائم نہیں کی، لیکن یہ بات بھی اسی طرح قطعاً درست ہے کہ حضورؐ نے اپنے دور میں مدینہ میں اسلامی حکومت قائم کی تھی اور اس حکومت سے انسانیت ساز نتائج بھی برآمد ہوئے تھے۔ مسلمانوں کا خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر دینا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ قرآن کریم حکومت کا متقاضی نہیں ہے۔ اصل محک و میزان مسلمانوں کا عمل نہیں ہے بلکہ اصل میزان حضور کا اسوۂ حسنہ اور قرآن کریم ہے۔ جب قرآن اور اسوۂ حسنہ ریاست کا تقاضہ کرتے ہیں تو یقیناً ریاست قائم کرنا ضروری ہے۔ خواہ ساری تاریخ میں مسلمانوں نے اس پر عمل کیا یا نہیں۔ حجت مسلمانوں کا عمل نہیں ہے، حجت قرآن کریم ہے۔

جہاں تک ارکان اسلام کا تعلق ہے کہ یہ پانچوں ارکان ریاست کے متقاضی نہیں ہیں تو یہ بھی حدیث بے خبراں سے کم نہیں ہے۔اسلام کا ہر رُکن اسلامی حکومت کا داعی اور اس نظام کا ایک ستون ہے اور ان ارکان پر عمل کرنے کے نتائج اس نظام میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔نماز مذہب کا رکن ہے۔ دین کا رُکن نہیں ہے۔دین میں صلوٰۃ وزکوٰۃ سے مراد اسلامی حکومت اور اسلامی حکومت میں انسانیت کی پرورش کے ذرائع ہیں۔اس موضوع سے متعلق ایک مفصل مضمون اسی ماہ (جولائی 2008ء) کے پرچہ میں طبع ہوا ہے وہ ملاحظہ فرمائیں۔

اصل یہ ہے کہ دین کے اتباع کا لازمی نتیجہ دنیا میں اقتدار اور دنیاوی مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔دین کا اتباع کرنے کے بعد مسلمان مغلوب رہ ہی نہیں سکتا۔ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3/139) اگر تم دین کا اتباع کروگے تو تم ہی غالب رہو گے۔ نیز ملاحظہ ہوں (4/141، 44/55، 3/47، 58/21) مغلوب رہنا اور سیاست اور مذہب کو الگ الگ کرنا، مذہب کا تصور ہے۔ دین پر اتباع کے بعد جو غلبہ اقتدار اور حکومت حاصل ہوتی ہے۔اس میں لازماً دین کے احکامات کا ہی نفاذ ہو سکتا ہے۔اس حکومت کو نہ تو دین کے احکامات سے الگ رکھ سکتے ہیں اور نہ ہی اس میں انسان اپنے وضع کردہ قوانین کا اجراء کر سکتے ہیں۔طارق فتح صاحب نے جو تجویز کیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ کر دیا جائے تو اس میں وہ منفرد نہیں ہیں۔اس قسم کی تجویز عموماً آزاد خیال مسلمان پیش کرتے رہتے ہیں اور اس پر عمل بھی ہو سکتا ہے۔مذہب اور سیاست الگ ہو سکتے ہیں۔ لیکن دین اور سیاست کو الگ الگ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ اقتدار اور حکومت تو حاصل ہی دین کے اتباع سے ہوتا ہے۔جہاں تک نبوت کا یہ تصور کہ حضورؐ اس دنیا میں حاکم بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔یہ بھی قرآن کے مطابق نہیں ہے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5/48) (اے نبی) لوگوں کے درمیان قانون خداوندی کے مطابق فیصلے کرو۔ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (38/26) لوگوں کے درمیان قرآن کے مطابق حکومت کرو نیز ارشاد ہوتا ہے (اے رسول) تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ

اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنالیں اور جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح تنگ دل بھی نہ ہوں (4/65)۔ اس موضوع پر متعدد آیات دی جا سکتی ہیں۔ لیکن اپنا مدعا ثابت کرنے کے لئے یہی آیات کافی ہیں اور ان پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔

ان کا آخری نکتہ جس پر انہیں اصرار ہے یہ ہے کہ اسلامی حکومت بنانے کے بجائے اپنے اندرون میں اسلامی کیفیت "STATE OF ISLAM" پیدا کی جائے۔ جس کی وضاحت انہوں نے خود کی کہ اپنی روحانیت میں اضافہ کرنا چاہیئے۔ اس مضمون میں اس نکتہ کی وضاحت اس غرض سے کی جاتی ہے کیونکہ ہمارے ہاں اکثر حضرات اسی نظریہ کے حامل ہیں۔ اور تصوف اور پیر پرستی کی ساری عمارت اسی نظریہ پر قائم ہے۔ اگر روح کا قرآنی تصور سامنے ہو اور روحانیت کا یہ خلافِ قرآن تصور پیش نگاہ نہ رہے تو تصوف پیر پرستی اور انفرادی پرستش کی ساری عمارت از خود زمین بوس ہو جاتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیں کیونکہ اس نکتہ کا تعلق صرف فتح صاحب کی تجویز سے ہی نہیں ہے بلکہ ہماری روزمرہ کی زندگی سے اس نکتہ کا گہرا تعلق ہے۔ ہمارے علماء کرام کا یہ نظریہ ہے کہ رحم مادر میں تین ماہ بعد مُردہ جنین میں روح ڈالی جاتی ہے جس سے اس مُردہ جنین میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے اور جب انسان مرتا ہے تو یہ روح اس کے جسم سے نکل کر عالم برزخ میں چلی جاتی ہے اور قیامت کے دن یہ سب ارواح پھر اپنے اپنے سابقہ اجسام میں داخل ہو جائیں گی۔ لیکن قرآن کریم اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔

اول تو یہ بات پیش نظر رہے کہ جنین مُردہ نہیں ہوتا وہ خود زندہ ہوتا ہے۔ اس کے زندہ کرنے کے لئے روح کے ادخال کی ضرورت نہیں ہے۔ جسم کا ہر ہر حصہ زندہ ہوتا ہے۔ خون کا ایک ایک قطرہ زندہ ہوتا ہے۔ بلکہ خون کے جراثیم تک زندہ ہوتے ہیں۔ زندہ مرد و عورت کے جسم سے نکلنے والا مادہ تولید بھی زندہ ہوتا ہے وہ مُردہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ یہ مادہ جو ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اس کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا

ثُمَّ اَنشَئنٰهُ خَلقًا آخَر (23/12-13) اور ہم نے آدمی کو گیلی مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو ایک محفوظ جگہ (رحم) میں نطفہ بنا کر رکھا پھر ہم نے نطفہ کو جما ہوا خون بنایا پھر ہم نے منجمد خون کو گوشت کا لوتھڑا بنلیا۔ پھر ہم نے لوتھڑے میں ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا۔ پھر ہم ہی نے اس کو ایک دوسری صورت میں پیدا کیا۔ اس آیہ کریمہ میں رحم مادر میں جنین کے ارتقاء کی چھ منزلیں بیان فرمائی گئی ہیں (1) نُطفہ سے علقہ (2) علقہ سے مُضغہ (3) پھر ہڈیاں بنیں (4) ہڈیوں پر گوشت چڑھا (5) اور آخر میں بچہ مکمل شکل میں تیار ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ نُطفہ یہ تمام مراحل ومنازل مردہ ہونے کی صورت میں طے نہیں کرسکتا۔ لیکن ان تمام مراحل میں ادخال روح کا کوئی ذکر دور دور تک کہیں نہیں ہوتا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کا عام نظریہ درست نہیں ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُکُمْ طِفْلًا (40/67) وہ خدا ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر نطفے سے پھر جمے ہوئے خون سے پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتا ہے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِیْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِیْعًا بَصِیْرًا (26/2) ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا کہ اُسے آزمائیں تو ہم نے اسے سنتا اور دیکھتا بنلیا۔ ان درج شدہ آیات اور مزید آیات کریمات 18/37، 22/5، 40/68، (اور اسی قبیل کی مزید آیات) سے ثابت ہوتا ہے کہ رحم مادر میں جنین جو ارتقائی مراحل طے کرتا ہے ان میں نہ تو روح داخل ہوتی ہے اور نہ ہی روح کوئی PART PLAY کرتی ہے۔ یہ مضمون چونکہ روح کے موضوع پر نہیں ہے صرف طارق فتح صاحب کے نظریہ پر تبصرہ کرنا مقصود ہے، اس لئے یہاں صرف اسی ایک نکتہ پر اکتفاء کیا جاتا ہے کہ جسم انسانی میں روح نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، اس لئے روحانیت کا مزعومہ تصور بالکل بے بنیاد ہے۔

واضح رہے کہ نزول قرآن کے وقت روح کے یہ معنی یعنی SOYL یا SPIRIT کے تھے ہی نہیں۔ یہ تو جب یونانی فلسفہ مسلمانوں میں متعارف ہوا تو اس فلسفہ میں روح کے یہ معنی مراد تھے۔ ہمارے ہاں تفاسیر اسی دور میں تحریر کی گئیں۔ ہمارے مفسرین نے بھی روح

کے وہی معنی لے لئے جو یونانی فلسفہ سے مُستعار لئے گئے تھے۔ ورنہ قرآن کریم نے روح کو وحی کے معنی میں استعمال کیا ہے (42/52، 17/85، 40/15) قرآن کریم میں روح بیس (20) مقامات پر آیا ہے اور سب جگہ خدائی تعلیم، یا وحی لانے والا یا وحی پانے والا کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس لئے جس جگہ روحانی اقدار تحریر کیا جاتا ہے۔ اس کا اصل مطلب ومقصود قرآنی اقدار ہوتا ہے۔ کتاب کے تبصرہ پر رسالہ صوت الحق' کی طرف سے پیش کردہ قرآنی محاکمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ طارق فتح صاحب کا ای میل کاونٹ تو کسی جگہ نہیں دیا گیا ہے البتہ تبصرہ نگار زبیر مسعود صاحب کا ای میل اکاونٹ دیا گیا ہے۔ وہ قارئین کی سہولت کے لئے دیا جاتا ہے اگر کوئی صاحب طارق فتح صاحب سے رابطہ کرنا چاہتے ہیں تو زبیر مسعود صاحب کی معرفت کرسکتے ہیں کیونکہ زبیر مسعود صاحب بھی امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔

☆☆☆

تسخیر

ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے مسخر کردیا گیا ہے۔ (45/12) قرآن کریم تسخیر کی خود ہی وضاحت فرماتا ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (14/32) اللہ وہ ہے جس نے تمہارے بس میں دریا کو کردیا کہ اس میں اللہ کے حکم کے مطابق جہاز چلیں۔ تسخیر کی محسوس شکل یہ ہے کہ بڑے بڑے وزنی جہاز سمندر کی چھاتی پر چلتے ہیں۔ پانی کا ظاہر یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو ڈبو دیتا ہے۔ لیکن اس کے اندر ہر چیز کو تیرانے کی قوت بھی موجود ہے۔ ہر وہ چیز جو اپنے حجم کے پانی سے ہلکی ہوتی ہے پانی اسے ڈبونے کے بجائے تیراتا ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے ملائکہ کے متعلق فرمایا ہے کہ ان کا ظاہر ان کے باطن سے الگ ہے۔ آج ہر شخص اپنی آنکھوں سے یہ مشاہدہ کرسکتا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر قوت بطریق تسخیر یعنی ہر چیز کے پوشیدہ جوہر کو کام میں لانے سے نوع انسانی کے تابع کردی گئی ہے۔ آب و ہوا، خاک آگ، مائع گیس میں پوشیدہ قوتیں نوع انسان تابع ہیں۔ اسی تسخیر کو قرآن کریم نے اپنی

اصطلاح میں ارشاد فرمایا و اذ قلنا للملٰئکۃ اسجدو لآدم فسجدو (21/34) اور جب ہم نے ملائکہ کو حکم دیا کہ تم نوع آدم کے فرمانبردار بن جاؤ تو وہ سب فرمانبردار ہو گئے۔

جمہوری نظام اور قرآنی نظام کے فاصلے

################################# ################################## ########################

انسانوں نے اپنے رہن سہن کے لئے جو معاشرے بنائے اور جو نظامہائے حیات تشکیل دیا وہ بھی عقل انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتے چلے گئے اور بہتر سے بہتر صورت اختیار کرتے چلے گئے مدت مدید اور عرصہ طویل کے تجربات کے بعد سیکولر نظامہائے حیات سامنے آئے۔ اس سیکولر نظام نے ڈیمو کریسی، کمیونزم، سوشلزم، فاشزم UTILITARI ANISAM، وغیرہ کی صورتیں اختیار کیں ان سب نظاموں میں قدر مشترک یہ ہے کہ انسان قانون سازی کے لئے بالکل آزاد ہے جس قسم کا قانون اپنے لئے بہتر سمجھتا ہے، وہ بنالے، اس پر خارج سے کوئی قدغن یا پابندی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بعض ممالک میں HOMOSEXUALITY جیسا شنیع فعل بھی جائز قرار پا گیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں کمیونزم، فاشزم، سوشلزم کے نظام تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ ان پر تبصرہ کرنا بے سود ہے ان کا انقراض ہی ان پر بہترین تبصرہ ہے۔ آج کل سارے مہذب ممالک میں جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ اور ہر طرف سے اس کی تعریف و تحسین ہے اور یورپ کو ہی اس کے وضع کرنے کا CREDIT دیا جاتا ہے۔ لیکن جو بات عموماً ہمارے سنجیدہ ترین دانشوروں سے مخفی ہے وہ یہ ہے کہ یورپ کا نظام جمہوری نہیں ہے فقط ان کے نظام کو چلانے کی مشینری جمہوری ہے۔ کیونکہ یورپ میں یہ نظام تو جمہوریت سے پہلے بھی تھا۔

جمہوریت کے نفاذ کے بعد بھی یورپ کا وہی نظام برقرار ہے یورپ کا نظام سرمایہ دارانہ اور جاگیردانہ ہے۔ البتہ حکومت کی مشینری جمہوری ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان کیونکہ ہمارے زیادہ قریب

ہے اور ہر وقت ہمارے مشاہدے میں ہے، اس لئے اس کی مثال ہمارے لئے زیادہ آسان ہے۔ ہندوستان میں تقریباً 60 سال سے جمہوریت نافذ ہے۔ لیکن ہندوستان کا نظام جمہوری نہیں ہے۔ وہاں کے نظام کا سارا دارومدار ذات پات کی تفریق، اور انسان کی انسان سے مغائرت وحقارت پر قائم ہے۔ اگر وہاں مزید سو سال بھی جمہوریت رہے گی تب بھی وہاں CASTE SYSTEM ختم نہیں ہوسکتا۔ ذات پات کی تقسیم اور جمہوریت ایک دوسرے کی نقیض ہیں۔ اور اگر جمہوریت ان کے نظام میں داخل ہوجائے تو ہندوازم بالکل ختم ہوجائے گا۔ یہ نہ یورپی نظام میں داخل ہے نہ ہندوستان کے۔ ان دونوں جگہ جمہوریت صرف حکومت کی مشینری تک محدود ہے۔ اگر کسی صاحب کو مزید وضاحت درکار ہو تو وہ جب خواہش کریں گے وضاحت پیش خدمت کردی جائے گی۔ لیکن یہ طے شدہ بات ہے کہ جمہوریت کے سامنے حقائق ابدی کا کوئی ضابطہ نہیں ہوتا۔ نہ تو حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے نہ باطل اپنی ذات میں باطل ہوتا ہے۔ جمہوریت میں حق وباطل لوگوں کے خیالات اور ان کی تعداد یا گنتی کے تابع ہوتا ہے۔ اس میں افراد کی اہمیت ہوتی ہے۔ آج اگر 52 افراد کسی بات کو غلط قرار دے دیں، اور کچھ عرصہ کے بعد ان میں سے چار افراد اس گروہ سے ٹوٹ کر مخالف گروہ میں شامل ہوکر، ان کو 48 کے بجائے 52 کردیں، تو پہلی بات غلط ہوجائے گی اور دوسری بات جواب 52 آدمی کہہ رہے ہیں وہ درست قرار پائے گی۔ حق وباطل کا مدار ان 4 افراد کی رائے کا تابع ہوگا۔ عملاً بھی اگر کسی ملک میں دو پارٹیوں نے 30% ووٹ حاصل کئے اور ایک پارٹی نے 40% ووٹ حاصل کرلئے تو 40% ووٹ حاصل کرنے والی پارٹی حکومت بنائے گی اور 60% فیصد ووٹرز کی رائے کو نظرانداز کردیا جائے گا۔

شروع سے ہی سیکولر حکومت کے برعکس تھیوکریسی کی حکومت رہی ہے اس حکومت میں بظاہر قانون خداوندی کو نافذ کیا جاتا ہے لیکن عملاً اس میں اختیار علماء کرام کو ہوتا ہے کیونکہ وہ اس قانون کو نافذ کرتے ہیں۔ یہ علماء کرام حالات کے تقاضوں کے مطابق قانون نہیں بناتے بلکہ سابقہ وضع شدہ قوانین کو ہی نافذ کرتے ہیں۔ اس لئے حکومت میں

ساری اجارہ داری علماء کی ہوتی ہے غیر علماء حضرات LAYMEN چونکہ ان قوانین کو نہ تو جانتے ہیں اور نہ ہی ان میں تبدیلی کر سکتے ہیں، اس لئے اس میں سارا HOLD مذہب کے نمائندوں کا ہوتا ہے۔ یہ مذہبی حکومت ہوتی ہے یہ واضح رہے کہ سیکولر حکومتوں میں بھی مذہب برقرار رہتا ہے۔ سیکولر حکومت میں بھی مذہبی حضرات پرسنل لا پر عمل کر سکتے ہیں اور اللہ کی اطاعت چندر سومات کے ذریعے کر لیتے ہیں۔ اب بھی یورپین ممالک امریکہ، کینیڈا، ہندوستان وغیرہ میں جہاں نظام سیکولر ہے مختلف مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہب پر عمل کرتے ہیں، ان میں مذہب ختم نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے ان دونوں نظاموں سے بالکل مختلف نظام پیش فرمایا ہے اس نظام میں حق اپنی ذات میں حق ہوتا ہے خواہ اس کی تائید میں ایک آواز بھی نہ اٹھے اس میں ملت اور مملکت الگ الگ چیزیں نہیں ہوتی ہیں۔ ملت ایک انتظامی مشینری متعین کرتی ہے جو خود ملت کا ایک جز و ہوتی ہے۔ ملت اپنے اختیارات اس انتظامی مشینری کو تفویض نہیں کرتی اختیارات ملت کے ہی ہوتے ہیں فقط ان کا استعمال اس مشینری کی وساطت سے ہوتا ہے۔ اسلام میں اصلاً اطاعت نظام کی ہے۔ کسی فرد واحد کی نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اس میں رسول کی اطاعت بھی نہیں ہوتی (3/79) حضورؐ نے اپنے دور میں اس نظام کو جاری فرمایا۔ اپنے دور کے حالات کے مطابق حضورؐ نے اس نظام کو چلانے کے لئے ایک مشینری تجویز فرمائی۔ اس میں مقامی حکام اولی الامر کہے جاتے تھے۔ اگر کسی تنازعہ میں یا کسی انتظامی امر میں مقامی لوگوں نے اولی الامر کی اطاعت کر لی تو سمجھئے کہ اس سے نظام کی اطاعت ہو گئی، اور اللہ ورسول کی اطاعت ہو گئی۔ حالانکہ اس اطاعت میں حضورؐ کی ذات ولا صفات بالکل ہی INVOLVE نہیں ہوئی۔ صرف نظام کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاغت ہو گئی۔ حضورؐ نے انتظامی طور پر اپنے دور میں جزئیات مقرر فرمائیں ان جزئیات کی اطاعت صرف حضورؐ کے دور تک ضروری تھی۔ البتہ نظام کی اطاعت ابدی وسرمدی ہے۔ جب تک اسلامی نظام جاری رہے گا۔ حضورؐ کی اطاعت قائم رہے گی۔ البتہ جو وقتی انتظامی امور آپ نے اختیار فرمائے ان کی اطاعت وقتی ہی تھی۔ ان امور کی اطاعت ہمیشہ کے

لئے نہیں تھی۔ بلکہ انتظامی امور حضورؐ کے جانشین کے طرف منتقل ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے جانشین جو آئیں گے وہ جو انتظامی امور سر انجام دیں گے۔ پھر ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہو جائے گی۔ حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے تمام انتظامی امور کی اطاعت اللہ تعالیٰ کی عبادت کا درجہ رکھتی تھی۔ اس نظام میں چونکہ انتظامی امور کے احکام نئے نئے جاری ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس میں سابقہ فقہ یا گذشتہ ادوار وضع کردہ قوانین کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ اس وجہ سے اس میں علماء کا طبقہ بھی نہیں رہتا۔ دینی حکومت میں پھر مذہب کا کوئی سوال ہی نہیں رہتا۔ مذہبی حکومتوں میں شریعت باہر سے IMPOSE ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی نظام میں شریعت اندر سے ہی خود بخود دینی چلتی جاتی ہے۔ اس لئے یہ اسلام کا دینی نظام ہے جو مذہب کے تصور سے بالکل مختلف ہے چونکہ دیگر اقوام میں صرف مذہب کا تصور ہے۔ دین کا تصور ان کے سامنے نہیں ہے، اس لئے ان کے ہاں دین کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے۔ وہ دین کا ترجمہ بھی RELIGION کر دیتے ہیں دین کا تصور خالص قرآنی تصور ہے۔ اس نظام خالص میں اطاعت اللہ کی ہوتی ہے اور صرف وحی الٰہی کے قوانین جاری ہوتے ہیں۔ اور اس کی اطاعت ہی عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ چونکہ اس نظام کے سربراہ کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور اس کی نافرمانی نہیں ہو سکتی، اس وجہ سے اس نظام میں بہت گھٹن اور تنگی محسوس ہوگی۔ لیکن اصل صورت حال ایسی نہیں ہے۔ اولاً تو اس نظام میں حکومت کی اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ زندگی میں جو دیگر امور ہوتے ہیں ان میں نہ صرف یہ کہ حکومت کی اطاعت ضروری نہیں ہوتی (60/12) بلکہ حکومت کو ان امور سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ عام زندگی میں ہر شخص اپنی مرضی وخواہش کے مطابق گذر بسر کرتا ہے اور ہر طرح کی آزادی میسر ہوتی ہے۔ جو جس قدر قانون کی اطاعت کرے گا اسی قدر اس کی عزت ہوگی۔ اس بارے میں ضروری بات یہ ہے کہ ہمارے ذہن میں اسلامی مملکت کے سربراہ کی زندگی اور سیرت ایسی ہی آتی ہے جیسے آج

کل کے حکمرانوں کی ہے اور عوام بھی اسی طرح کے سامنے آتے ہیں جیسے آج ہم ہیں۔ لیکن اس نظام میں دونوں کی صورت مختلف ہوگی اس نظام میں سربراہ مملکت سب سے زیادہ قانون کا متبع ہوگا۔(7/163، 7/203)اس نظام کے حکمرانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی قسم کا اجر طلب نہیں کرسکتے۔جو حاکم وقت ہوں گے یہ سوچ سمجھ کر آئیں گے کہ انہیں کوئی اجر نہیں ملے گا۔البتہ جو ڈیوٹی وہ سرانجام دیں گے ان کا معاوضہ ومشاہرہ ان کو دیگر حضرات کی طرح مل جائے گا۔انہیں کسی قسم کی PRIVILEGE نہیں ہوگی۔اسلامی حکومت کے حکام کی جوابدہی بالکل اسی طرح ہوگی جس طرح عام لوگوں کی ہوگی۔قرآن کریم کی رُو سے تو انبیاء کرام بھی بازِ پرس سے مستثنیٰ نہیں ہیں (7/6، 24/57) کوئی شخص احتساب ACCOUNTBILIT سے مستثنیٰ نہیں ہوگا۔مغربی دنیا میں عام طور پر اور ہمارے ہاں بھی یہ تصور عام ہے کہ حکمرانوں کے لئے پبلک لائف میں قانون کا تابع ہونا ضروری ہے۔البتہ پرائیویٹ لائف میں ان کا جو جی چاہئے کریں اُن کا مواخذہ نہیں ہونا چاہئے۔لیکن قرآن کریم کی رُو سے پبلک اور پرائیویٹ لائف کی تقسیم غلط ہے۔حکمرانوں کے لئے بھی،اور ہر شخص کے لئے بھی پرائیویٹ لائف میں بھی قانون کی اطاعت اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ پبلک لائف میں ہے۔ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قانون کی پابندی اور اس کی اطاعت میں گذرے گا۔

جمہوری نظام میں چونکہ مستقل اقدار کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔اس لئے جمہوریت کے داعی ومفکرین کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ انسانی معاشرہ کو کن بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ان کے نظام کی چار بنیادیں یا ہمارے نقطہ نگاہ سے ان کے نظام کی چار خامیاں یہ ہیں۔پہلی خامی یہ ہے کہ ان کے نزدیک حیات مادی عناصر کی ترکیب سے کسی نہ کسی طرح ازخود پیدا ہوگئی ہے۔اس کا نہ کوئی مقصد ہے اور نہ ہی کوئی منزل۔اس نظام کی دوسری خامی یہ ہے کہ ان کے سامنے مستقل اقدار نہیں ہیں۔ہر وہ کام جس سے کسی شخص کو فائدہ ملتا ہو،وہ اس کو سرانجام دے سکتا ہے۔مستقل اقدار کے تصور کے فقدان کی وجہ سے یہ مفکرین GOOD اور EVIL، خیر و شر کو DEFINE نہیں کرسکتے۔اس کا لازمی نتیجہ اس کی

تیسری خامی ہے کہ ہر شخص اپنی یا اپنی قوم کی منفعت کو ہی پیش نظر رکھتا ہے۔اس سے ساری دنیا میں ذاتی انفرادی، یا زیادہ سے زیادہ قومی مفادات حاصل کرنے کی ایک ریس RACE لگی ہوئی ہے۔

بس یہ ایک دوڑ ہے اس دور میں انسانوں کی
تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

اس نظام کی چوتھی خامی قانون مقافات عمل کا انکار ہے۔ جب ہر شخص کو معلوم ہے کہ نہ اس کے بُرے کام کا انجام اس کے لئے بُرا ہوگا نہ کسی نیک کام سے اسے کوئی فائدہ ہوگا تو نیک اعمال کرنے کا مُحرک یہ INCENTIVE جاتا رہتا ہے۔اس کے برخلاف قرآن کریم بڑی مضبوط بنیادوں پر اپنے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے۔ وہ زندگی کا سرچشمہ اور ہدایت کا ابدی سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ کو قرار دیتا ہے اور یہی ذات بزرگ و برتر اُن مستقل اقدار کا سرچشمہ ہے جن پر معاشرے کی تشکیل ہوتی ہے۔ جمہوری معاشرے کے برخلاف اسلامی معاشرے کی بنیاد مندرجہ ذیل محکم اصولوں پر ہوتی ہے

اِس معاشرے کا اصل الاصول انسانی ذات پر ایمان اور اس کا ارتقاء مقصد حیات ہے۔ مغربی جمہوری معاشرے طبعی وحیوانی سطح سے بلندی نہیں ہوتے اُن کے ہاں انسانی ذات یا انسانیت کا تصور ہی نہیں ہے۔انسانیت کے تصور کے نہ ہونے کی وجہ سے اخلاقیات یا خیر وشر کو جانچنے کا معیار ہی مقرر نہیں ہوسکتا۔ زندگی جب حیوانی وطبعی معیار سے بلند ہوکر، انسانی معیار پر آتی ہے تب قرآن کریم اس زندگی کو مخاطب کرنے کے قابل گردانتا ہے، اور زندگی کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔حیوانی وطبعی زندگی کے متعلق قرآن کریم کوئی ہدایات نہیں دیتا۔قرآن کریم یہ نہیں بتاتا کہ سردی کے موسم میں گرم کپڑے استعمال کرنے چاہئیں ۔ اور گرمی کے موسم میں ٹھنڈے کپڑے پہنیں۔ سردی میں اپنے مکان کو گرم رکھو، اور گرمی کے موسم میں درجہ حرارت اس سے زیادہ نہ ہو، جو خوراک ہم جسم کی ضرورت کے لئے کھاتے ہیں وہ ان کے لئے کوئی ہدایت نہیں دیتا کہ کس موسم میں کتنا کھانا ضروری ہے، البتہ جب کھانا کھانے میں "ذات" INVOLVE ہوتی ہے تو وہ ہدایت دیتا

ہے کہ حرام مال کھانا بالکل منع ہے اور صرف حلال کھانے کی اجازت دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں حرام اور حلال کھانے کی وجہ سے ذات انسانی پر اثرات مرتب ہونے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اور یہاں سے ہی فلسفہ اخلاق کی بنیاد مُہیا ہوتی ہے اور اسی بنیاد و اساس پر سارا معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

معاشرے کی تشکیل میں دوسرا محکم اصول توحید باری تعالیٰ کا ہے وحدت خالق کا لازمی نتیجہ وحدتِ مخلوق ہے جس سے ساری دنیا میں عالم گیر برادری وجود میں آتی ہے۔ اس طرح نسل پرستی، وطن پرستی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں آج جو دنیا ایک DEN بنی ہوئی ہے اور یورپ میں جو دو عظیم جنگیں ہوئیں ان کا واحد سبب وطن پرستی اور نسل پرستی کا تھا۔ قرآن کریم نسل پرستی اور وطن پرستی کے بالکل خلاف ہے۔ جو شخص بھی نسل پرستی کا قائل ہے، اس نے قرآن کریم کا پیغام اور اس کی تعلیم کو سمجھا ہی نہیں۔ تاہم بڑے افسوس کی بات ہے کہ ہم مسلمانوں میں بھی یہ نظریات در آئے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس بارے میں ارشاد فرمایا تھا۔

کسے کہ پنجہ زد مُلک و نسب را — نہ داند نکتۂ دینِ عرب را
اگر قوم از وطن بودے محمدؐ — نداد ے دعوتِ دینِ بُولہب را

قرآن کریم کا تیسرا محکم اصول مکافاتِ عمل ہے۔ اس کا عملاً مفہوم یہ ہے کہ ہر عمل کا اثر اس کے کرنے والے کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ ذات کی نشوونما اور اس کا ارتقاء ہی مقصودِ حیات ہے یہ ذات اچھے اعمال سے پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ جسمانی طور پر بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ تقریباً آٹھ پاؤنڈ سے زیادہ اس کا وزن نہیں ہوتا یہی بچہ اپنی جوانی میں ڈیڑھ سو پاؤنڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ اسی طرح انسانی ذات نشوونما پاتی ہے۔ جسم کی قوت غذا و خوراک سے حاصل ہوتی ہے، جبکہ ذات کی نمو داعمال صالحہ سے ہوتی ہے۔ بچہ کی یہی ذات جوانی میں پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ ذات اس درجہ پختہ ہو جاتی ہے کہ موت سے بھی نہیں مرتی۔

موت کے صدمے سے کم ہوتی نہیں تابندگی ۔ اس طرف بھی زندگی ہے، اس طرف بھی

علامہ اقبال نے بھی فرمایا کہ ۔

یہ نکتہ سیکھا میں نے بوالحسن سے کہ جاں مرتی نہیں مرگِ بدن سے

قرآن کریم کا چوتھا اصول اتباع وحی الٰہی ہے۔ جس معاشرے میں اتباع وحی ہوگا وہ معاشرہ صفاتِ الٰہی کو اپنی بنیاد بنائے گا۔ یہی صفاتِ الٰہی مستقل اقدار میں اور POLITICAL PARLANCE میں یہی انسانی حقوق قرار پاتے ہیں۔ اس معاشرہ میں افرادِ معاشرہ صفاتِ الٰہی کو اپنے اندر منعکس کرتے چلے جاتے ہیں۔ صفاتِ الٰہی کو منعکس کرنے کے عملاً یہ معنی ہیں کہ ہر واقعہ وحادثہ پر وہ ردِّ عمل REACTION ہونا چاہیئے جو اس موقع پر صفاتِ الٰہی کا ہو۔ اگر کوئی واقعہ کسی قدر بھی جذبات بھڑکانے والا ہو، لیکن وہاں عفو کی ضرورت ہو، تو اس معاملہ میں عفو کی صفت الٰہی پر عمل کرنا ضروری ہے اور جہاں ظالم کو اپنی گرفت میں لینا اور اسے مزید ظلم کرنے سے رُوکنا درکار ہو، تو ہاں صفت الٰہی جبر، وقہر کو اختیار کیا جائے۔ ہر وقت قرآن کی تعلیم کو سامنے رکھنے اور خصوصاً صفاتِ الٰہی پر مشق کرنے سے یہ ملکہ از خود پیدا ہو جاتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کے معمولات میں خُود بھی دیکھا ہوگا کہ کسی بھی حادثہ پر شریف اور کمینے کا ردِّ عمل ہمیشہ مُختلف ہوتا ہے۔ مومنین جب کسی لغویات کے پاس سے گذرتے ہیں تو نہایت شرافت سے گذر جاتے ہیں۔ (25/72) لیکن اگر کوئی وضیع کمینہ اسی لغویات کے پاس سے گذرے گا تو وہ شرافت سے نہیں گذرے گا۔ جب مومنین کو جہلاء خطاب کرتے ہیں تو وہ سلامت روی اختیار کرتے ہیں۔ لیکن سُفلاء سلامت روی سے نہیں گذر سکتے وہ ضرور اس موقع پر ناراضگی اور برہمی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہاں تک تو افراد کی اپنی طبیعت کا خاصہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر قرآنی معاشرہ ہے اور قرآن کی تعلیم سامنے ہے تو پھر لازمی طور پر وہی ردِّ عمل ہوگا جو قرآن کریم کا مطلوب ومقصود ہے۔ اس میں صرف مشق درکار ہوتی ہے یہاں تک جو کچھ تحریر کیا گیا اس سے مضمون تقریباً پورا ہو گیا ہے۔ تاہم اس موضوع سے متعلق چند مزید اور بھی RELEVENCE رکھتے ہیں۔ مناسب ہوگا کہ وہ بھی تحریر کر دیئے جائیں۔

انسانی ذات یا انسانی زندگی کا یہ تصور کہ ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا منفرد UNIQUE نظریہ ہے اور وہ اسی بنیاد پر معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے ۔ مغربی سیکولر ممالک میں چونکہ اس نظریہ کا کوئی تصور نہیں ہے اس لئے ان کا معاشرہ نہ تو پائیدار ہوسکتا ہے، اور نہ ہی اس میں جرائم کی روک تھام ہوسکتی ہے۔ ایک شخص سخت گرمی میں روزہ رکھتا ہے۔ اپنے مکان میں تنہا ہونے کے باوجود روزہ نہیں توڑتا۔ اس کو علم ہے کہ اس سے اس کو گناہ ہوگا جس کا عملی مفہوم یہ ہے کہ اس کے نفس پر بڑا اثر مرتب ہوگا۔ وہی شخص جب باہر جاتا ہے تو وہ ٹریفک سگنل کی پروا کئے بغیر گذر جاتا ہے۔ کیونکہ اس کو خیال ہے کہ اس جُرم CRIME سے اس کی ذات پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ لیکن اگر وہ اسلامی حکومت ہے، تو اس کو خوب معلوم ہوگا کہ اس سگنل کو پار کرنے سے بھی اس کے نفس پر اتنا ہی بُرا اثر پڑے گا جس قدر بُرا اثر روزہ توڑنے سے پڑتا ہے۔ اس لئے وہ سگنل پار کرنے کا جرم نہیں کرے گا۔ آپ اس کو اِس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جُرم کی دو نوعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جرم تو معاشرہ یا حکومت کے خلاف ہے اور دوسرا جُرم ذات کے خلاف ہے۔ معاشرہ کے خلاف جرائم کا انسداد حکومت کرتی ہے اگر کوئی شخص حکومت کی سزا سے بچ سکتا ہے تو وہ جُرم کرنے سے باز نہیں آسکتا۔ اگر حکومت کی مشینری مضبوط نہیں ہے تو جرائم کا انسداد نہیں ہوسکتا۔ ذات کے خلاف جُرم کرنے کی روک تھام خود انسان کے اندر سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر حکومت اسلامی ہے اور اس کے قوانین کے انحراف سے اللہ و رسول کی معصیت ہوتی ہے، اور نفس پر بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں، تو وہ شخص جو ذات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس پر اثرات مرتب ہونے کا قائل ہے وہ کوئی جُرم نہیں کرے گا۔ اس طرح اسلامی حکومت میں جرائم کا انسداد از خود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس حکومت میں SIN، گناہ اور CRIME، جرم ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ ہر وہ شخص جو گناہ نہیں کرتا وہ جرم بھی نہیں کرے گا۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ حضرات عام طور پر یہ کہتے ہیں کہ چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ کر دینا چاہئے اور جب تک چرچ اور سٹیٹ الگ الگ نہیں ہوں گی، قوم ترقی نہیں کرسکتی جو حضرات مذہب کے لئے۔ CORNERSOFT رکھتے ہیں

وہ برسبیل تنزل کہتے ہیں کہ اگر کسی وجہ سے چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ نہ بھی کیا جائے تو کم سے کم یورپ میں جس طرح RENAISSANCE اور REFORMATION ہوئے، اسلام کو بھی RIFORM، اور حالات کے مطابق بنالینا چاہئے۔ یہ دونوں نظریات وہ حضرات رکھتے ہیں جن کا مغربی ممالک کا مطالعہ ہے اور جن کے سامنے اسلام بطور مذھب کے ہے۔ دین میں چرچ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ چرچ اور سٹیٹ کو تو آپ اس وقت الگ کرسکتے ہیں کہ جب چرچ کا وجود ہو۔ جب دین میں چرچ کا وجود ہی نہیں ہے تو آپ سٹیٹ سے الگ کس چیز کو کریں گے۔ قرآن کریم میں تو تصور ہی صرف سٹیٹ کا ہے۔ قرآن کے ہر حکم کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ اس لئے اسلام میں چرچ ہوتا ہی نہیں۔ اس میں انفرادی، ذاتی پرستش کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس قسم کے خیالات وہ حضرات رکھتے ہیں جن کا تصور اسلام کا بطور مذہب کے ہے۔ اگر اُن کے سامنے دین کا تصور ہو تو وہ یہ نہیں کہہ سکتے۔ یورپ میں چرچ اور سٹیٹ اس لئے الگ الگ کیے گئے کہ ان کے ہاں صرف چرچ تھا۔ اُن کے ہاں NATION STATES کا تصور ہی نہیں تھا۔ اور چرچ کے نظریات نہایت فرسودہ اور عقل انسانی کے خلاف ہیں۔ موجودہ بائبل میں طلاق کے علاوہ اور کوئی LAW ہے ہی نہیں۔ پوری بائبل صرف مذہب پر مبنی ہے، جس پر آج کل عمل نہیں کیا جاسکتا۔ اسی وجہ سے یورپ میں مجبوراً ان کو سول لاء بنانے پڑے۔ موجودہ عیسائیت میں سٹیٹ نہیں تھی صرف چرچ تھا۔ جبکہ اسلام میں صرف سٹیٹ ہے چرچ کا تصور ہی نہیں ہے چرچ اور سٹیٹ کو الگ الگ کرنے کے نظریہ کا اسلام سے کوئی تعلق پیدا نہیں ہوتا۔

تشکیل پاکستان کے وقت، گیارہ اگست 1947ء کو جو تقریر قائداعظم نے اسمبلی میں فرمائی تھی اس تقریر کو ہمارے دانشور حضرات بہت اہمیت دیتے ہیں۔ اس تقریر کے پس منظر میں بھی مذہب کارفرما ہے۔ قیام پاکستان تک اسلام کا دینی تصور واضح نہیں ہوا تھا۔ یہ تو تحریک طلوع اسلام کا شرف اور اس کا اعلیٰ مقام ہے کہ اس نے دین کا تصور پیش کیا۔ جن مغربی تعلیم یافتہ دانشور حضرات کے سامنے اب بھی اسلام بطور مذھب کے سامنے آتا ہے وہ اس تقریر پر حسب دلخواہ تبصرہ کرسکتے ہیں۔ لیکن جن حضرات کے سامنے تحریک طلوع اسلام

اور موقر رسالہ صوت الحق کی وساطت سے دین کا تصور واضح ہوگیا ہے۔ اُن کے نزدیک اس تقریر کی اتنی اہمیت نہیں رہتی ۔ ہمارے دلوں میں قائداعظم کے لئے بہت عزت واحترام ہے۔ ہم جس درجہ بھی ان کا احترام کریں، بجا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کا کوئی قول حجت نہیں ہوسکتا رسالہ صوت الحق کے نزدیک تو حضورؐ کا قول حجت نہیں ہے۔ اس زمین کے اوپر صرف اور صرف قول خداوندی حجت ہے، باقی بتان آزادی۔

یہ بات نہایت توجہ کی متقاضی ہے کہ مسلمانوں کے دینی تقاضوں کے پورا ہونے سے اُنہیں سیاسی مفادات بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ مثلاً دینی تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان ایمان لائیں اور اعمال صالحہ کریں ۔ اس سے اُنہیں اقتدار حاصل ہوجائے گا اور اسی طرح اُنہیں سیاسی مفاد حاصل ہوجائے گا۔ بالکل اسی طرح سیاسی مفادات اتباع دین کا فطری نتیجہ ہوتے ہیں۔ اسی لئے ان کی دنیا ان کے دین سے الگ نہیں ہوسکتی ۔ یہ نکتہ بہت ہی غور وفکر، اور شرح اور تفصل کا متقاضی ہے۔ اور یہ نکتہ قرآن کریم کے وحی الٰہی ہونے کا ثبوت بھی ہے۔ اگر قارئین کرام نے پسند فرمایا تو اس کی شرح وتفصیل پیش خدمت کردی جائے گی۔

اسلام کا اپنا ایک مستحکم نظام ہے۔ اس کی ایک مضبوط اساس ہے۔ ہمارے ہاں وہ نظام خلافت راشدہ تک جاری رہا۔ اس کے بعد ملوکیت کے غلبہ کے باعث وہ نظام معترض ہوگیا۔ بنو عباس کے دور میں بادشاہوں کی حکومت تھی اور مذہبی امور علماء کرام کے سپرد تھے۔ ان علماء کرام نے اس نظام کو چلانے کے لئے اپنی قانونی اصطلاحیں وضع کی تھیں ۔قاضی، مفتی، واجب، فرض، سنت، سنت موکدہ، مکروہ تحریمی، مستحب، یہ سب اس نظام کی اصطلاحیں تھیں ۔ وہ نظام تو عرصہ دراز ہوا کہ ختم ہوگیا۔ لیکن اس نظام کی وضع کردہ یہ اصطلاحیں اسی طرح چلی آرہی ہیں۔ اگر ملوکیت غالب نہ آتی، اور اسلام کا وہ نظام جاری رہتا، تو اپنے اپنے ادوار کے مطابق اس میں نئی نئی اصطلاحات وضع ہوتی چلی جاتیں ۔ اسلامی نظام کے جرائم وسزائیں بھی اپنے نظام سے وابستہ ہیں۔ غیر اسلامی نظام میں جس

میں غربت و افلاس اپنی انتہائی شکل میں موجود ہو۔ اس میں چور کے ہاتھ کاٹنے پر اصرار کرنا نہایت غیر مناسب بات ہے۔

قرآن وسنت کی روشنی میں موسیقی کی حیثیت

موسیقی یعنی گانا بجانے کے بارے میں چند احباب عرصہ سے استفسار کر رہے ہیں کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں گانے بجانے کی کیا حیثیت (پوزیشن) ہے۔ ان حضرات کے بار بار تقاضے کیوجہ سے یہ سطور پیش خدمت کی جاتی ہیں۔

ہمارے علماء کرام قرآن وحدیث کی رو سے شریعت اسلامی میں گانے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں پہلے حرام وحلال اور شریعت کی وضاحت کر دینی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ ان کی اس وضاحت کے بعد مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے خود ہی ہدایت عنایت فرما دی ہے۔ قرآن کریم کا تو موضوع ہی بہترین معاشرہ کا قیام ہے۔ اس معاشرہ کے قیام کے لئے خود اللہ تعالیٰ نے احکامات واقدار نازل فرما دیئے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا لیکن ایک متوازن معاشرہ کے قیام کے لئے چند پابندیاں بھی عائد فرما دی ہیں۔ ان پابندیوں کو قرآن کریم نے حرام کے لفظ سے موسوم کیا ہے اور اس کا حق صرف اللہ کو ہے کہ کون سی چیز حرام ہے اور کون سی چیز حرام نہیں ہے۔ کوئی انسان دوسرے انسان پر یہ پابندی عائد نہیں کر سکتا۔ یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ الْخِنْزِیْرِ وَ مَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ (2-172-173)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات کو کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔ تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے رہو۔ اسی نے تم پر صرف مردار، اور خون اور سور کا گوشت حرام کیا ہے اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے ذبح کیا جائے حرام کیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۃ اعراف میں کھانے کے علاوہ دوسری چیزوں کا بھی ذکر ہے۔ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (7-32) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اس خوشگوار سامان زیست کو حرام قرار دیدے۔ اس کے بعد ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ (7-33) ان سے کہو کہ میرے رب نے صرف بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔ اس کے علاوہ سورۃ انعام میں ارشاد ہے۔ وَ مَا لَكُمْ اَلَّا تَاْكُلُوْا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَ قَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَّا حَرَّمَ عَلَيْكُمْ (6-119) جو چیزیں اللہ نے حرام قرار دی ہیں ان کی تفصیل دے دی ہے۔

ان آیات سے یہ چیز اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ کسی چیز کو حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ کسی چیز کو حرام قرار دینے کا اختیار حضورؐ کو بھی نہیں تھا۔ کیونکہ ارشاد ہوتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ (66-1) اے نبی جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ گانے کے حرام یا حلال ہونے کے لئے سند صرف قرآن سے حاصل کی جانی ضروری ہے۔ چونکہ کسی چیز کی حلت اور حرمت کا اختیار حضورؐ کو نہیں تھا۔ اس لئے یہ مسئلہ حدیث کی JURISDICTION دائرہ اختیار سے باہر ہے۔ اس بارے میں کتب روایات اور حدیث کے ذخیروں کی چھان بین کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہمارے علمائے کرام جن آیات سے گانے کو حرام قرار دیتے ہیں، وہ یہ تین مندرجہ ذیل آیات ہیں۔

(1) وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِىْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ(31-6)

اور لوگوں میں بعض ایسے ہیں جو بے ہودہ قصے خریدتے ہیں تاکہ بغیر سمجھے لوگوں کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں۔

(2) وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً (8-35)

اور ان کی نماز بیت اللہ کے پاس صرف سیٹی بجانا اور تالی کے سوا کچھ نہیں۔

(3) فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (22-30) تو تم ناپاک بتوں سے بچے رہو اور لغو باتوں سے بچے رہو۔ ان تینوں آیات کریمات کی تفسیر پیش خدمت ہے۔ آپ خود غور فرمائیں کہ ان آیات میں دور دور تک کہیں بھی گانے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ پہلی آیت کریمہ میں ہمارے علماء کرام لھو الحدیث سے گانا مراد لیتے ہیں لیکن عربی لغت کی رو سے لھو الحدیث کے معنی کسی لغت میں بھی گانے کے نہیں ہے۔ اسی آیت کریمہ میں آپ غور فرمائیں کہ یہاں پر لفظ قرآن کی آیت کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ مولانا امین حسن صلاحی کی تفسیر ''تدبر قرآن'' ہمارے علماء کے ہاں بہت مقبول اور متداول ہے اس نے بطور حجت اور دلیل کے لکھا ہے۔ ''لھو الحدیث'' اسی طرح کی ترکیب ہے جس طرح دوسرے ''زخرف القول'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے۔ یہاں یہ لفظ کتاب حکیم کی آیات کے مقابل میں استعمال ہوا ہے۔ اس وجہ سے اس سے مراد گمراہ کن باتیں ہیں جو اس وقت کے مفسرین لوگوں کو آیات الٰہی سے برگشتہ کرنے لئے پھیلاتے تھے۔ (جلد 6 صفحہ نمبر 122)

اہل حدیث مسلک کی معروف تفسیر، تفسیر ثنائی میں اس آیت کریمہ کے ذیل میں تحریر ہے ''ایک شخص ایران سے رستم اور اسفندیار کے قصے خرید لایا اور مجلس لگا کر لوگوں کو سناتا اور کہتا کہ قرآن کے قصوں سے یہ قصے اچھے ہیں مگر اس بیوقوف کو یہ معلوم نہ تھا ''شیر قالین دگراست۔ و شیر نیستان دگراست۔'' اس کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی مگر جتنے لوگ ایسے بیہودہ خرافات قصوں کے پڑھنے میں وقت لگائیں اور قرآن شریف کی طرف

خیال نہ کریں، ان کے حق میں اس آیت کا حکم شامل ہے۔

(تفسیر ثنائی کی جلد سوئم صفحہ 526 حاشیہ)

شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ فرمایا ہے۔ اور ایک لوگ ہیں جو خریدار ہیں کھیل کی باتوں کے تا بچلادیں اللہ کی راہ سے بن سمجھے شاہ ولی صاحب دہلوی نے اپنے ترجمہ فتح رحمٰن میں اس آیت کا ترجمہ یوں تحریر فرمایا ہے۔ واز مردمان کسی هیست که می ستاند سخن را که برائے بازی است تا گمراه کند مردم را از راه خدا بغیر علم۔ اس کی تفسیر میں تحریر ہے "لھوالحدیث" سخن ببازی و گفته اند سخن فریب دهنده و مشغول کننده یعنی اختیاری کند افسانۂ بے اعتبار را ۔ ان آیات کی تفسیر میں گانے کا کسی جگہ ذکر تک نہیں آتا۔

اس سلسلے میں دوسری آیت کریمہ جس کا حوالہ ہمارے علماء کرام اکثر دیتے ہیں وہ سورۃ حج کی آیت ہے۔ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَ اجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ (22-30) تم ناپاک بتوں سے بچے رہو اور لغو باتوں سے بچے رہو۔ ہمارے علماء اس میں قول الزور سے گانا مراد لیتے ہیں اور موضوع (بناوٹی) حدیث استدلال کرتے ہیں۔ عربی لغت میں قول الزور کے معنی گانے کے نہیں ہیں۔ چنانچہ شاہ عبدالقادر نے اس کے معنی جھوٹ بات کیے ہیں اور شاہ ولی اللہ نے اس کے معنی سخن دروغ یعنی جھوٹی گواہی کیے ہیں۔ تیسری آیت یہ ہے۔

وَ مَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّ تَصْدِيَةً فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ (8-35) ان کی نماز کچھ بھی نہیں تھی کعبہ کے پاس مگر سیٹیاں بجانی اور تالیاں۔

اس آیت میں لفظ تَصْدِيَةً سے ہمارے علماء گانا مراد لیتے ہیں۔ لیکن شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ "دستک زدن" کیا ہے اور اس کی تفسیر میں تحریر فرمایا "عادت بعض از کفار آن بود که مردان و زنان برهنه طواف می کردند و صفیر میزدند و دست بر دست بر هم میکوفتند۔ تدبر قرآن میں مولانا

نے تحریر فرمایا کہ سیٹی بجانا، ناقوس بجانا سنکھ بجانا، یہ سب ایک ہی نوع کی چیزیں ہیں۔شروع سے مشرکانہ عبادت کے اجزا ہیں۔(جلد3 صفحہ 437)اس آیت میں گانے کا کوئی ذکرنہیں ہے۔

یہ ہے وہ تین آیات کریمات جن سے ہمارے علماء کرام گانے کی حرمت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں آیات میں گانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔علمائے کرام کے نظریئے کے خلاف قرآن کریم موسیقی کو APPRECIATE کرتا ہے۔اس کی تحسین وتوصیف کرتا ہے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَهُمْ فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ (30-15) اوروہ جنت میں نغمات سے لذت اندوز ہوں گے۔دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے۔ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ (43-70) تم اور تمہارے ساتھی جنت میں داخل ہوجاؤ جہاں تم نغمات (گانوں) سے لطف اندوز ہوگے

مصباح اللغات ہمارے عربی مدارس میں مقبول اور متداول ہے۔اس کا جو نسخہ مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی سے طبع ہوا ہے اس میں "اَلْمَحْبِرہ" کے معنی "عمدہ راگ" لکھے ہیں۔زجاج نے اس کی تفسیر موسیقی کے ساتھ کی ہے۔اس نے کہا ہے کہ لغت میں اَلْمَحْبِرہ عمدہ گانے کو کہتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب کی فتح الرحمن کے ساتھ تفسیر کاشفی طبع ہوتی ہے۔زیرنظر آیت کے سلسلے میں اس تفسیر کے چند اقتباسات پیش خدمت عالی کئے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم گانے کی کس درجہ تعریف کرتا ہے۔اقتباسات اوران کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔اس قسم کے مختلف فیہ مسائل میں احتیاط کرنا لازم ہوتا ہے۔اس خیال سے کہ ترجمہ میں کوئی فروگزاشت ہوجائے اس لئے فارسی کی اصل عبارات بھی تحریر کر دی گئیں ہیں۔اگر ترجمہ میں کوئی فروگزاشت ہوگئی ہوتو اس کے لئے پیشگی معذرت پیش کی جاتی ہے۔اب آپ اقتباسات اوران کے تراجم ملاحظہ فرمائیں۔

(1) درعین المعانی آوردہ اند کہ خوش آواز شنوانند ایشاترا و ہیچ برابر سماع آن نباشد۔

عین المعانی میں لکھا ہے انہیں (جنت والوں کو) ایسی خوش آواز سنائی جائے گی کہ اس آواز کے سننے کی لذت کے برابر اور کوئی لذت نہ ہوگی۔

(2) درخبر است کہ ابکارِ بہشت تغنّی کنند بصوت کہ خلائق مثل آن نشنیدہ باشنند و آن افضل نعیم بہشت است۔ حدیث میں آیا ہے۔ کہ جنت میں کنواری لڑکیاں ایسی آواز میں گانا گائیں گی کہ لوگوں نے اس جیسا اچھا گانا (پہلے) نہ سنا ہوگا۔

(3) از یحیٰی بن معاذ و پرسیدن کہ از آواز کدام دوست تر داری، فرمودہ مزامیر۔

یحیٰی بن معاذ سے پوچھا گیا کہ آپ کو آوازوں میں سب سے اچھی کون سی آواز لگی ہے؟ انہوں نے کہا بانسری کی آواز۔

(4) صاحب کشف الاسرار آوردہ کہ فردا دوستانِ خدا در روضات بہشت در میان ریاحین انس بشادی وطرب سماع کنند۔ (ترجمہ) صاحب کشف الاسرار نے لکھا ہے کہ کل (آخرت میں) اللہ کے دوست جنت کے باغوں میں ہوں گے اور وہ خوشی میں گا رہے ہوں گے۔

(5) امام ثعلبی از اوزاعی نقل می کنند کہ ہیچکس خوش آواز تر از اسرافیل نیست چون او تغنی کند ہمہ فرشتگان از اذکار و اورادِ خود باز مانند۔ حاصل سخن آنکہ شریف ترین لذتے بعد از مشاہدہ انوار و تجلّی بہشت سماع خواہد بود۔

(تفسیر حسینی از ملا واعظ کاشفی حسینی صفحہ 908)

ترجمہ۔ امام ثعلبی امام اوزاعی سے نقل کرتے ہیں کہ اسرافیل سے اچھی کسی کی آواز نہیں ہے۔ جب وہ گانا گاتا تو تمام فرشتے اذکار و اوراد سے رک جاتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جنت میں انوار الٰہی کے مشاہدے کے بعد بہترین لذت گانا ہوگا آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ علاوہ مفسر تفسیر ھذا کے کتنے بڑے بڑے امام گانے کے حق میں تحریر کر رہے ہیں۔ ہمارے علماء کرام چیزوں کی حلت و حرمت کے سلسلے میں عموماً شریعت کا حوالہ دیتے ہیں کہ شریعت کی رو سے فلاں چیز حرام ہے اور فلاں چیز حلال ہے۔ اور اسی طرح وہ ہمیشہ

شریعت کے نفاذ پر بھی اصرار کرتے ہیں، اس شریعت سے ان کی مراد بنو عباس کے دور کے جاری کردہ قوانین سے ہوتی ہے۔حالانکہ اس شریعت اور ان قوانین کا بیشتر حصہ خود قران کے خلاف ہے۔اس شریعت کا اصل اہداف ملوکیت اور سرمایہ داری کا جواز اور اس کی حفاظت تھی ۔ اس شریعت کا نفاذ ہی ملوکیت کے ماتحت اور اس کے سائے میں ہوا تھا۔اسلامی قانون کا نافذ صرف ما انزل اللہ (5-44/5-45/5-47) ہے۔

اگر فیصلہ کرتے وقت ما انزل اللہ کے ساتھ کسی اور چیز کو بھی شامل کرلیا، تو فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق اور کافر ہو جاتا ہے۔آیت کریمہ (4-59) کی رو سے اسلامی حکومت اولی الامر (مقامی حکام) کی اطاعت ہی اللہ رسول کی اطاعت ہے۔اسلامی حکومت کے یہ حکام جو قوانین جاری کرتے ہیں، وہ ہی شریعت اور فقہ ہوتے ہیں۔شریعت کوئی جامد یا (FINISHED PRODUCT) نہیں ہوتی کہ جس کو باہر سے IMPOSE کر دیا جائے بلکہ شریعت تو اسلامی حکومت کے اندر خود بخود (EVOLVE) ہوتی چلی جاتی ہے۔اگر اسلامی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اس ملک کے باصلاحیت جوان اپنا وقت گانے پر ضائع کر رہے ہیں تو وہ ان کو وقتی مصلحت کے باعث گانے سے روک سکتی ہے۔یہی اس دور کی شریعت ہو گی۔لیکن اس قسم کے احکامات اسلامی حکومت اپنی صوابدید سے جاری کرتی ہے۔جس طرح گوشت کھانا تو جائز ہے لیکن اسلامی حکومت وقتی ضروریات کے مطابق ہفتہ میں دو روز کے لئے ذبح پر پابندی لگا سکتی ہے۔اسی طرح موسیقی پر بھی وقتی طور پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔

مسلمان آج جن مسائل سے دوچار ہیں ہماری اصل توجہ ان کے حل کرنے کے لئے ہونی چاہیے۔موسیقی سے روکنا یا اسی طرح کے نمائشی مظاہرے کرنا ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے۔ان تمام مصائب اور مسائل کا حل اسلامی نظام کے قیام میں ہے ۔اگر نظام درست ہے تو یہ سارے مسائل از خود حل ہو جاتے ہیں نمائشی طور پر چند امور کو اپنانے سے مسلمانوں کو بالادستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ہمارے برصغیر میں چند انگریزوں نے پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا لارڈ کلایو (LORD CLIVE) کے ساتھ صرف دو سو سپاہی تھے وہ

سب گانے کے شوقین تھے۔ سوڈان میں مہدی سوڈانی نے انگریزوں سے مسلسل ٹکرلی ان کا آخری معرکہ جنرل گورڈن کے ساتھ ہوا تھا مہدی کے ساتھی بڑی بے جگری سے لڑے کیونکہ وہ انہیں امام مہدی خیال کرتے تھے اس کے باوجود شکست ہوئی۔ جنرل گورڈن کے صرف 40 آدمی مارے گئے اور مہدی سوڈانی کے دس ہزار درویش کام آئے۔ یہ درویش سب گانے سے متنفر تھے اور جنرل گورڈن کے تمام ساتھی گانے کے شوقین تھے۔ جنرل گورڈن کی کامیابی اور مہدی کی شکست کیوجہ موسیقی کی حرمت اور حلت نہیں تھی بلکہ یہ تھی کہ جنرل گورڈن کے سپاہیوں کے پاس بندوقیں اور توپیں تھیں جبکہ مہدی سوڈانی کے سپاہیوں کے پاس تیر اور تلوار تھی۔

حضور علیہ السلام کے روضہ مبارک سے ہم سب کو عقیدت و محبت ہے ہم سب مسلمان دور دور سے جا کر اس کی زیارت سے اپنی آنکھیں منور کرتے ہیں۔ جس زمانے میں صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں اور غازی نور الدین شہید والی حلب تھوڑی سی فوج لئے صلیبی دشمنوں کے ٹڈی دل کا مقابلہ نہایت بے جگری سے کر رہا تھا اسی زمانہ میں حجرہ شریفہ (روضہ رسولؐ) میں اندر کی جانب کی دیوار کا ایک حصہ ٹوٹ گیا اس کے گرنے کی آواز سنائی دی شیخ الشیوخ موصل کے عمر نسائی تھے جنہوں نے مجاورت رسول کی غرض سے مدینہ میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ لوگوں نے حجرہ شریف کی مرمت کے لئے انہیں منتخب کیا وہ چونکہ سلسلہ بول کے عارضہ میں مبتلا تھے، انہوں نے شروع میں انکار کر دیا، لیکن لوگوں کے اصرار کی وجہ سے انہیں راضی ہونا پڑا۔ وہ تین دن بھوکے پیاسے رہے اس کے بعد مسجد کی چھت کے متصل جو روشن دان ہے اس سے اندر کی طرف لٹکائے گئے۔ حجرے کے اندر جا کر انہوں نے شمع جلائی۔ گرے ہوئے حصے کی مرمت کی اور قبروں پر جو گرد پڑی ہوئی تھی اس کو اپنی داڑھی سے جھاڑا۔ خلیفہ بغداد کو اس تمام ماجرے کی اطلاع دی گئی۔ اور وہاں کی خاک پاک بطور تحفہ بغداد کو ارسال کی گئی۔ جس روز یہ خاک پاک بغداد پہنچی ہے اس کے استقبال کے لئے خلیفہ، امراء یا عام مخلوق میں سے کوئی بھی صلیبی جنگ میں جانے کو تیار نہیں ہوا۔ جب قوموں پر زوال آتا ہے تو وہ اسی

طرح نمائشی مظاہروں پر زور دیتی ہے۔

اس دور میں جب کہ مسلمان چاروں طرف سے نرغہ میں پھنسے ہوئے ہیں اور ہر طرح سے ذلیل و مجبور ہیں، اس قسم کے غیر ضروری مسائل کو اٹھانا اور ان کو ہوا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جن حضرات کو اسلام اور مسلمانوں سے محبت ہے ان کا سب سے زیادہ اصرار دین کے قیام پر ہونا چاہیے۔ خوب یاد رکھئے کہ اللہ رسول کی اطاعت صرف اسلامی نظام کے ذریعے سے ہوتی ہے۔ اگر اسلامی نظام قائم نہیں ہے تو نہ صرف اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہو رہی ہے بلکہ ہم غیر اسلامی نظام میں جس قدر حلال رزق کھاتے ہیں وہ سب حرام ہوتا ہے۔ جس رزق کی تقسیم قانون الٰہی کے مطابق نہیں ہوتی اس کا ایک ایک لقمہ حرام ہوتا ہے۔

قرآن کریم نے طاغوتی نظام میں زندگی گزارنے والوں کو مجرم قرار دیا ہے (6-123)۔ خوب ذہن نشین فرمالیں کہ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات تسلیم کرتا ہے۔ اس وجہ سے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہاں سے ہی اس جدوجہد کو شروع کردے۔ کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا زمانے سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے۔ اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازبسکہ ضروری ہے کہ ان کا عطا کردہ نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی، اور نافرمان ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز و روزوں کے پابند ہوں۔

جن صاحب ثروت احباب نے موسیقی کے متعلق یہ معلومات حاصل فرمائی ہیں، میرے دل میں ان کے لئے بڑا احترام ہے مجھے علم ہے کہ ان حضرات کو دین سے خاص

وابستگی ہے۔ اس لئے ان کی خدمت عالیہ میں نہایت دردمندی اور دلسوزی سے درخواست ہے کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق قرآن کے اصل ہدف یعنی دین کے قیام کو ہی اپنے سامنے رکھیں۔ اتنے بڑے ہدف کے سامنے آنے کے بعد موسیقی جیسے غیر اہم مسائل ان کے نگاہوں کے سامنے سے خود بخود پیچھے چلے جائیں گے۔ قرآن کریم کا حکم ہے کہ اگر زیادہ تعداد ممکن نہ ہو سکے تو دین کے قیام کے لئے ایک ایک دو دو کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ (34-46) اسی طرح یہ جماعت بنتی چلی جائے گی، اگر آپ حضرات کو اس تجویز اور درخواست سے اتفاق ہے، تو ادارہ صوت الحق سے تعاون فرمائیں کہ یہ خالص دین کے قیام کے لئے کوشاں ہے۔ اور سارے پاکستان میں یہ واحد رسالہ ہے جو قرآن کے نور کو پھیلائے جا رہا ہے۔

مرادِ ما نصیحت بود گر دیم
حوالت با خدا گر دیم و رفتم

کائنات کی تمام قوتیں خداوندی کی اطاعت کرنے کی پابند ہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ (16/49) زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے خواہ وہ جاندار مخلوق ہو یا ملائکہ، قوانین خداوندی کے تابع فرمان ہیں۔ فطرت کی ان ہی قوتوں کے مطابق ارشاد ہوا اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (22/65) کیا تم غور نہیں کرتے کہ زمین میں جو کچھ ہے خدا نے اُسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کرایا ہے اور کشتی کو بھی جو اس کے حکم سے دریا میں چلتی ہے۔ یہ آدم کے سامنے ملائکہ کا سجدہ ہے۔

دہشت گرد کا کوئی مذہب نہیں ہوتا

oooooooooooooooooooooooooooooooooo

دنیا کے تمام مذاہب امن و امان اور چین و سکون سے زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتے ہیں کوئی بھی مذہب یہ نہیں کہتا کہ کسی دوسرے شخص کو کسی قسم کی تکلیف و ایذا دو یا کسی کی کوئی چیز زبردستی چھین لو یا کسی بھی شخص کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دو ایسی اجازت کسی مذہب میں بھی نہیں ہے۔ ہر مذہب میں کسی نہ کسی طرح کی عبادت لازمی ہوتی ہے۔ اگرچہ عبادت میں چند رسوم ہی ہوتی ہیں جو ادا کر دی جاتی ہیں۔ لیکن ان رسوم کا مقصد بھی انسان میں ایسی اصلاح پیدا کرنا ہوتا ہے کہ جس سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو جائے اور اُن کے معاملات عدل و انصاف کے مطابق طے پائیں۔ اگرچہ تمام مذاہب میں امن و سلامتی پر اصرار شدید کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام میں امن و سلامتی پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ اسلام نے اپنے آپ کو صلح و آشتی کا مذہب قرار دیا ہے۔ اسلامی کی تعلیم کی خصوصیت کُبریٰ یہ ہے کہ وہ انسان کو سلامتی کی راہ دکھلاتا ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ سُبُلَ السَّلٰمِ (5/15-16) اے لوگوں اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی اور ایک ایسی کتاب آ گئی ہے جو روشن ہے، خدا اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کے قوانین کا اتباع کریں سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے جس کا بتلایا ہوا راستہ انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک لے جاتا ہے، جسے دار السلام کہا جاتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ هُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6/128) ان لوگوں کے لئے (جو اللہ کی سیدھی راہ پر چل رہے ہوں) ان

کے پروردگار کے نزدیک سلامتی وعافیت کا گھر ہے اور وہ ان کے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے اُن کا مددگار اور رفیق ہے۔ یہی وہ امن وامان کی جگہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (10/25) اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بُلاتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے قرآنِ کریم صاف طور پر اعلان فرماتا ہے کہ وہ فساد پھیلانے والوں، دہشت گردوں کو بالکل پسند نہیں فرماتا ہے وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ (2/205)، اور جب انھیں حکومت مل جاتی ہے تو ان کی تمام سرگرمیاں اس لئے ہوتی ہیں حالانکہ اللہ کبھی پسند نہیں فرماتا کہ ویرانی وخرابی پھیلائی جائے۔ قرآنِ کریم بار بار اور کھُلے الفاظ میں انسان کو دہشت گردی سے روکتا ہے اور برملا کہتا ہے وَ لَا تُفْسِدُوْا فِى الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّ طَمَعًا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (7/56) اور ملک کی اصلاح کے بعد، اس میں دہشت گردی نہ پھیلا ؤ خوف ولالچ دونوں صورتوں میں اس کے قانون کے مطابق چلو۔ یقیناً اللہ کی رحمت ان سے قریب ہے جو نیک سلوک کرنے والے ہیں۔ قرآنِ کریم گذشتہ اقوام کے حالات، ان کی تباہوں اور ان کی داستانیں اس لئے بیان کرتا ہے کہ وہ اس بات کو خوب ذہن نشین کرادے کہ دہشت گردی اور فساد کس قدر مقام انسانیت کے خلاف ہے۔ دہشت گردی کا نتیجہ بربادی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم فرعون اور اس کی قوم کے خلاف سب سے بڑا جرم یہی بیان فرماتا ہے کہ وہ زمین میں فساد پھیلاتے تھے (48/4) دہشت گرد کا تو کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ لیکن یہ دہشت گردی بھی کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ یہ ہمیشہ سے چلی آرہی ہے حضرت عیسیٰ کو جن لوگوں نے صلیب دینی چاہی وہ سب دہشت گرد تھے۔ اس کے بعد ہندوستان میں برابر حملہ آور حملے کرتے رہے وہ یہاں کی دولت لُوٹ کر واپس چلے جاتے تھے۔ جتنے عرصے وہ یہاں رہتے تھے۔ یہاں کے عوام کو قتل کرتے رہتے تھے۔ اگر وہ مسلمان ہوتے تھے تو مذہب کے نام پر ہندوؤں کو قتل کرتے تھے۔ اسلام نے اس قتل عام کی کبھی اجازت نہیں دی۔ اس لئے وہ مسلمان بادشاہ

جو اسلام کے نام پر یہاں کے عوام کو قتل کرتے تھے۔ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا ۔ان کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ان کا مذہب صرف لُوٹ مار کرنا،اور اللہ کی مخلوق کو قتل کرنا تھا تقسیم ہند کے دوران جو قتل وخون ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا وہ سب دہشت گردی تھی۔نہ اسلام قتل عام کی اجازت دیتا ہے اور نہ ہی ہندو مذہب ایسا کرتا ہے۔ان کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔آزادی کے بعد جس شخص نے گاندھی کو قتل کیا اگر چہ وہ بھی ہندو تھا اور گاندھی بھی ہندو ہی تھے۔لیکن ان کے قاتل گوڈ سے (GOOD SAY) کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔کیونکہ ہندو مذہب بھی کسی کو مارنے کی کی اجازت نہیں دیتا۔اب ہمارے ہاں پاکستان میں جس قدر دہشت گردی ہو رہی ہے۔وہ سب اگر چہ مذہب کے نام پر ہو رہی ہے لیکن مسلمان کا مسلمان کو قتل کرنا،کسی طرح بھی اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا۔ان تمام حقائق وواقعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دہشت گرد کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا یہ یا تو پیسے کمانے کے لئے بطور MERCENARY کے کام کرتا ہے،یا اپنا مفاد حاصل کرنے کے لئے دہشت گردی کرتا ہے،اس کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔

=========☆☆☆=========

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی صاحب نے ایک زمانے میں یہ بات کہی تھی کہ جس طرح اصحاب کہف حالات کے جبر سے بے بس ہو کر اپنا ایمان بچانے کے لئے غار میں گھس گئے تھے اور اپنے ایمان کا تحفظ کیا تھا۔اسی طرح ہمارے اساتذہ نے بھی حالات کے جبر کو بھانپتے ہوئے ہمیں مدارس کے غاروں میں داخل کر دیا ہے۔اصحاب کہف جب تین صدیوں کے بعد غار سے نکلے تھے تو سب کچھ بدل چکا تھا زبان بدل چکی تھی،سکہ تبدیل ہو چکا تھا اور حالات انقلابات کا شکار ہو چکے تھے۔اسی طرح جب ہم ان مدارس کے غاروں سے نکل کر سوسائٹی میں آتے ہیں تو ہمیں بھی سب کچھ بدلا ہوا ملتا ہے۔سوسائٹی کی عام زبان ہمارے لئے نامانوس ہوتی ہے،اور ہمارا سکہ آج کے دور میں مارکیٹ میں قبول نہیں کیا جاتا جس

کی وجہ سے ہم اپنی ہی سوسائٹی کے لئے اجنبی ہوجاتے ہیں۔

(بشکریہ مجلۃ الشریعہ)

== تین بچّے ==

قرآن کریم فکر اور حریتِ فکر دونوں کا داعی ہے۔ قرآن کریم کی بے شمار آیات غور فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ کیونکہ وحی الٰہی کا مقصد ہی فکر انسانی میں توسیع کرنا ہے۔ جگہ جگہ آیت لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (2/242) لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (16/90) لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ (2/266) کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ قرآن میں غور وفکر، تدبر وتعقل پر اس درجہ اصرار ہونے کے باوجود حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ہم مسلمانوں میں غور وفکر کا قطعی فقدان ہے۔ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں شاید ہم میں سب سے کم تدبر وتعقل پایا جاتا ہے۔ ہمارے ایک ہزار سال کے عرصہ میں ایک بھی مفکر اس پایہ کا پیدا نہیں ہوا جس کو علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔ اس سلسلہ میں ابن خلدون کو بہت شہرت ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن خلدون بھی صرف عرب امپیریلزم IMPERIALISM عربی عصبیت کا ہی پرچار کرتے رہے۔ ہمارے برصغیر ہندو پاک میں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادے کا بڑا مقام ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب کا تحریر کردہ سارا لٹریچر آپ ملاحظہ فرمالیں، انہوں نے حدیث کا بے حد پرچار کیا۔ خصوصاً موطا امام مالک کو تعلیم کا مرکز بنایا۔ اس کی ایک شرح عربی میں "المسوی" اور دوسری شرح فارسی میں "المصفی" تحریر فرمائیں۔ اس کے علاوہ تصوف کی تعلیم کی نشر واشاعت کی۔ ان کی ایک معروف کتاب الناس العارفین بھی ہے۔ اس کے متعلق کچھ تحریر کرنا بے سود ہی ہے۔ اب تو (غالبا) اس کا ترجمہ اردو میں بھی دستیاب ہے، ہر قاری خود اندازہ کرسکتا ہے، کہ اس کتاب کی علمی حیثیت کتنی ہے۔

ہم مسلمانوں کو غارت وتباہ کرنے میں سب سے بڑا کردار تصوف کا ہے تصوف کا دارومدار ہی اس بات پر ہے کہ فکر انسانی کی بنیاد ہی غلط ہے اور اس سے جس قدر اجتناب کیا جائے، اسی قدر بہتر ہے۔ صوفیائے کرام علم وفکر کی بنیاد "علم لدنی" الہام اور کشف پر رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم کے یہ صحیح ذرائع ہیں اور ان سے حاصل شدہ علم بالکل درست ہوتا ہے، جبکہ عقل انسانی کے ذریعے حاصل کردہ علم مشکوک ہوتا ہے وہ دنیاوی

علوم حاصل کرنا ہی بیکار سمجھتے ہیں۔ چونکہ تصوف کی بنیاد ہی FRUSTRATION پر ہوتی ہے اس لئے یہ دنیا سے بیزاری کا سبق دیتے ہیں۔ آپ خود اندازہ فرمائیں کہ جس قوم کے بڑے بڑے عمائدین علم وفکر کے خلاف ہوں۔ وہ دنیاوی علوم جو اچھے اور خوش حال معاشرے کی تعمیر میں کام آئے ہیں، اور وہ سائنسی علوم جن سے تسخیر کائنات ہوتی ہے، یہ اُن کا حاصل کرنا ہی جائز نہ سمجھتے ہوں، تو وہ قوم کس طرح ترقی کر سکتی ہے۔ اور یہ بھی عجیب تماشہ ہے کہ ہمارے ہاں جو عالم جس قدر غور وفکر کا مخالف ہے، اسی قدر اس کی ہمارے ہاں زیادہ قدر ومنزلت ہوتی ہے۔ امام غزالی، حجتہ الاسلام، کا جو مرتبہ ہمارے ہاں ہے اس کا سب کو اندازہ ہے۔ لیکن ان کی ایک کتاب "تہافتہ الفلاسفہ" نے غور وفکر کے تمام دروازے اس طرح بند کئے کہ غزالی کے بعد ہمارے ہاں صرف چند ہی مفکر پیدا ہوئے ہیں جب تک تصوف کی تعلیم علمی انداز میں نثر میں رہی، اس کے تباہ کن اثرات عوام تک نہیں پہنچے، جو رہی سہی کسر تھی وہ مولانا روم کی مثنوی "شریف" نے پوری کر دی۔ ایک تو مثنوی شعر میں ہے، دوسرے اس کا انداز محاکاتی ہے، اس لئے یہ مثنوی عوام اور نیم تعلیم یافتہ علماء میں بہت مقبول ہوئی۔ اور اسی قدر عام مسلمان تصوف کے گرویدہ ہوتے چلے گئے اور قعر مذلت میں گرتے ہی چلے گئے۔

دوسرا سبب مسلمانوں کے فکری جمود کا ہماری روایات ہیں۔ آپ روایات کے یہ ذخیرے خود ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ان میں کیا کچھ لکھا ہے۔ یہ روایات تمام انبیاء کرام اور خصوصاً حضورؐ کو غور وفکر اور اختیار وارادہ سے محروم قرار دیتی ہیں۔ ان روایات کو وحی خفی قرار دیا جاتا ہے۔ اور ان کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت مراد ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں جس جس جگہ **اطیعو اللہ و اطیعو الرسول** کے الفاظ آتے ہیں، اسی سے عملاً مراد قرآن وحدیث کی اطاعت لئے جاتے ہیں۔ گویا اس طرح رسول کا ترجمہ روایات کیا جاتا ہے۔ روایات کی اطاعت کو اطاعت رسول کے مرادف قرار دینے سے سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس نے اسلامی نظام قائم کرنے کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ قرآن کریم کی رو سے اطاعت رسول کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت کرنے سے ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے لیکن جب آپ نے روایات کے ذریعے رسول کی اطاعت کر لی تو پھر ظاہر ہے کہ آپ کو اسلامی نظام کے قیام کی

ضرورت ہی باقی نہیں رہتی ۔ پھر اسلامی نظام سے متعلق جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وعدے فرمائے ہیں کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے، ان کے معاشرے میں خوف وحزن نہیں ہوگا ، ان کے ہر فرد کو رزق فراہم ہوگا وغیرہ۔ وہ احادیث کی اطاعت سے حاصل نہیں ہوسکتے۔ پھر دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور دیگر مذاہب کی صف میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور اسلام کی کوئی فوقیت و برتری بھی دیگر مذاہب پر باقی نہیں رہتی۔

مسلمانوں کے فکری فقدان کا تیسرا سبب ہمارا اسلامی فقہ ہے۔ یہ فقہ بنو عباس کے دور میں مدون ہوا تھا۔ جب اسلامی نظام نہ صرف (منقطع) ہو چکا تھا بلکہ اس کے اثرات بالکل ختم ہو گئے تھے۔ بنو عباس کی حکومتیں خالص ملوکیت تھیں۔ اس کے نام نہاد خلفاء بادشاہ ہی ہوتے تھے۔ یہ بادشاہ نہایت درجہ کے بدچلن اور بدکردار ہوتے تھے۔ ان کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں جن سے یہ عیاشی کرتے تھے۔ یہ تلوار کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے تھے۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان حکومتوں کو چلانے کے لئے بھی قانون قاعدے وضع کئے گئے ہوں گے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ ان قوانین کو نہ تو ہمارے علماء ہی جانتے ہیں، اور نہ ہی ہمارے ہاں کوئی اہمیت ہے۔ لیکن بنو عباس کی ان حکومتوں نے جو پرسنل لارز بنائے تھے وہ آج تک ہمارے سروں پر سوار ہیں۔ ان کو اس درجہ تقدس (SANCTITY) دیا گیا ہے کہ ان کو چھیڑا تک نہیں جاتا ان میں قطعاً کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں کی جاسکتی۔

ہمارے ہاں مدت سے یہ بحث چلی آرہی ہے کہ فقہ میں جو اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا ہے، اسے کھول دینا چاہیئے۔ ہمارا قدامت پرست طبقہ اس کے خلاف ہے اور اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن جو حضرات بہت روشن خیال شمار کئے جاتے ہیں وہ اجتہاد کے دروازے کو کھلا رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ان روشن خیال حضرات کے خیال میں بھی اجتہاد زیادہ سے زیادہ جزئیات و تعزیرات میں ہی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ حکومت کے وضع کردہ قوانین، یعنی پبنک لاز ان کے دائرہ اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ وہ یہی اجتہاد کرسکتے ہیں کہ رفع سبابہ (تحیات میں انگلی کھڑی کرنا) جائز ہے یا نہیں نماز میں آمین کہنا جائز ہے یا نہیں اور اگر جائز ہے تو سرّی طور پر یا جہری طور پر نماز میں ہاتھ باندھنا ضروری ہے یا نہیں ۔ مہر کی رقم میں کوئی تبدیلی ہوسکتی ہے یا نہیں۔ کتنی مسافت پر روزہ میں تاخیر کی جاسکتی ہے

وقس علی ذلک۔ جو حضرات اجتہاد کا روازہ وا رکھنا چاہتے ہیں ان کا اجتہاد بس اتنا ہی ہوتا ہے

۔

لیکن قرآن کریم کے مطابق اجتہاد انفرادی طور پر نہیں ہوسکتا اسلامی حکومت ہی اجتہاد کر سکتی ہے۔ اس حکومت کا سابقہ حکومتوں کے قوانین سے کوئی علاقہ نہیں رہتا۔ ہر اسلامی حکومت کے قوانین اس کی شریعت اور اس کا فقہ ہوتے ہیں۔ اس میں پبلک اور پرسنل لارز کی تفریق نہیں رہتی۔ اس میں اسلامی نظریاتی کونسل، اسلامی مشاورتی بورڈ کی طرح کے اداروں کی ضرورت نہیں رہتی اسلامی حکومت کی نیشنل اسمبلی جیسے ادارہ خود ہی نئے نئے قوانین بناتے جاتے ہیں، جو وقتی ضرورتوں کو پورا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات خوب اچھی طرح واضح رہے کہ ہمارے دور میں اجتہاد کی ضرورت صرف قوانین میں ہی نہیں ہے، بلکہ اس وقت تو فکری اجتہاد کی سخت ضرورت ہے۔ اجتہاد اس بات میں کیا جائے کہ۔

(1) کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی حاکم ہوسکتا ہے۔ اور کیا انسانوں کو قوانین بنانے کا اختیار ہے۔

(2) کیا طاغوت کی حکومت میں زندگی گزارنا جائز ہے۔ اور اگر بہ مجبوری جائز ہے تو کس حد تک۔

(3) غیر اسلامی حکومت میں رہ کر کمایا ہوا رزق حلال ہوتا ہے یا قطعاً حرام ہوتا ہے

(4) کیا اسلامی حکومت میں انفرادی پرستش جائز ہے۔

(5) صلوٰۃ زکوٰۃ، پرسنل لاز ہیں، یا پبلک لاز ہیں۔ یعنی دوسرے الفاظ میں کیا غیر اسلامی حکومت میں ان دونوں ارکان پر عمل ہوسکتا ہے یا نہیں۔

(6) اس بات میں بھی اجتہاد کیا جائے کہ قرآن کریم میں رُوحانیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ جب ہمارے رسائل وجرائد، اخلاقی، روایتی، معاشرتی۔ تمدنی، اور روحانی اقدار کے الفاظ تحریر کرتے ہیں، تو آپ ان کیروحانی اقدار کو قرآنی اقدار پڑھا کیجئے۔ کیونکہ قرآن نے اپنے لئے خود "روح" کا لفظ استعمال کیا ہے (42/52، 17/85، 40/15) روحانی سے مراد ہی قرآنی ہے۔ روحانیت میں کمال حاصل کرنے کا قرآنی مفہوم ہی یہ ہے کہ قرآنی نظام کو قائم کردیا جائے۔

(7) یہ اجتہاد کیا جائے کہ قرآنی اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرنا، خود ایک مستقل قدر ہے یا نہیں۔

(8) یہ اجتہاد کیا جائے کہ ملکیت زمین جائز ہے یا نہیں۔ اور ربٰو کی قرآنی تعریف کیا ہے۔

(9) محنت کے علاوہ معاوضہ لینا جائز ہے یا نہیں۔ اور اسلامی اقدار کے مطابق بینک کس طرح چلائے جاسکتے ہیں۔ یہ مسئلہ اجتہاد کا سخت متقاضی ہے کیونکہ سعودی عرب کے علماء اجتہاد میں بالکل ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

(10) ہمارے سارے مذہبی ارکان دین کے قیام کے ذرائع ہیں۔ حج کا سالانہ اجتماع، جس پر کروڑوں روپے صرف ہوتے ہیں، وہ محض پرستش کے لئے نہیں ہے بلکہ اس سے انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑی ہوتی ہے (5/97)

اور حج کا مقصد ہی قانون الٰہی کو دیگر قوانین پر غالب کرنا ہے (2/185)

یہ اور اسی طرح کے دیگر نکات میں اجتہاد کرنا ضروری ہے اور اسی اجتہاد سے امید ہے کہ مسلمانوں کا زوال ترقی میں بدل جائے۔ ورنہ کم سے کم فکری جمود تو ٹوٹے گا۔ ہمارا فقہ تو اس کا قائل ہی نہیں ہے کہ اس میں کوئی اجتہاد کیا جاسکے۔ اگر اجتہاد کرنا ضروری ہے تو وہ فکری اجتہاد ہے۔

ہماری تباہی کا ایک سبب ہماری سابقہ تفاسیر بھی ہیں اور علماء کا یہ اصرار کہ سلف صالحین جو کچھ تفاسیر میں تحریر کر چکے ہیں ان سے انحراف نہ کیا جائے۔ اور مزید تفاسیر تحریر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہماری تفاسیر میں جو کچھ تحریر ہے اس کی صرف ایک جھلک پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

ہماری تفاسیر میں تین اہم شخصیتوں کو بچہ بنایا گیا ہے۔ پہلی شخصیت جس کو ہمارے مفسرین نے بچہ بنایا ہے وہ حضرت اسماعیل کی ہے۔ ان کے متعلق مختلف آیات کے ذیل میں مختلف تفاسیر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، جن سب کا ملخص تقریباً یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ایک کنیز تھیں جن کا نام ہاجرہ تھا۔ ان کے بطن سے حضرت اسماعیلؑ تولد ہوئے تھے۔ اس وجہ سے زوجہ محترمہ حضرت سارہ کے دل میں حسد پیدا ہوا۔ وہ ہاجرہ اور ان کے بیٹے اسماعیل کی موجودگی کو برداشت نہیں کر سکیں۔ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ سے تقاضہ کیا

کہ وہ ان ماں بیٹے کو کہیں اور لے جائیں، حضرت ابراہیمؑ کو فرمان الٰہی ہوا جس کی تعمیل میں وہ اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو ملک شام سے سرزمین مکہ لے گئے۔ ان دنوں وہ علاقہ بالکل خشک اور بنجر تھا۔ قرآن کریم نے اسے غیر ذی ذرع کہا ہے۔ آپ نے ان دونوں ماں بیٹے کو وہاں ٹھہرایا اور خدا حافظ کہہ کر چلے آئے۔ تھوڑی دیر بعد اس تپتی زمین پر ماں اور بیٹے کو پیاس لگی۔ ہاجرہ نے اپنے اس ننھے سے بچے کی جان بچانے کی کوشش کی۔ پیاس کی وجہ سے حضرت اسماعیلؑ نے اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑیں جس سے زم زم کا چشمہ جاری ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک صحرا نورد قبیلہ "جرہم" وہاں سے گذرا اسے اس سارے ماجرے کا پتہ تھا۔ اس نے وہاں ہی پڑاؤ ڈال دیا اور مکہ آہستہ آہستہ آبادی کی شکل اختیار کر گیا۔

معروف، مستند اور مدارس عربیہ میں متداول تفسیر، تفسیر مظہری میں اس بارے میں بہت طوالت سے لکھا گیا ہے۔ اس میں سے صرف ایک پیرا گراف تحریر کیا جاتا ہے، اس کو پڑھئے اور سر دُھنئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور اُن کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زم زم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھایا۔ حضرت اسماعیلؑ ان دِنوں شیر خوار تھے۔ ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوارے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا۔ پھر لوٹ پڑے حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا ابراہیمؑ آپ ہم کو اس ویران وادی میں، جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز، چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا۔ ہاں اس پر ہاجرہ بولیں، تو اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیم چل دیئے۔ جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبہ کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی ربنا انی اسکنت من ذریتی جلد 5 ص 207 تفسیر مظہری۔ اس طرح کی بہت تفصیلات درج ہیں، آپ ملاحظہ فرمائیں کہ کس ACCURACY کے ساتھ چیزیں تحریر کی گئی ہیں کہ دونوں ماں بیٹے کو ایک درخت کے پاس بٹھایا گیا۔ پھر خورجین میں کھانے کے لئے چھوارے رکھے گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفسرین کرام خود موقع پر موجود تھے۔

اب قرآن کریم کی سُنیئے، سورۃ صٰفٰت میں حضرت اسماعیلؑ کا تذکرہ شروع ہی

ان الفاظ سے ہوتا ہے، کہ ہم نے ابراہیم کو ایک بُردبار لڑکے کی پیدائش کی خوشخبری دی۔ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ (37/102) پھر جب وہ دوڑ دھوپ کرنے لگا۔ اور وہ اس کے ساتھ دوڑنے کو پہنچ گیا، تو حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ حضرت اسماعیل کو ذبح کر رہے ہیں۔

اس پر انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کا تبصرہ طلب فرمایا۔ جس پر حضرت اسماعیل نے اپنے والد گرامی کو فرمایا کہ وہ اس خواب کی تعمیل فرمائیں۔ اور وہ انشاء اللہ حضرت اسماعیل کو صابرین میں سے پائیں گے لیکن جب حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو کنپٹی کے بل لٹا دیا اور دونوں نے اللہ کے حضور کامل اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کر دیا، تو اُنہیں وحی الٰہی کے ذریعے حضرت اسماعیل کو ذبح کرنے سے روک دیا گیا۔ لیکن یہ تمام واقعات حضرت اسماعیلؑ کے جوان ہونے کے بعد کے ہیں۔ ان کا اُن کے بچپنے یا شیر خوارگی کے وقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آیہ کریمہ (37/102) نے خود ان کے بچہ ہونے کی واضح تردید کی ہے۔

دوسری شخصیت جس کو مفسرین نے بچہ بنایا ہے وہ **شاھد من اھلھا** (عورت کے لوگوں میں سے ایک گواہ) ہے جس نے حضرت یوسف کی بریت کی تصدیق کی تھی۔ جس وقت یوسف اپنے آپ کو بچانے کے لئے دروازے کی طرف دوڑے تو وہ عورت آپ کو پکڑنے کے لئے آپ کے پیچھے دوڑی۔ اس کے ہاتھ میں حضرت یوسف کا کرتہ آ گیا اس نے اس کو اس زور سے کھینچا کہ وہ کرتہ پھٹ گیا۔ یہ دونوں دروازے کی طرف لپکے کہ اتنے میں اس عورت کا شوہر آ گیا۔ اور اس عورت نے حضرت یوسف پر ہی عیب لگا دیا اب یہ بات کہ قصوروار کون تھا، اس پر کسی سمجھدار آدمی نے یہ اصولی بات کہی کہ "اگر قمیص آگے سے پھٹی ہے تو عورت سچ کہتی ہے اور یہ جھوٹوں میں سے ہے اور اگر اس کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہے تو وہ عورت جھوٹ بولتی ہے اور یہ سچوں میں سے ہے (12/26) ظاہر ہے کہ یہ اصول کسی سمجھدار آدمی نے ہی بیان کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں ہماری بعض تفاسیر نے تو اسے آدمی ہی لکھا ہے، لیکن بعض تفاسیر نے اس کو بچہ کہا ہے۔ چنانچہ تفسیر ابن کثیر میں ہے کہ "دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا دودھ پیتا گہوارے میں جھولتا بچہ تھا۔ ابن جریر میں ہے کہ چار چھوٹے بچوں نے بچپنے میں ہی کلام کیا ہے، اس پوری حدیث میں اس بچہ کا بھی ذکر ہے جس نے حضرت یوسف کی پاکدامنی کی شہادت دی تھی۔"

ہمارے مفسرین نے تیسرا بچہ حضرت عیسیٰ کو بنایا ہے۔شروع سے ہی ہمارے مفسرین ان کو بچہ لکھتے چلے آرہے ہیں۔لیکن موجودہ دور میں ان کے متعلق بہت لٹریچر لکھا گیا کہ وہ بچے نہیں تھے۔ان کے بچہ ہونے کی تردید سب سے پہلے سرسید احمد خان نے کی ہے۔اس کے بعد بہت حضرات نے اس باب میں کتابیں تصنیف کی ہیں۔ان میں ولادت مسیح کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے چونکہ اس مضمون میں وہ ساری تفصیلات نہیں آسکتیں، اس لئے قارئین کرام سے درخواست ہے کہ اگر وہ اس معاملہ میں دلچسپی رکھتے ہوں تو براہِ راست ان کتب کا مطالعہ فرمائیں لیکن اس بات کو ضرور پیش نگاہ رکھیں کہ اگرچہ ولادت ووفات مسیح کا عقیدہ دین کا کوئی جزو نہیں ہے۔لیکن اس کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے۔اس عقیدہ اور دیگر اسی طرح کے نظری عقائد کو صرف اس وجہ سے اہمیت دی جاتی ہے کہ مسلمان صرف سابقہ فکری مغالطوں میں اُلجھے رہیں۔اور آئندہ بھی اگر کوئی فکری کام کریں تو انہیں مسائل کو اہمیت دیں۔اس وقت ہمارے سنبھلنے کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ سابقہ ساری زنجیروں کو گلے سے اتار دیں۔براہ راست قرآن کریم کا مطالعہ کریں۔ہمیشہ قرآن خالص پیش نظر رکھیں۔اس کی ایک ایک آیت میں غور کریں۔سابقہ تمام نظریات کو جو قرآن کے خلاف ہیں اور روایتی طور پر ہمارے سروں پر پڑے ہوئے ہیں، بغیر لومت لائم، ان کو جھٹک کر کے الگ کردیں۔ہمارا فقہ تو اس قابل ہی نہیں ہے کہ اس میں کوئی اجتہاد کیا جائے۔ہم مروجہ، راسخ نظریات اور قرآن کریم کی ایک ایک آیت کی تفہیم میں اجتہاد کریں۔مقصد پیش نظر مذہب کی تردید اور دین کے تصور کو خوب خوب واضح اور نکھار کر پیش کرنا ہونا چاہئے۔اگر ایک مرتبہ قرآنی دین کا تصور مسلمانوں کے سامنے آگیا، تو مذہب از خود مٹتا چلا جائے گا۔

اس وقت ہم مسلمان اپنا سب کچھ برباد کر چکے ہیں۔شاید ہماری تاریخ میں اس سے بُرا وقت کبھی نہیں آیا ہوگا۔ہمارا آخری سہارا اور ہماری آخری پناہ گاہ صرف قرآن ہے (18/27) اسی کا سہارا لے کر، ہم اگر اب بھی سنبھل جائیں تو پھر بھی یہ بہت غنیمت ہی ہوگا لیکن سب کچھ لٹا کے ہوش میں آئے تو کیا کیا۔

درسی کتاب "علوم القرآن" پر تبصرہ

ہمارے ملک عزیز پاکستان میں تعلیم عام کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد، کا اس سلسلہ میں ایک اہم کردار ہے۔ اس قسم کی اُوپن یونیورسٹیز عموماً دنیا کے بیشتر ممالک میں کام کر رہی ہیں۔ ان یونیورسٹیز میں طلباء کا حاضر ہونا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ پورے ملک کے طلباء، خواہ وہ کسی شہر میں ہوں، اس سے استفادہ کر کے ڈگری حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ اصطلاح میں DISTANCE TEACHING کہلاتی ہے۔ اس یونیورسٹی کی ڈگری کی وہی اہمیت ہوتی ہے جو دیگر یونیورسٹی کی ڈگری کی ہوتی ہے۔ اس یونیورسٹی سے، ایم اے، ایم فل، اور غالباً ڈاکٹریٹ تک کی ڈگری حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس اعتبار سے یہ یونیورسٹی جو کام کر رہی ہے وہ نہایت قابل تبریک و تحسین ہے۔ اس یونیورسٹی میں قرآن و تفسیر کا بھی ایک شعبہ ہے جسے "**کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ**" کہا جاتا ہے۔ اس یونیورسٹی نے اس شعبہ کے لئے ایک کتاب طبع کی ہے جس کا نام "علوم القرآن" ہے اور جو "**التخصص فی القرآن والتفسیر**" کے طلباء کے لئے طبع کی گئی ہے۔ اس کلاس کے طلباء کے امتحان میں اس کتاب سے سوالات آتے ہیں۔ یہ کتاب 861 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو تحریر کرنے میں تقریباً 5 اسکالرز نے حصہ لیا ہے۔ ان میں سے بیشتر حضرات، پی۔ایچ۔ڈی ہیں۔ اور اپنے اپنے خاص مضمون میں ماہر اور تخصص کئے ہوئے ہیں۔ اس لئے مجھے اپنی بے بضاعتی، اور ہیچمدانی کے پیش نظر اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی، لیکن محترم التھام جناب پرویز صاحب کے دو واقعات چونکہ میرے سامنے تھے، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن خالص کس طرح دستگیری کرتا ہے، اس لئے اس کتاب پر تبصرہ کرنے کی جرات پیدا ہوگئی۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے، کانگریس کے موقف کی تائید کرتے ہوئے، اپنی تفسیر کے پہلے حصہ میں یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی کہ تمام مذاہب یکساں ہیں اور ہر

مذہب نیک عملی اور خدا پرستی کی تعلیم سکھاتا ہے۔ اس وقت پورے ہندوستان میں مولانا آزاد کی بہت شہرت اور عزت تھی۔ اور ان پر ہاتھ ڈالنا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پرویز صاحب کی عمر اس وقت تقریباً صرف 35 سال ہوگی لیکن چونکہ ان کا موقف قرآن کریم کے مطابق تھا اس لئے محترم پرویز صاحب نے مولانا آزاد کا تعاقب کیا۔ اور قرآن کریم سے ثابت کیا کہ مولانا آزاد کا نظریہ غلط تھا اور اسلام مذہب کے زُمرہ میں آتا ہی نہیں اور اس کو بحیثیت دین کے تمام باطل مذاہب پر فوقیت حاصل ہے۔ مذاہب سب باطل ہوتے ہیں۔ اور صرف دین ہی حق پر استوار رہتا ہے۔ اُس وقت بھی قرآنی مفکرین اور دانشوروں نے پرویز صاحب کے موقف کی تائید کی اور اب HIND SIGHT میں تو بات اور بھی واضح ہوگی کہ پرویز صاحب کا موقف درست تھا اور انہوں نے مولانا آزاد کے خلاف مضمون لکھ کر بڑی ہمت و جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ پرویز صاحب کی ہی دوسری مثال ختم نبوت کے مسئلہ میں ہے۔ مقدمہ بہاولپور میں بڑے بڑے علماء کرام نے حصہ لیا، مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوری، مفتی محمد شفیع مرحوم اور سب سے بڑھ کر، حضرت العلام، مولانا انور کشمیری عدالت میں پیش ہوئے۔ لیکن سیشن جج محمد اکبر صاحب کو نبی اور نبوّت کی جامع تعریف کسی سے بھی حاصل نہیں ہوسکی۔ لیکن پرویز صاحب کے صرف ایک مضمون سے اُن کو نبی اور نبوت کی جامع تعریف معلوم ہوگئی۔ اور ان سیشن جج صاحب نے، پرویز صاحب کے اس ایک مضمون کو بُنیاد بنا کر مقدمہ کا فیصلہ کر دیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان علماء کرام کے سامنے خالص قرآن نہیں تھا جبکہ پرویز صاحب کے سامنے صرف قرآن تھا۔ اگر صرف قرآن سامنے ہو تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے قرآن کریم نے فرمایا یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (8/29) اے ایمان والو اگر تم قوانین خداوندی کی پیروی کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے میں ایک ایسی صلاحیت پیدا کردے گا کہ تم فوراً حق و باطل میں امتیاز کر سکو گے۔ اسی مضمون کو سورۃ حدید میں اس طرح فرمایا کہ اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے ایک ایسا نور پیدا کردے گا نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ (57/28) کہ جس کی روشنی میں تم چلو گے۔ ایک حدیث میں بھی حضورؐ نے ارشاد فرمایا اتقو الفراسة المومنین انه ینظر بنور الله ، اوکما قال علیه السلام مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ اور یہ بات

ظاہر ہے کہ اللہ کا نور یہ قرآن کریم ہی ہے۔ کتاب کے محتویات CONTENTS پر تبصرہ کرنے سے بیشتر ایک گذارش پیش خدمت عالی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی واحد وجہ قرآن کریم کو دین کی بلند سطح سے مذہب کی پست سطح پر لانا ہے۔ اگر ہم قرآن کریم پر بحیثیت دین کے عمل کرتے تو قرآن کریم کے تمام وعدے پورے ہوتے۔ قرآن کریم نے وعدہ فرمایا تھا کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے (3/139) ایک ایسی اُمتِ وسطیٰ رہیں گے کہ تمام دنیا کے نگران رہیں گے اور ان کا سربراہِ مملکت ان کا نگران رہے گا (2/143) پوری انسانیت کی منفعت ان کے پیش نظر رہے گی (3/110) یہ ساری دنیا میں عدل وانصاف قائم کرسکیں گے (4/135، 57/25) ان کے معاشرے میں کوئی خوف وہراس نہیں رہے گا (2/38) ان کی مملکت میں ہر متنفس کو رزق مہیا ہوگا (11/6) قرآن کریم کے یہ وعدے اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے۔ لیکن جب ہم نے اس کے نظام کو ہی لپیٹ کے رکھ دیا، تو ہم ذلت وخواری میں بھی مبتلاء ہوگئے اور دوسری قوموں کے دست نگر ہوگئے اور رزق کے حصول میں دوسری اقوام کے محتاج ہوئے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنے زوال کے اس سبب کا صحیح ادراک نہیں ہے اور مسلمانوں میں ایک ہزار سال کے اندر قوم کی اصلاح کی جو بھی کوششیں ہوئیں ان کے پیش نظر یہ نکتہ آیا ہی نہیں کہ ہمارے زوال کا سبب اس نظام کو چھوڑنا ہے۔ اس کے برخلاف ہماری ساری تفاسیر، احادیث وروایات اور تاریخ صرف مذہب کے نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئیں۔ اس تمام لٹریچر میں دین کا کہیں کوئی تصور دکھائی نہیں دیتا۔ یہ سارا لٹریچر مسلمانوں کے زوال کا باعث ہے۔ اور جب تک ہم اس ایک ہزار سال کے سارے لٹریچر کو نظر انداز نہیں کریں گے۔ ہم ترقی نہیں کرسکتے۔ اس لٹریچر میں جو عقائد ونظریات پیش کئے گئے ہیں، ان کو جو قوم بھی اختیار کرے گی، وہ تباہ وبرباد ہوجائے گی

اب تک یہ لٹریچر مسجدوں، مدارس جامعہ عربیہ تک محدود تھا۔ اب جبکہ ساری دنیا میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً "احیاء اسلام" کی صدائیں بلند ہورہی ہیں۔ یہ تباہ کن، خلاف قرآن لٹریچر کالجوں، یونیورسٹیوں، یہاں تک کہ انگلش میڈیم اسکولوں تک پہنچ رہا ہے۔ اور اس طرح یہ لٹریچر اپنے TENTACLES، دانشوروں اور INTELLECTUALS میں بھی پھیلا رہا ہے۔ اس لٹریچر سے جو ذہن مساجد کے طلباء میں بنتا تھا اور وہاں سے

''ابلہ مسجد'' پیدا ہوتے تھے۔اب اسی لٹریچر سے ہمارے ذہین وفطین بچے پوری پوری طرح متاثر ہوکر''ابلہ کالج'' بن کر نکل رہے ہیں۔لہٰذا قرآن کریم کی روشنی وفراست نہ مدارس ومساجد میں ہوتی تھی، اور نہ اب کالجوں میں پیدا ہوگی۔

اس کتاب کا نام''علوم القرآن'' تجویز کیا گیا ہے۔اس میں صرف ان ہی موضوعات پر گفتگو کی گئی ہے جو ہمارے مذہبی حلقوں کے پیش نظر ہوتے ہیں۔دین کے موضوعات میں تو سب سے زیادہ اہمیت نظام اور نظام کو چلانے کی ہوگی۔دینی نقطہ نگاہ سے تو علوم القرآن میں سب سے زیادہ اہمیت ان علوم کی ہوگی جو اس نظام کو چلانے میں کام آئیں۔ان میں قرآن کا، سیاسی، معاشی، سماجی، تمدنی، عمرانی، سب ہی پہلو آجائیں گے۔جب قرآن کریم نے حکم دیا کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے۔حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو زیب دیتی ہے، اور اس کے نظام کی اطاعت ہی اس کی عبادت ہے اور یہ نظام اولی الامر کی معرفت رواں دواں رہتا ہے، قرآن نے اپنی مختلف آیات میں اس نظام کا نقشہ بھی دے دیا ہے، اس پر تحقیق وتفتیش، اس کو نظام کی حیثیت سے پیش کرنا، اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر، اس میں تبدیلیاں کرنا، علوم القرآن کی فہرست میں اول نمبر پر آتا ہے۔یہاں قرآن کریم کی POLITICAL SCIENCE، مغرب کی پولیٹیکل سائنس سے بالکل الگ ہوجاتی ہے۔جس کا علم حاصل کرنا اول نمبر پر آتا ہے۔ارشاد ہوتا ہے۔ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْۤا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ (9/122) چاہئے یہ کہ ہر جماعت میں سے کچھ لوگ مرکز خداوندی میں آکر، اس نظام کے متعلق پوری پوری سمجھ بوجھ حاصل کریں اور پھر اپنی جماعت کی طرف واپس جاکر انہیں اس سے آگاہ کریں، اس طرح پوری کی پوری قوم اپنے آپ کو غلط باتوں سے محفوظ رکھ سکے گی (اور صحیح نظام کے مطابق چلنے کے قابل ہوجائے گی)(مفہوم القرآن 454 صفحہ) اسی طرح جب قرآن کریم نے فرمایا کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11/6) ترجمہ، اور زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں کہ جس کے رزق کی ذمہ داری ہم پر نہ ہو، پھر مزید ارشاد فرمایا نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (6/151) ترجمہ، ہم تمہیں اور انہیں (تمہاری اولاد کو) رزق دیتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ربوا کو حرام قرار دے دیا۔زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی کا حکم دیا۔ان تمام باتوں سے

واضح ہے کہ قرآن اپنا ایک معاشی نظام عنایت فرما رہا ہے۔ قرآن کا یہ معاشی نظام علوم القرآن میں اہم ترین علم ہے۔ بغیر سود کے معاشی نظام تشکیل دینا اور اس کو عملاً چلانا، علوم القرآن میں سب سے زیادہ اہم علم ہے۔ جو علوم بھی قرآن کے نظام کو جاری کرنے میں ضروری ہوں وہ سب علوم، علوم القرآن میں شامل ہیں۔ ان علوم کے علاوہ نظری طور پر بھی سارے سائنسی علوم حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے انۡظُرُوۡا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ (10/10) ترجمہ، دیکھو تو سہی کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کچھ ہے۔ نیز ملائکہ (فطرت کی قوتوں) کو مسخر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ سارے علوم قرآنی علوم ہیں۔ ان کو علوم القرآن سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔ آج عقل انسانی جہاں تک پہنچ چکی ہے اور قرآن عقل انسانی کو جہاں تک لے جانا چاہتا ہے، اس تک پہنچنے کے لئے جو علوم بھی کام آئیں وہ سارے علوم القرآن میں شامل ہیں۔ اس زمانے کی مشکلات اور وہ مسائل جس سے انسانیت دوچار ہے ان کو قرآن کریم حل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ان کو حل کرنے کے لئے جو بھی علوم کام میں آئیں وہ سب علوم القرآن میں داخل ہیں۔ اصل کام کرنے کا ہی یہ ہے کہ اس قسم کی کتب میں پہلے اس زمانہ کی مشکلات و مسائل کی نشاندہی کی جائے، پھر ان تمام مسائل کا حل قرآن کی روشنی میں پیش کیا جائے۔ اور ان تائید کی قرآنی آیات لازمی دینی چاہئیں، تو ایسی کتب علوم القرآن کہلانے کی مستحق ہوں گی۔

اب کتاب کے مندرجات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کتاب میں 18 یونٹ ہیں اور ہر یونٹ خود مکتفی ہے اور الگ الگ عنوان کا حامل ہے۔ اس کے دوسرے یونٹ کا عنوان "تعارف وحی" ہے۔ اس کو محترم جناب ڈاکٹر ازکیا ہاشمی صاحب نے تحریر کیا ہے اور ایسوسی ایٹ پروفیسر جناب محی الدین ہاشمی صاحب نے اس پر نظر ثانی کی ہے۔ اس یونٹ میں وحی کے لغوی اصطلاحی مفہوم، اقسام وحی، الہام، حضور پر نزول وحی کی مختلف صورتیں بیان کرنے کے بعد صفحہ 78 پر یہ عنوان تحریر ہے۔ "وحی صرف قرآن میں نہیں" اور اس کے ذیل میں عبارت تحریر ہے "منکرین سنّت وحی کو صرف قرآن تک محدود رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک سنّت پر وحی کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے آنحضرت کی ذاتی رائے اور تدبیر و استنباط کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ جب کہ قرآن و سنّت سے اس نقطہ نظر کی تردید ہوتی ہے، درحقیقت آنحضرت پر نازل ہونے والی وحی دو اقسام پر مشتمل ہے۔" اس عنوان

کے بعد دوسرا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے۔

وحی متلو و غیر متلو یا وحی جلی و خفی۔

اس عنوان کے ذیل میں یہ عبارت تحریر کی گئی ہے۔"وحی کی وہ قسم جسے آنحضرت پر خاص الفاظ اور معانی دونوں کے ساتھ اُتارا گیا ہے جو اصول و کلیات پر مشتمل ہے اور قرآن حکیم کی صورت میں اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے اور جس میں معمولی لفظی تغیر بھی ممکن نہیں اسے وحی متلو یا وحی جلی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی تلاوت و قرات کا تاکید اً حکم ہے اور اس پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ دوسری قسم وحی کی وہ ہے جو قرآن حکیم کے اصول و کلیات کی تشریح و توضیح اور شرعی احکامات کی جزوی تفصیل پر مشتمل ہے اس میں مضامین تو من جانب اللہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ کا انتخاب رسول اکرم کا ہوتا ہے۔ جسے وحی غیر متلو یا وحی خفی بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی جس کی تلاوت کا باقاعدہ حکم نہیں دیا گیا اور یہ وحی بھی چاہئے الہام و القاء کے ذریعے حاصل ہو یا نبی کی فہم و فراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو، بہر حال شیطانی تحریکات و اثرات سے مُبرّہ اور غلطی اور خطاء سے یکسر پاک ہوتی ہے اور جس کے وحی ہونے کی سند خود قرآن نے دی ہے" (یہاں اقتباس ختم ہوا)

ہمارے علماء کرام (اور اب ماشاءاللہ پروفیسر صاحبان) کا یہی وہ نظریہ ہے جس کی وجہ سے ہم مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ کیونکہ صرف اس نظریہ کی وجہ سے دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے۔ یہ دلائل کہ وحی صرف قرآن میں ہے اور حدیث وحی نہیں ہے، آگے آتے ہیں پہلے آپ یہ غور فرمائیں کہ حدیث کو وحی بنانے کا عقیدہ کیوں پیدا ہوا، اور علماء کرام کی وہ کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے حدیث کو وحی قرار دے دیا۔ اس کے بعد ہم دیکھیں گے کہ اس خلافِ قرآن عقیدے کے کیا کیا مُضر اثرات ہم پر مرتب ہوئے ہیں۔

حضور نے اللہ کے دیئے ہوئے دین کو عملاً متشکل کر کے دکھایا۔ یہ دین اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ تھا اور حضورؐ نے اس کو عملاً جاری کیا تھا، اس لئے اس کی اطاعت اللہ و رسول دونوں کی اطاعت تھی۔ اللہ و رسول کی اطاعت کا مفہوم ہی یہ تھا کہ خدا کے احکام کی اطاعت اپنے اپنے طور پر نہیں ہوتی تھی بلکہ اس نظام کے ذریعے ہوتی تھی جسے حضور نے قائم فرمایا تھا اللہ تعالیٰ کے احکام قرآن میں جمع تھے اور حضورؐ بہ حیثیت مرکزِ حکومت الٰہیہ، ان احکام

کی اطاعت کراتے تھے۔ اور قرآن کے اصولوں کی جزئیات بھی حالات کے مطابق مقرر فرماتے جاتے تھے۔ یہ نظام صرف حضورؐ کے دور تک کے لئے محدود نہیں تھا۔ اسے آگے چلنا اور بڑھنا بھی تھا۔ چنانچہ حضورؐ کے بعد، خلافت راشدہ کے دور میں حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت، اللہ ورسول کی اطاعت قرار دی گئی تھی۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، جب تک بھی وہ نظام جاری رہا ان حضرات کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ بدقسمتی سے وہ نظام مُتعرض ہوگیا اور خلافت کی جگہ ملوکیت غالب آگئی۔ اس وقت یہ نہایت ہی تکلیف دہ سوال پیدا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت تو قرآن سے ہو جاتی ہے۔ لیکن رسولؐ اللہ کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ اگر مسلمانوں کی قسمت یاوری کرتی تو اس سوال کا جواب نہایت آسان تھا کہ دوبارہ خلافت قائم کرلی جاتی اور اس کے ذریعے پھر رسول کی اطاعت کا سلسلہ جاری کر دیا جاتا۔ لیکن افسوس صد ہزار افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ اور علماء کرام کے ذہن میں اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں تھا کہ اس صورت میں حضورؐ کی اطاعت ان کے ارشادات عالیہ اور اقوال مبارکہ کے ذریعے کی جائے اور ان اقوال کو وحی الٰہی کا درجہ دیا جائے۔ یہ وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے حدیث کو وحی کا درجہ دیا گیا۔ اور اس کے بُرے اثرات اور بُرے نتائج تو بہت ہوئے لیکن ان میں سے دو بُرے اثرات و نتائج ایسے تھے جس نے مسلمانوں کو بالکل تباہ کر دیا۔

پہلا اثر تو یہ ہوا کہ جب احادیث کو وحی الٰہی قرار دے کر، اس کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دے دیا گیا، تو پھر اسلامی نظام کے قیام اور ایک زندہ اتھارٹی سے احکام جاری کرنے کا تصور ہی جاتا رہا۔ اگر رسولؐ اللہ کی اطاعت کا یہ غلط تصور رائج نہ ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی آئندہ دور میں ملوکیت کے خاتمہ پر مسلمان پھر زندہ اتھارٹی قائم کرنے کی کوشش کرتے لیکن جب اطاعت رسول کا تصور ہی بدل گیا، تو نظام کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔ اطاعت رسول کے اس غلط نظریہ کا اثر کس قدر گہرا تھا کہ آپ غور فرمائیں کہ اب بارہ سو سال بعد، ہمارے دور میں ایران میں اسلامی نظام قائم کیا گیا، لیکن نظام قائم ہونے کے باوجود بھی انہوں نے اسلامی نظام کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار نہیں دیا۔ ان کے ہاں انفرادی پرستش کا تصور بجنسہٖ اسی طرح قائم ہے جس طرح غیر اسلامی نظام میں قائم ہوتا ہے۔ اسی لئے ایران کا وہ نظام ناکام ہوا۔ دوسری مثال خود ہمارے ہاں

پاکستان میں ہے۔ ہمارے ہاں بھی جو چند تحریکات اسلامی نظام کے قائم کرنے کے لئے اُٹھی ہیں اور برابر سالہا سال سے اس کام میں مصروف ہیں اور نہایت نیک نیتی سے اپنی ساری عمریں اس میں کھپادی ہیں وہ سب اطاعت رسول احادیث کے ذریعے ہی کرتی ہیں ۔اور احادیث کو وحی بھی مانتی ہیں ۔ اور اطاعت رسول کے لئے زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی ہیں ۔احادیث کو وحی الٰہی قرار دینے کا دوسرا مُہلک اثر قرآن فہمی پر ہوا۔ ہمارے سابقہ مفسرین کرام نے نہایت نیک نیتی سے تفاسیر تحریر فرمائیں ۔لیکن چونکہ سابقہ دور علمی لحاظ سے فروتر تھا، اس لئے وہ تفاسیر اپنے دور کی علمی سطح تک ہی پہنچ پائی تھیں ۔اس موجودہ دور کے تعلیم یافتہ طبقہ کو وہ مطمئن نہیں کرسکتیں ۔لیکن اس میں کوئی اس درجہ نقصان کی بات نہیں تھی ۔ہم سمجھ سکتے تھے کہ سابقہ دور میں مفسرین کی علمی سطح اُسی دور کے مطابق تھی۔ لیکن جس چیز نے قرآن فہمی کے لئے راستہ بند کردیا وہ یہ عقیدہ تھا کہ حضورؐ کے وہ ارشاد گرامی واحادیث جنہوں نے قرآن کی تفسیر کی ہے وہ وحی تھے، اس لئے ان ارشاد گرامی سے صرف نظر نہیں کرسکتے اور آیات قرآنی کی اور کوئی تفسیر نہیں کی جاسکتی ۔اس میں ایک صورت یہ بھی پیدا ہوئی کہ لوگوں نے چند فقرے بنا کر،ان کو حضورؐ کی طرف منسوب کردیا اوراُن موضوعہ فقروں سے قرآن کی تفسیر کی گئی ۔اس عقیدہ سے نہ صرف قرآن فہمی کی راہ مسدود ہوئی بلکہ بیشتر غلط اور خلاف قرآن عقائد نے بھی حضور کی طرف مُنتسب ہوکر مسلمانوں میں مقبولیت حاصل کرلی۔

موقر رسالہ 'صوت الحق' کا موقف جمہور مسلمانوں کے بالکل خلاف ،لیکن قرآن کریم کے مطابق ہے کہ "وحی صرف قرآن میں ہے" اور "خارج از قرآن وحی کا تصور باطل ہے" یہ رسالہ اپنے اس قرآنی موقف پر جم کے کھڑا ہے اور مسلسل اس نظریہ کی اشاعت وترویج کررہا ہے۔ پہلے اس موقف کے چند عقلی دلائل پیش خدمت عالی ہیں ۔اس کے بعد قرآنی دلائل پیش خدمت ہوں گے۔

(1) پہلی بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہمارے علمائے کرام جن کتب احادیث ،مثلاً موطا، صحیحین، صحاح ستہ، کتب اربعہ ،کواحادیث کی کتب شمار کرکے ،ان کو وحی خفی قرار دیتے ہیں۔ یہ کتابیں احادیث کی کتابیں ہی نہیں ہیں۔ یہ تو ساری کُتب روایات ہیں۔ یہ اقوال رسول ہیں ہی نہیں۔ ان کو نطق رسول سے کوئی تعلق ہی نہیں ۔ یہ تو محض اقوال منسوب الی

الرسول ہیں۔ اور یہ سارے اقوال والفاظ راویوں کے اپنے الفاظ میں بیان کردہ ہیں۔ ہمارے علماء کرام خود اس کے قائل ہیں کہ یہ احادیث روایت بالمعنیٰ ہیں۔ یعنی NARRATION ہے۔ یہ حضورؐ کے اپنے الفاظ نہیں ہیں یعنی یہ VERBATIM نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے احادیث کے شروع میں قَالَ رَسُولُ اللّٰہ اور آخر میں اَوکَمَا قَالَ علیہ السّلام لکھا جاتا ہے۔ یعنی حضورؐ نے یوں فرمایا یا جس طرح بھی حضورؐ نے فرمایا ہو۔ اس کی عملی مثال یہ ہے کہ حدیث میں ہے خیر کم من تعلم القرآن ، علیہ۔ تم میں وہ سب سے بہتر شخص ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔ حدیث مبارکہ کا یہ مفہوم ممکن ہے کہ حضورؐ نے خیر کم کی جگہ افضلکم فرمایا ہو۔ کیونکہ راویوں نے محض مفہوم اخذ کر کے اپنے الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ اب آپ غور فرمائیں کہ راویوں کے الفاظ وحی کیسے ہو سکتے ہیں حدیث کے بعد او کما قال رسول اللّٰہ ، کہہ کر علماء کرام خود حدیث کو مشکوک بنا کر ظنی قرار دیتے ہیں۔ وحی ظنی کبھی نہیں ہو سکتی۔ وحی میں ظن وشک کا کیا کام۔ قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ جب ہم کسی آیت کی تلاوت کرتے ہیں تو شروع میں کہتے ہیں قَالَ اللّٰہ تعالیٰ اور آخر میں کہتے ہیں۔ صدق اللّٰہ العظیم ، یہ ہے وحی کی شان کیونکہ قرآن کی تلاوت کے بعد کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اوکما قال اللّٰہ تعالیٰ۔ اس لئے وحی میں شک وشبہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

دوسری قابل غور بات یہ ہے کہ قرآن کریم تو یقیناً سب کے لئے وحی ہے۔ لیکن اگر احادیث بھی وحی ہیں تو رسول اللّٰہ کے ذاتی اقوال کون سے ہیں۔ قرآن نے حضورؐ کی فہم وفراست کی تعریف فرمائی ہے۔ حضورؐ اللّٰہ کی طرف دلائل کے ساتھ بلاتے تھے۔ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ (12/108) میں اور ہر وہ شخص جو میرا اتباع کرتا ہے، اللّٰہ کی طرف دلائل کے ساتھ بلاتے ہیں یہاں دلائل دینے کے PROCESS میں حضورؐ اور عام مومنین ایک ہی سطح پر کھڑے ہیں۔ جس طرح مومنین دلائل دیتے تھے، اسی طرح حضورؐ بھی عقلی دلائل دیتے تھے۔ کیا حضورؐ کے وہ عقلی دلائل وحی ہوتے تھے۔

(3) عام مومنین کو حکم تھا کہ اپنے امور مشاورت سے طے کرو (12/38)، اس عام حکم کے باوجود حضور کو الگ حکم ہوا کہ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3/158) کاموں میں لوگوں سے مشورہ کر لیا کرو۔ اگر حضورؐ کے اقوال وحی خفی تھے تو کیا وحی مشورہ سے نازل ہوتی

تھی۔ کیا وحی میں مشورہ کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

(4) وحی سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن کریم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اگر احادیث وحی خفی ہیں تو ان کی اطاعت سے تو اللہ کی اطاعت ہوگی۔ ان کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ یہ بات قرین عقل وقیاس نہیں ہے کہ وحی کے ایک حصہ سے تو اللہ کی اطاعت ہو اور وحی کے دوسرے حصہ سے رسول اللہ کی اطاعت ہو۔

(5) اگر رسولؐ اللہ کی اطاعت کا ذریعہ احادیث ہے، تو یہ ضروری تھا کہ اُنہیں بھی قرآن کی طرح محفوظ رکھنے کی ذمہ داری اللہ ورسول پر ہوتی ہے۔ کیونکہ اطاعت کے لئے متعین اور یقینی احکام کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ جس طرح حضورؐ نے قرآن کو جمع کرا کے چھوڑا، ضروری تھا کہ وہ احادیث کی حفاظت کا بھی اہتمام کرتے۔ وحی کے ایک حصہ کو محفوظ کرنا، اور دوسرے حصے کو راویوں کی صوابدید پر چھوڑ جانا مناسب نہیں تھا۔ اس طرح تو یہ راوی حضرات شریک کارِ رسالت قرار پاتے ہیں۔

(6) جس طرح ہم وحی الٰہی کے پابند ہیں، آپ بھی اس کے متبع تھے۔ جس طرح ہم اپنے عقلی واختیاری کاموں کے لئے جوابدہ ہیں آپ بھی تھے۔ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (43/144) آیت میں لک کا لفظ خاص طور پر آپ کے لئے اضافہ فرما کر، واضح کردیا کہ آپ بھی مسئولیت سے مستثنیٰ نہیں تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ (7/6)، پھر ضرور ہم باز پرس کریں گے ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے، اور خود رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے۔ انبیاء کرام کے اعمال زیر محاسبہ ہوتے تھے۔ جن کے اعمال واقوال زیر محاسبہ ہوں بھلا وہ وحی کیسے ہوسکتے ہیں۔

(7) آپ کو حکم تھا کہ کسی کام کے کل کرنے کا وعدہ بغیر انشاء اللہ کہنے کے نہ کریں (18/23,24) آپ کو یہ معلوم نہیں تھا کہ کل کو کیا ہوگا (46/9)، آپ کو شیطانی نزع کے وقت اعوذ باللہ کہنے کا حکم تھا (7/200) آپ شیطانی اکساہٹوں سے پناہ مانگا کرتے تھے (23/97) آپ کو یہ بھی حکم تھا کہ اپنے گناہ کی بخشش مانگ (48/55) آپ غور فرمائیں کہ کیا یہ باتیں وحی ہوسکتی ہیں۔ یقیناً آپ کی ایسی سب باتیں وحی کے بغیر تھیں۔ یہاں تک

حدیث کے وحی نہ ہونے کے عقلی دلائل پیش خدمت عالی کیے گئے ہیں۔ اب چند قرآنی دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

(1) ہمارے علمائے کرام حدیث کو وحی خفی کہتے ہیں۔ لیکن قرآن کی رُو سے یہ نام ہی غلط ہے کیونکہ وحی خفی ہو ہی نہیں سکتی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (5/67)، اے رسول جو کچھ تم پر پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کو پہنچادو۔ وحی تو پوری انسانیت کی ملکیت ہوتی ہے۔ وحی کا نزول اگر چلتی تلواروں میں بھی ہو، تو رسول کا فرض تھا کہ وہ اسے فوراً انسانیت کو پہنچادے وحی تو BY DEFINITION خفی ہو ہی نہیں سکتی۔

(2) یہی صورت وحی غیر متلو کے نام کی ہے۔ ہمارے علمائے کرام حدیث کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ حالانکہ وحی غیر متلو نہیں ہوسکتی۔ وحی ساری کی ساری متلو ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ (13/33) اے رسول ہم نے تمہیں اسی طرح ایک امت میں بھیجا ہے جیسے پہلے اور بہت سی امتیں گذر چکی ہیں تاکہ تم ان کے سامنے اس کی تلاوت کرو جو تم پر وحی کی گئی ہے۔ اس آیہ کریمہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ مُطلق ما یوحی وحی ہے جس کی تلاوت حضورؐ فرمایا کرتے تھے۔

(3) مایوحیٰ اور قرآن ایک ہی چیز ہے۔ وَ اتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ (18/27) جو کتاب تمہارے پروردگار کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوئی ہے اس کو پڑھا کرو اس کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا وَلَهٗ كُلُّ شَيْءٍ وَّ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَ اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (27/92) مجھے تو بس یہی حکم دیا گیا ہے کہ میں اس شہر کے مالک کی عبادت کروں، جس نے اسے عزت وحرمت دی اور ہر چیز اسی کی ہے اور مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ میں اس کا فرمانبردار رہوں اور یہ کہ میں قرآن پڑھا کروں۔

پہلی آیت میں مـا اوحـی کی تلاوت کا حکم ہے اور دوسری آیت میں قرآن کی تلاوت کا حکم ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ ما اوحیٰ اور قرآن ایک چیز ہے اور دونوں الفاظ ایک

دوسرے کے متبادل استعمال کیے گئے ہیں۔ "وحی صرف قرآن میں ہے" کے موضوع پر متعدد مضامین رسالہ صوت الحق میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن صاحب کو مزید قرآنی دلائل درکار ہوں وہ اسی رسالہ کی طرف رجوع فرمائیں یا کتاب موسومہ "قرآن فہمی کے قرآنی دلائل" ملاحظہ فرمائیں۔ "علوم القرآن" سے تحریر کردہ اقتباس آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہے۔ اس میں آپ ان دو فقروں کو دوبارہ ملاحظہ فرمائیں۔ تحریر کیا گیا ہے۔

(1) "دوسری قسم کی وحی وہ ہے کہ......اس میں مضامین تو من جانب اللہ ہوتے ہیں جب کہ الفاظ کا انتخاب رسول اکرم کا ہوتا ہے جسے وحی غیر متلو یا وحی خفی بھی کیا گیا ہے۔"

(2) "یہ وحی بھی چاہیئے الہام والقاء کے ذریعے ہو یا نبی کی فہم و فراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو" (صفحہ 78)

پہلے فقرہ میں وحی خفی اور وحی غیر متلو کے متعلق تبصرہ پیش کیا جا چکا ہے کہ قرآن کی رُو سے یہ اصطلاحیں ہی بالکل غلط ہیں۔ اس فقرہ میں دوسری بات اس وحی کے متعلق یہ تحریر ہے کہ اس وحی میں مضمون تو حضورؐ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا تھا۔ حضورؐ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان کر دیتے تھے۔ علماء کرام کا یہ نظریہ سابقہ دور میں تو رائج ہو سکتا تھا لیکن اب یہ نظریہ علمی حلقوں میں بالکل مسترد کیا جا چکا ہے اب سائیکولوجی اور فلولوجی PHILOLOGY نے اس درجہ ترقی کر لی ہے کہ وہ اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے کہ انسان کے ذہن میں کوئی تصور CONCEPT بغیر لفظ WORD کے آسکے۔ تصور اور لفظ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اس لئے وحی بلا الفاظ، کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

دوسرا فقرہ جو تحریر ہے کہ یہ وحی چاہیئے الہام والقاء کے ذریعے حاصل ہو یا نبی کی فہم وفراست اور اجتہاد کا نتیجہ ہو"، اس سلسلہ میں عرض ہے کہ الہام کے متعلق ایک مضمون رسالہ 'صوت الحق' میں گذشتہ ماہ طبع ہو چکا ہے۔ اس موضوع پر دوبارہ تحریر کرنا تضیع اوقات ہے البتہ وحی میں نبی کی فہم و فراست کے دخل کے متعلق جو تحریر کیا گیا ہے اس پر حیرانی بھی ہوتی ہے اور یہ بات ہماری سمجھ سے بھی بالاتر ہے۔ اس طرح کا فقرہ کس طرح طبع ہو گیا ہے۔ وحی میں تو نبی کی فراست و جذبات کا کوئی دخل ہی نہیں ہوتا۔ یہ نظریہ تو قرآن کے بالکل خلاف ہے اور اس درجہ خلاف قرآن ہے، کہ اس پر کچھ تحریر کرنے کی ضرورت ہی

معلوم نہیں ہوتی، صفحات 153، 154 میں جو حفاظ کے والدین اور رشتہ داروں کے متعلق لکھا گیا ہے کہ ان کو بہت اعزاز ملے گا یہ قرآن کے خلاف ہے۔

صفحہ 160 پر مرقوم ہے کہ جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں اُن کی تعداد صرف 4 ہے ۔یہ نظریہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔قرآن کی رُو سے تمام انبیاء اور رسولوں کو کتابیں ملی ہیں ۔(57/25،2/213) ''نوح علیہ کے زمانے سے قبل حضرت ادریس اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر تھے جن کو علوم ہدایت کے علاوہ بطور معجزہ علم نجوم اور رمل بھی دیا گیا تھا'' (P232) یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ انبیاء کرام کو صرف کتاب دی جاتی تھی جو ان کی وحی ہوتی تھی صفحہ 246 پر رقم ہے'' کفار ہمیشہ عذاب جہنم میں رہیں گے اور فاسق وفجار انبیاء کی شفاعت سے نجات پاسکیں گے''۔یہ عقیدہ بالکل خلاف قرآن ہے۔یہ جو ہمارے معاشرے میں جس درجہ مذہب کا غلبہ ہو رہا ہے، اسی نسبت سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔اس کی وجہ بھی شفاعت کا عقیدہ ہے۔مذہب کے غلبہ کی وجہ سے شفاعت کے عقیدہ کو مزید استحکام ملتا ہے اور وہ بے دریغ جرائم کرتا ہے۔کیونکہ اس کو بھروسہ ہوتا ہے کہ اس کی شفاعت کرادی جائے گی قرآن کریم سے شفاعت کے عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی ۔ہر شخص کے اپنے اعمال ہی کام آئیں گے اس موضوع پر مزید مواد رسالہ صوت الحق سے حاصل کریں۔

کتاب کے صفحہ 246 سے ایک مختصر سا باب شروع ہوتا ہے اس کا عنوان'' آغاز نزول قرآن (غار حرا کا واقعہ)'' ہے۔اس پانچ صفحے کے باب میں وہ تمام روایات مندرج ہیں جو ہماری تاریخ اور عام کتب میں درج ہیں کہ حضورؐ اپنا بیشتر وقت غار حرا میں عبادت الٰہی میں گذار دیتے تھے۔پھر جرائیل نے آکر اقرا باسم ربك والی آیت پڑھنے پر اصرار کیا۔حضورؐ نے اس کے پڑھنے سے معذوری ظاہر کی۔اس واقعہ سے حضورؐ پر خوف طاری ہوا۔اور حضرت خدیجہؓ انہیں اپنے COUSIN ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔یہ واقعات بہت مشہور ہیں اور بغیر چھان بین کے اس کتاب میں درج کردیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم سے عناد رکھنے والے مستشرقین اور ہمارے لبرل حضرات اس واقعہ سے دو نتائج اخذ کرتے ہیں۔ایک تو یہ کہ معاذ اللہ حضورؐ کو وحی نہیں آئی تھی بلکہ آپ کو HALLUCINATIONS ہوتے تھے اور ورقہ بن نوفل نے حضورؐ کو اس لائن پر ڈال دیا۔دوسرے جو کیفیت نزول وحی کی بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ پر کپکپی طاری ہوتی تھی اور دہن مبارک سے

جھاگ برآمد ہوتے ہیں تو یہ مرگی EP کی علامات ہیں۔ اس سے مخالفین اسلام یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ نعوذ باللہ آپ کو مرگی کا مرض تھا اور اس وجہ سے ان کی یہ حالت ہوتی تھی۔ غار حرا کا واقعہ بالکل ایجاد بندہ ہے اور یہ سب ہفوات صرف تصوف کی تائید کی وجہ سے وضع کی گئی ہیں۔ ایک اس کے بعد دو باب نزول قرآن اور اسباب نزول قرآن سے متعلق ہیں ان ابواب پر تبصرہ پورے ایک مضمون کا متقاضی ہے۔ اس لئے ان ابواب پر تبصرہ اگلے مضمون میں آئندہ کے شمارے میں پیش کیا جائے گا۔ **وبیدہ التوفیق وعلیہ التکلان ۔**

مضمون کے آخر میں یہ رسالہ نہایت عاجزی و فروتنی سے عرض گذار ہے کہ اس تبصرہ سے خدانخواستہ کسی کی تنقیص و تخفیف ہرگز ہرگز مقصود نہیں ہے لیکن چونکہ یہ رسالہ اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے کہ جہاں کہیں بھی خلاف قرآن نظریات کی اشاعت ہو رہی ہو، یہ رسالہ اپنا محاکمہ اور قرآن کریم کا موقف پیش کرے۔ جہاں تک اس موجودہ تبصرہ کا تعلق ہے تو یہ کتاب بہت اہمیت کی حامل ہے اور اس سے خلاف قرآن نظریات کی اشاعت و ترویج کا زیادہ امکان نظر آتا ہے۔ اس لئے اس کتاب پر بلا لومۃ لائم تبصرہ کرنا اور بھی زیادہ ضروری تھا۔

نکل جاتی ہے سچی بات جس کے مُنہ سے مستی میں   مصلحت بین سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ماہنامہ صوت الحق

قارئین صوت الحق کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ پاکستان میں بے شمار رسالوں کی موجودگی کے باوجود صوت الحق وہ واحد رسالہ ہے جو خالص قرآنی تعلیم کا داعی ہے۔ ورنہ تو پاکستان میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ اس رسالہ کی اشاعت بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے عوام قرآنی تعلیم کے کس درجہ بھوکے ہیں۔ اس رسالہ کا تعلق کسی فرقہ، کسی گروہ، کسی سیاسی پارٹی، یا تصوف کے کسی سلسلہ یا زاویہ سے نہیں۔ اس کا کام خالص قرآنی روشنی میں موجودہ معاملات پر محاکمہ کرنا ہے۔ اور صرف اللہ تعالیٰ کی روشن کتاب اس کے لئے حجت ہے۔ ہماری حد درجہ کوشش ہوتی ہے کہ کوئی بات کسی کے ناگوار خاطر نہ ہو۔ پتہ ہے: B-429 سیکٹر 11/A نارتھ کراچی۔ فون- 36949331 021 - 2070277 Mob-0323

محترم جناب پرویز صاحب (مرحوم) پر ایک سنگین افتراء

موقر ماہنامہ 'صوت الحق' بابت جون 2007ء میں محترمہ جناب نعیم فاطمہ علوی صاحبہ کا ایک گرامی نامہ طبع ہوا ہے جس میں انہوں نے میرے ایک مضمون "تحریک طلوع اسلام کا تعارف" کو سراہا ہے جس کے لئے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ انہوں نے ایک محفل میلاد میں شرکت کرنے کا واقعہ بھی تحریر فرمایا ہے اور اس موقع پر جو اعتراض ان کے سامنے کیا گیا ہے اس اعتراض کا جواب انہوں نے مجھ سے طلب فرمایا ہے، جس کے لئے میں مزید ان کا شکر گزار ہوں۔ محترمہ موصوفہ کا واقعہ ان کے اپنے الفاظ میں تحریر ہے۔

(محفل میلاد سے) "وہ اٹھ کر چلی گئی تو الھدیٰ کی دوسری خاتون آ کر بیٹھ گئیں۔ اُس نے بتایا کہ میں نے پرویز صاحب کو بہت پڑھا ہے۔ ان کی باتیں دل کو لگتی ہیں، مگر ایک بار میں نے طلوع اسلام میں کسی کا سوال پڑھا کہ کیا سور حلال ہے تو اس کا جواب پرویز صاحب نے دیا کہ اگر سور کو گھریلو جانور کی طرح پالا ہو تو اس کا گوشت حلال ہے۔ میں اس سوال کا جواب تفصیلی طور پر خواجہ ازہر عباس سے چاہوں گی۔ امید ہے کہ مایوس نہیں کریں گے۔" اس واقعہ/اعتراض پر تبصرہ کرنے اور اس کا جواب عرض کرنے سے پیشتر تمہیداً چند گذارشات پیش خدمتِ عالی ہیں۔

ہم مسلمانوں کی بدقسمتی ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے چند وجوہات کی بناء پر قرآن کریم ہمارے سامنے نہیں رہا اور ہم اس کی فکر سے آہستہ آہستہ دور سے دور تر ہوتے ہی چلے گئے۔ اس کے بعد شدہ شدہ، فرداً فرداً کچھ آوازیں قرآنی فکر کی بلند ہوتی رہیں مگر وہ آوازیں بھی کبھی خالص قرآنی نہیں ہوئیں۔ متقدمین ہمارے ہاں معتزلہ کا ایک فرقہ اُٹھا جو بڑے بڑے مفکرین، اہل علم و دانش پر مشتمل تھا۔ اُنہوں نے قرآن کی آواز بلند کی۔ ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ ان سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے اپنے وقت کی حکومت کی سرپرستی قبول کر لی۔ جس سے وقتی طور پر تو انہیں بڑا فائدہ ہوا، اور عروج و اقتدار حاصل ہو گیا لیکن IN THE LONGRUN، یہ پالیسی ان کے لئے نہایت تباہ کن ثابت ہوئی اور

اس حکومت کے زوال اور تبدیلی کے بعد، اُنہیں بھی زوال آیا۔ یہاں تک کہ ان مفکرین کو ذاتی مصائب و تکالیف کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اور ان کا لٹریچر بھی سب تباہ کر دیا گیا۔ اب معتزلہ کا براہ راست کوئی لٹریچر نہیں ملتا۔ البتہ ان کے نظریات کی تردید کرنے میں مکتبہ فکر اشاعرہ و محدثین نے جو اُن کے نظریات کے حوالے دیئے ہیں، اس سے ان کے عقائد کا علم ہوتا ہے۔ لیکن جو کچھ بھی معلومات ان کے عقائد کی دستیاب ہوتی ہیں، اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ معتزلہ کی فکری پیشنگ قرآن کے بہت قریب تھی۔ لیکن خالص قرآنی فکر ان کی بھی نہیں تھی۔ معتزلہ کے منقرض ہو جانے کے بعد، وقفے وقفے کے ساتھ، ایسے علماء پیدا ہوتے رہے، جنہوں نے رجعت الی القرآن کی۔ اور قرآن کریم کے بہت قریب تر آتے رہے۔ ماضی قریب میں مصر میں علامہ جمال الدین افغانی کے زیر اثر مفتی محمد عبدہ اور رشید رضا مرحوم، دیگر علماء کی نسبت قرآن کے زیادہ قریب رہے۔ ہمارے برصغیر میں سر سید احمد خان کے دور سے قرآن کی آواز بلند ہونا شروع ہوئی، علامہ اقبال نے قرآنی فکر کو عام کیا۔ ان کے ساتھ ساتھ فرقہ اہل قرآن کے بانی مولوی محمد عبد اللہ مرحوم نے لاہور سے، اور امت مسلمہ نے امرتسر سے قرآن کی آواز بلند کی۔ اس دور میں خالص قرآنی فکر پر مبنی تفاسیر بھی طبع ہونے لگیں، یہ سب حضرات قرآنی فکر کے داعی تھے۔ اور بہتر سے بہتر شہ پارے پیش کر رہے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کے ہاں بھی دین کا کوئی تصور نہیں تھا۔ محترم پرویز صاحب اور ان کی تحریک طلوع اسلام، خلافت راشدہ کے بعد سے اس دور تک پہلی اور منفرد آواز ہے جس نے قرآن خالص کے علاوہ دین کی طرف دعوت دی۔ اس سے پیشتر کسی نے دین کی دعوت نہیں دی۔ یہ بات کہ خلافت راشدہ سے لے کر آج تک کسی نے دین کی دعوت نہیں دی۔ میں اس سے پیشتر بھی دو تین مرتبہ تحریر کر چکا ہوں جس پر چند قرآنی مفکر کو اشکال و اعتراض ہوا۔ لیکن میرے خیال کی تائید اس لئے ہوتی ہے کہ دین میں انفرادی عبادت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ لیکن ہمارے ہاں انفرادی خلافت راشدہ کے فوری بعد سے چلی آرہی ہے۔ اگر درمیان میں کوئی دین کی دعوت دیتا، تو وہ انفرادی عبادت کو ضرور چیلنج کرتا اور انفرادی صلوٰۃ (نماز) کا تسلسل و تواتر خلافت راشدہ سے نہ دیتا۔ چودہ سو سال میں یہ پہلا موقع ہے کہ محترم التھام، مفکر قرآن جناب عزیز اللہ بوہیو نے انفرادی صلوٰۃ (نماز) کی تردید میں چند کتب تحریر فرمائی ہیں۔ ورنہ ایسی کتابیں سابقہ سادے لٹریچر

میں کہیں نہیں ہیں۔ بدقسمتی سے ہم مسلمانوں میں یہ دستور بھی رہا ہے کہ جس نے بھی قرآن کی طرف دعوت دی، اسی کو علماء کرام نے مطعون کیا۔ اور طرح طرح کے الزام لگائے۔ آپ اس اصول کو پیش نظر رکھیں کہ جو عالم یا جو تحریک قرآن کے جس قدر قریب ہوگی، اسی قدر اس کی مخالفت بھی شدید ہوگی۔ اس اصول کے مطابق آپ ملاحظہ فرمائیں کہ خود رسول اللہ سے لے کر جو قرآن کریم کے اولین داعی تھے پرویز صاحب تک، کہ جو اس زمانہ میں قرآن کے داعی تھے، جس نے بھی قرآن کی دعوت دی، اس پر ضرور کفر کے فتوے لگے۔

طلوع اسلام کی مخالفت میں سب سے پہلے اس پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ انکارِ حدیث کا ہے۔ ہر چند کہ طلوع اسلام اس کی تردید کرتا رہا۔ یہاں تک کہ رسالہ کے TITLE PAGE پر حدیث تحریر کی جاتی تھی۔ اس کی سالانہ کنونشن میں حدیث کے BANNER آویزاں کئے جاتے تھے، لیکن ہمارے محترم علماء کرام اس پر یہ اعتراض کرتے ہی رہے۔

اس کے علاوہ طلوع اسلام پر یہ اعتراض بھی تھا کہ چونکہ طلوع اسلام مرکز ملت کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک ہر فاسق و فاجر، کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے اگر وہ فاسق سربراہ حکومت ہو جائے اس اعتراض کی تردید میں طلوع اسلام میں اس سے بہت عرصہ پیشتر 1961ء میں ہی ایک مفصل مضمون طبع ہوا اور اس اعتراض کی تردید کرتے ہوئے تحریر کیا گیا" امید ہے اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ مرکز ملت، سے ہماری مراد اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاج نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے ہم اس حقیقت کو اس سے قبل کئی بار طلوع اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ جو حضرات ہماری مخالفت کرتے ہیں ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ہاں طلوع اسلام جاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر نہیں کہ مرکز ملت سے ہماری مراد کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ طلوع اسلام کے نزدیک ہر فاسق و فاجر کی اطاعت (معاذ اللہ معاذ اللہ) "خدا اور رسول" کی اطاعت ہے۔ آپ ہی فرمائیے ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔" اس پوری تصریح کے باوجود طلوع اسلام کے خلاف یہ اعتراض جاری رہا۔

عرصہ ہوا کہ گول باغ، لاہور میں اردو زبان میں نماز پڑھائی گئی جس پر بہت

ہنگامہ ہوا، اس کے پس پردہ کون حضرات تھے اور ان کے MOTIVES کیا تھے، اس وقت اکثر لوگوں کو معلوم تھا۔ لیکن اس کے باوجود مخالفین نے عمداً، دانستہ طور پر طلوع اسلام کو اس میں ملوث کرنے کی کوشش کی، ماہنامہ طلوع اسلام بابت جون 1957ء میں اس کی پُر زور تردید شائع کی گئی ۔لیکن اس کے باوجود یہ پروپیگنڈا جاری رہا کہ پرویز صاحب نماز اردو میں پڑھنا جائز سمجھتے ہیں۔

اس قسم کے سوقیانہ اعتراضات طلوع اسلام پر برابر وارد ہوتے رہے یہاں تک کہ 1962ء میں پرویز صاحب کے خلاف ایک ہزار "علماء کرام" نے کفر کا فتویٰ صادر فرمایا ۔اس فتوی کے بڑے بڑے اشتہارہ مندر میں دیواروں پر چسپاں کیے گئے ۔ لاہور سیکریٹریٹ کی دیواروں پر خصوصاً یہ اشتہار بہت نمایاں جگہ لگائے گئے تا کہ سیکریٹریٹ کے سٹاف کے لوگ ان کو بخوبی پڑھ سکیں۔ جو حضرات اب طلوع اسلام کے حلقہ سے وابستہ ہیں انہیں اس بات کا اندازہ نہیں ہوسکتا کہ وہ کس درجہ آزمائش کا دور تھا لیکن پرویز صاحب بالکل مطمئن اور COMPOSED تھے، انہوں نے کسی کے خلاف کوئی گفتگو نہیں کی۔سب کچھ نہایت تحمل سے برداشت کیا۔لیکن ان تمام پریشانیوں کے باوجود میرا خیال ہے کہ مولوی محمد عبداللہ صاحب، مولوی حشمت علی دہلوی کا دور اس سے بھی زیادہ صبر آزما دور تھا۔ انہیں تین مرتبہ زہر دیا گیا جس سے جسم کا ایک حصہ بالکل مفلوج ہو گیا تھا۔لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ طلوع اسلام نے قرآن کریم کی جو خدمت کی، اس کی طرف مخالفین کی توجہ بالکل نہیں جاتی۔

قیام پاکستان کی جدوجہد میں جو کردار طلوع اسلام نے ادا کیا وہ کسی سے مخفی نہیں ۔سب علماء قیام پاکستان کے مخالف تھے۔طلوع اسلام نے ان سے جو لمبی لڑائی لڑی دو قومی نظریہ کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا اور علماء کرام کے اعتراضات کا مسلسل جواب دیتا رہا۔یہاں تک کہ طلوع اسلام کے جوابات سے متاثر ہو کر علمائے کرام نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کرنی شروع کردی اور چند معروف علماء کرام نے پاکستان کے قیام کی کوششوں میں عملاً بھی حصہ لیا۔

ختم نبوت کا مسئلہ ایک سو سال سے بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح مسلسل سوہان روح بنا ہوا تھا۔مسلمانوں کے اپنے غلط اور خلاف قرآن نظریات ہونے کی وجہ سے ،ہمارے علماء کرام، احمدی علماء کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اور ہر بار انہیں ہزیمت ہوتی تھی،

طلوع اسلام نے کہ جو خالص فکر کا داعی ہے، مسئلہ ختم نبوت کا خالص قرآنی فکر میں جائزہ لیا ، قرآنی فکر کے سامنے، احمدیت، تصوف، تشیع، "پائے چوبین" کی مانند ہیں، یہ تنکوں کے پل بنا کر، اس پر سے ہاتھی گزارنے کے عادی ہیں بھلا کہاں ان مسالک کی تاریکیاں اور کہاں قرآنی فکر کی تابندگی، طلوع اسلام کی قرآنی فکر کے عام ہونے سے کم سے کم پاکستان میں احمدیت کی تبلیغ بالکل رُک گئی۔ البتہ پاکستان کے باہر ان کی تبلیغ جاری ہے۔ "احمدی تحریک اور ختم نبوت"، نام کی کتاب نے احمدیت کو بالکل ننگا کر کے رکھ دیا۔ کمیونزم کے خلاف خود مغرب میں اتنا گہرا و عمیق لٹریچر تحریر نہیں کیا گیا جو یہاں پاکستان میں بیٹھ کر پرویز صاحب نے تحریر کیا۔ راقم سطور کو خود کمیونزم کے لٹریچر سے بڑی دلچسپی تھی اور حتی الوسع اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اس سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پرویز صاحب نے اس کی علمی سطح پر تردید کی، وہ خود یورپ میں بھی نہیں ہوئی۔ افسوس کہ ان کی کتابیں اور سب مضامین اردو زبان میں تھے، اور مغربی مفکرین ودانشوروں تک وہ لٹریچر نہیں پہنچ سکا۔ اگر یہ لٹریچر انگریزی زبان میں ہوتا تو یقیناً وہاں کے مفکرین اس کو سراہتے اور اس سے فائدہ بھی اٹھاتے۔

یہاں پرویز صاحب کی دینی و قرآنی خدمات کو شمار کرانا مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ نکتہ پیش خدمت عالی کرنا ہے کہ پرویز صاحب یا دوسرے الفاظ میں تحریک طلوع اسلام کی خدمات کو ہمارے علماء کرام نے بالکل نظر انداز کر دیا اور طرح طرح کے بے بنیاد اعتراضات وارد کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس تمہید کے بعد، اصل اعتراض کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ ہر مومن کا فریضہ ہے کہ جو خبر بھی سنے اس کی ضرور تصدیق کرے (کہ یہ خبر درست ہے یا نہیں) ایسی صورت میں کہ جب ان خاتون کو یہ شبہ ہوا تھا کہ پرویز صاحب سور کے گوشت کو حلال سمجھتے ہیں تو وہ اس بات کی طلوع اسلام کے لٹریچر میں تحقیق کرتیں کہ یہ بات درست ہے یا نہیں۔ جس طرح مبہم VAGYE اشارہ انہوں نے تحریر فرمایا " کہ ایک بار میں نے طلوع اسلام میں کسی کا سوال پڑھا، کہ کیا سور حلال ہے، تو اس کا جواب پرویز صاحب نے دیا"، یہ اشارہ کوئی سنجیدہ کوشش قرآن تک پہنچنے کی نہیں ہے۔ ہم نے بھی طلوع اسلام کا سارا لٹریچر بالا پڑھا ہے۔ یہ فقرہ کسی جگہ نظر سے نہیں گزرا۔

یہ صرف بہتان ہے۔ اس فقرہ پر تبصرہ کرنا بھی صرف اس وقت ضروری تھا جب موصوفہ خاتون طلوع اسلام کے کسی پرچہ کا، یا پھر پرویز صاحب کی کسی کتاب کا حوالہ تحریر فرماتیں لیکن وہ خود اس بارے میں بالکل مشکوک ہیں۔ تو اس پر تبصرہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاہم عام قارئین کرام کی معلومات کے لئے تحریر ہے کہ یہ بات کہ پرویز صاحب پالتو سور کے گوشت کو حلال سمجھتے تھے ان پر بالکل بہتان وافتراء ہے اور ان پر بے بنیاد الزام ہے۔ وہ سور کے گوشت کو قطعاً حرام سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ 621 پر تحریر فرمایا ہے "قرآن کریم میں لحم خنزیر کا شمار حرام اشیاء کی فہرست میں ہوا ہے۔ نیز انہوں نے اسی آیہ کریمہ (2/173) کے ذیل میں مفہوم القرآن میں تحریر کیا ہے "اب یہ سن لو کہ خدا نے حرام کس کس چیز کو قرار دیا ہے۔ مُردار، بیٹھا ہوا خون، خنزیر کا گوشت، اور ہر وہ شے جسے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دیا جائے۔ مفہوم القرآن صفحہ 62"

نعیم فاطمہ علوی اور دیگر حضرات سے گذارش ہے کہ وہ اس بات کا خاص خیال رکھیں کہ پرویز صاحب اور ان کی تحریک، تحریک طلوع اسلام کے خلاف قرآنی فکر کے مخالفین طرح طرح کے اعتراضات وارد کرتے رہتے ہیں۔ اس کا بہترین علاج یہی ہے کہ آپ خود ان کا لٹریچر بغور مطالعہ فرمائیں۔ مزید درخواست ہے کہ آج کل پاکستان میں بے شمار ماہنامے اور رسالے طبع ہوتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند ادبی ہیں، باقی زیادہ تر رسالے مذہبی ہوتے ہیں۔ لیکن قرآنی فکر کے حوالے سے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ سارے پاکستان میں صرف رسالہ 'صوت الحق' 'طلوع اسلام' اور 'بلاغ القرآن'، یہ تین رسالے خالص قرآنی فکر کے حامل ہیں۔ اور یہ صرف قرآنی حلقوں میں ہی پڑھے جاتے ہیں۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ ان تینوں رسالوں کو خود بھی ہمیشہ پڑھتے رہیں، اور حد درجہ ان کا حلقہ وسیع تر کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ ہمارے پاس یہی ذریعہ قرآنی فکر کو عام کرنے کا ہے۔

0000000000000000 0000000000000000 0000000000

تیری آواز مکّے اور مدینے

انسانی دنیا میں بعض سوالات ایسے حیران کن ہوتے ہیں کہ ان کا جواب فراہم کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس میں سے ایک حیران کن سوال یہ ہے کہ اگرچہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی اسے اس دنیا میں عروج واقتدار خود حاصل ہو جائے گا۔ وہ خیر امت کے منصب اور مرتبے پر بھی فائز ہو گی لیکن اس دعوے کے باوجود مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ وہ آج دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل قوم شمار ہوتی ہے۔ قرآن کریم کی موجودگی کے باوجود کسی قوم کا ذلیل ومقہور ہونا ایک تعجب انگیز بات معلوم ہوتی ہے۔

اس سوال کے جواب کی تلاش میں قرآنی طلباء کو جو دشواری پیش آتی رہی ہے۔ وہ سابقہ تفاسیر کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ خصوصاً غلبہ واقتدار کے متعلق جو آیات توضیح وتفسیر میں مفسرین کرام تقریباً سب ہی بالکل بے بس معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ نے تو غلبہ واقتدار سے متعلق آیات کو آخرت سے متعلق کر دیا۔ کچھ حضرات نے ان کو حضورؐ کے دور ہمایونی تک محدود کر دیا۔ اور کچھ مفسرین نے اس غلبہ کو عرب کے خطہ کے غلبے سے مراد لیا ہے۔ لیکن حق بات یہ ہے کہ تمام مفسرین کی کوششوں کے باوجود بات بنتی نظر نہیں آتی کیونکہ مفسرین نہ تو قرآن کریم کے دعاوی کو غلط اور بے بنیاد قرار دے سکتے ہیں، اور نہ ہی مسلمانوں کی موجودہ پستی کی حالت سے اغماز کر سکتے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہی ہے کہ یہ سب حضرات ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ ہم مسلمانوں میں ڈیڑھ ہزار سال میں ہزاروں علماء اور بہت قلیل تعداد میں مفکرین پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں چند مخلص مفکرین نے اصلاح احوال کی کوشش بھی کی۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، ابن قیم، عبدالوھاب نجدی۔ برصغیر میں قدماء میں مجدد الف ثانی، متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور ان کا خانوادہ سب نے ہی اپنے تئیں مسلمانوں کی کشتی کو گرداب بلا سے نکالنے کی کوشش کی لیکن سب کی کوشش بے سود ثابت ہوئیں۔ ان سب حضرات کی کوشش وجود دھر میں ایک ہی سمت میں رہیں، اور سمت کی تعین کی غلطی سب حضرات نے کی۔ ہمارا یہ دور اس معاملہ میں خوش قسمت ہے کہ اس دور

میں مسلمانوں میں اصلاح احوال کی جو کوشش ہو رہی ہیں ان کی سمت کا تعین درست کیا گیا ہے۔ کچھ تو انسانیت خود بہ حیثیت مجموعی باطنی اضطراب میں مبتلا ہے کچھ یہ کہ مسلمان بالکل ہی پستی کو چھو چکے ہیں۔ ان حالات نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ قرآن خالص کی طرف رخ کریں۔ کہ خود قرآن کا بھی یہی دعویٰ ہے کہ رَبِّكَ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (18/27) اس (قرآن) کی باتوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ اور تم اس کے سوا کہیں بھی پناہ گاہ نہ پاؤ گے۔

پاکستان میں موجودہ حالت کے تقاضے کا جواب سب سے پہلے تحریک طلوع اسلام نے دیا اس نے مسلمانوں کو تنزل و پستی سے نکال کر عروج و اقتدار حاصل کرنے اور خیر امت کا منصب حاصل کرنے کا طریقہ خود قرآن کریم سے ہی متعین کیا۔ ہزار بارہ سو سال کے عرصہ دراز میں تحریک طلوع اسلام وہ پہلی تحریک ہے جس نے مسلمانوں کو آگاہ کیا کہ اس دنیا میں خیر امت ہونے کا واحد طریقہ خالص قرآن کریم کو پیش نگاہ رکھنا اور اس کا نظام قائم کرنا ہے۔ اس تحریک نے نہایت بلند و اشگاف الفاظ میں بلا لومۃ لائم، اعلان کیا کہ مسلمان جب تک حدیث و فقہ کو دین کا جزو شمار کرتے رہے گے۔ وہ نہ تو اس دنیا میں قرآن کا نظام قائم کر سکیں گے اور نہ ہی کبھی خیر امت کے منصب پر فائز ہو سکیں گے۔ حدیث اور سابقہ ملوکیت کے دور کا مدون کردہ فقہ یہ دو رکاوٹیں ایسی ہیں کہ جن کی موجودگی میں مسلمان لاکھ جتن کر لیں اس کے باوجود وہ گرداب بلا سے باہر نہیں نکل سکتے۔

یہ خالص قرآنی نظریات آج ساری دنیا میں کسی ملک میں بھی مسلمانوں میں نہیں پائے جاتے۔ ایران میں انقلاب کے دوران قرآن کریم پر شیعہ علماء نے بہت کام کیا۔ وہاں غیر علماء کے طبقے نے بھی کام کیا۔ جن میں ڈاکٹر علی شریعتی سر فہرست تھے۔ وہاں ایک گروہ آیت اللہ صادقی کا بھی تھا، جو اہل قرآن شمار ہوتے تھے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بھی نظریات خالص قرآنی نہیں تھے۔ ترکی میں حالات کے پیش نظر بہت لٹریچر طبع ہو رہا ہے۔ یحییٰ ہارون وہاں کے بہت بڑے سکالر ہیں، ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ سوڈان میں عالمی شہرت کے حامل خود ڈاکٹر حسن ترابی بہت بڑے Statore کے عالم ہیں۔ مگر خالص قرآنی نظریات آپ کو کہیں نہیں ملیں گے۔

راقم سطور طویل عرصہ سے ادارہ صوت الحق اور تحریک طلوع اسلام سے وابستہ

ہے۔اس دور میں جبکہ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی اور اندھیرا ہی اندھیرا ہے صرف یہ دو ادارے ایسے ہیں جو خالص قرآنی فکر کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں، اس تمام عرصے میں یہ دلی خواہش ہوتی تھی اور اللہ تعالیٰ سے ہر وقت یہی دعا ہوتی تھی کہ یا اللہ ان نظریات کے حامل علماء اور تحریکیں دوسرے ممالک میں بھی پیدا فرمایئے کہ ان کے ذریعہ ان ممالک میں قرآن کی آواز بلند ہو سکے۔بہت عرصے سے دلی خواہش ہونے کے باوجود یہ تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔لیکن اب جو یہ دعا قبول ہوئی اور ایسی جگہ سے قبول ہوئی کہ جس کا کوئی سان وگمان بھی نہیں تھا۔تو راقم سطور اس بات سے اس درجہ خوش ہے کہ اس کو آواز کی گرفت میں نہیں لاسکتا۔اور یہ خواہش ہے کہ صوت الحق کے قارئین بھی اس خوشی میں شامل ہوں اس مختصر سی تمہید کے بعد اصل خوش خبری پیش خدمت عالی ہے۔

نابغہ روزگار مشہور دانشور اور عظیم مفکر قرآن جناب راشد شاز صاحب دہلی میں رہتے ہیں گزشتہ چند سالوں سے ان کی شہرت پاکستان میں ہونی شروع ہوئی۔خصوصاً یہاں کے قرآنی حلقوں میں ان کا نام نہایت عزت وتوقیر سے لیا جانے لگا حالانکہ یہاں ان کی تصنیفات دستیاب نہیں ہیں۔چند حضرات نے ذاتی کوشش سے ان کی کتب دہلی سے منگوائیں ہیں۔اور صوت الحق نے ان کے چند عالی مضامین کو شائع فرمایا ہے۔یہاں کراچی میں ایسے تاجران کتب ہیں جو بھارتی مطبوعات منگواتے ہیں، اگر محترم راشد شاز صاحب پسند فرمائیں تو اس سلسلہ میں صوت الحق ان کی مدد کرسکتا ہے۔اس طرح تشنگان علم کے لئے آسانی ہوگی۔وجہ یہ ہے اس وقت لاتعداد خطوط آرہے ہیں جن میں موصوف کی کتب کا پتہ پوچھا جاتا ہے۔

جو معاشرہ انفرادی مفاد خویش کے نظریہ پر قائم ہوگا وہ تباہ وبرباد ہو جائے گا اور جس نظام کی بنیادیں نوع انسان کے مفاد کلی پر ہوں گی وہی انسانیت کی ربوبیت کا ضامن اور انسانی ذات کی نشوونما کا کفیل ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

کیا اوامر ونواہی انفرادی طور پر سر انجام نہیں دیئے جاسکتے۔

ööööööööööööööööööööööööööööööööööööö

یوں تو قرآن حکیم نے اپنے وحی الٰہی ہونے کے خود بھی دلائل وبراہین فراہم کیئے ہیں۔لیکن ان دلائل کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں بعض مقامات ایسے آتے ہیں جہاں عقل انسانی اس کو وحی الٰہی ماننے پر مجبور ہوجاتی ہے اوران مقامات کی وجہ سے ہی اس کی تعلیم کا بے مثل وبےنظیر ہوناواضح ہوتا ہے۔انسان اس بات کوبخوشی تسلیم کرلیتا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم عقل انسانی کے بس کی بات نہیں ہے۔ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ ہرانسان ہمہ وقت اپنا ہی مفاد پیش نظر رکھتا ہے،اور ہر وقت اسی کوشش میں مبتلاء ہے کہ

تیری دیوار سے اونچی میری دیوار بنے

اپنے بچوں کی پرورش اور ایثار میں بھی اس کا ذاتی مفاد مضمر ہوتا ہے اور یہی ذاتی مفاد اس کے قومی مفاد میں بھی مضمر ہوتا ہے۔آج جبکہ علوم کی ترویج عام ہے اور عقل انسانی نے ترقی کرکے ،فطرت کی قوتوں کو بڑی حد تک مسخر کرلیا ہے۔اب بھی عقل انسانی اپنی قوم کے مفادات کے معیار سے بلند نہیں ہوسکی۔آج اس ترقی یافتہ دور میں بھی آپ غور فرمائیں تو ہر قوم کا وہی سب سے بڑا ہیرو (HERO) ہے جس نے ساری انسانیت کوغارت کرکے، اپنی قوم کوآگے بڑھایا ہے۔ہمارے ہی پڑوسی ملک میں مہاتما گاندھی ہندوؤں کے سب بڑے لیڈر تھے۔لیکن کون نہیں جانتا کہ وہ ہم مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن تھے اور مسلمانوں کی جڑیں کاٹنے کے لئے ہر وقت ساعی تھے۔لندن میں پارلیمنٹ کے بالکل سامنے رچرڈ دی لائن ہارٹ (RICHARD THE LION HEART) کا مجسمہ ہے جس میں وہ گھوڑے پر سوار ہے اور بہت بڑی تلوار اس کے ہاتھ میں ہے۔کچھ ہی آگے بڑھ کر LORD CANNING (لارڈ کیننگ) اور چرچل کے مجسمے ہیں۔یہ انگریزوں کے نہایت بلند مقام کے حامل ہیروز ہیں۔لیکن کون نہیں جانتا کہ انہوں نے دوصدیوں تک ساری انسانیت کا گلا گھونٹ کر،اس کا خون پیا ہے اور خاص طور پر ہمارے برصغیر سے ارب ہا

ارب روپیہ انگلستان گیا ہے۔ وہاں کی عظیم الشان عمارات اور زیر زمین ٹیوب لائن پر یہاں کے غریب کا خون پسینہ لگا ہوا ہے۔ انگریزی دور میں سالانہ بجٹ DISCUSS نہیں ہوتا تھا، کیونکہ وہ یہاں کی دولت انگلستان لے جانے میں کسی کو جوابدہ نہیں تھے۔ لیکن اس کے باوجود انگریز قوم خود کو انسانیت کا سب سے بڑا خادم خیال کرتی ہے۔ قرآن کریم نے ان ہی لوگوں کے لئے **اکبر مجر میھا** (6/123) فرمایا ہے۔

آپ اس پیش کردہ تناظر کے پس منظر میں اس بات پر غور فرمائیں کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال پیشتر قرآن کریم کا ارشاد عالی ہے، **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ** (3/110) تم بہترین امت ہو کہ تمہیں انسانیت کے فائدہ کے لئے اٹھایا گیا ہے کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، اور منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔ عربی زبان میں لام (ل) اس وقت آتا ہے جب وہ بات کسی کے فائدہ کے لئے ہو۔ **لھا ما کسبت** (2/286) جو کوئی اچھا کام کرے گا وہ اس کے فائدے کے لئے ہوگا۔ اس آیہ کریمہ میں مسلمانوں کے وجود کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ تم ساری انسانیت کے فائدے کے لئے اٹھائے گئے ہو۔ آپ ساری انسانیت کی، اور خصوصاً تمام مذاہب عالم کی تاریخ کا مطالعہ فرمالیں آپ کو کسی جگہ کسی مذہب یا کسی قوم کے لٹریچر میں اس طرح کے الفاظ ہرگز ہرگز نہیں مل سکتے۔ کہ اس قوم کا مقصد حیات ہی انسانیت کی خدمت ہو، یہ قرآن کریم کا ہی مقام بلند و عالی ہے کہ اس نے اس وقت ساری دنیا کو للکار کے اعلان کیا کہ مسلمانوں کا تو مقصد حیات ہی ساری انسانیت کے لئے فوائد اور منافع فراہم کرنا ہے۔

یہ وہ مقامات ہیں جہاں قرآن کریم کا وحی الٰہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ساری انسانیت کا مفاد ذہن انسانی کے فہم سے بالاتر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان کی گئی ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ تم اس لئے خیر امۃ ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، اور منکر سے روکتے ہو، یہ اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ اس منصب عالی پر تم نسل و نسب کی وجہ سے سرفراز و سربلند نہیں ہوئے ہو، جیسا کہ اہل کتاب نے اپنے لئے گمان کیا ہوا تھا۔ بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمہیں اس کا شرف عنایت کیا ہے۔ آیہ کریمہ اس بات کو واضح کر رہی ہے کہ

یہ منصب صفات و ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے۔ کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں دیا ہے کہ لازماً یہ اسی کے ساتھ بندھا رہے۔ پھر مسلمانوں کو مزید واضح کیا گیا ہے کہ ان کا لازمی فریضہ ہے کہ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (3/104)، اور لازماً تم ایک ایسی جماعت بن کے رہو، کہ وہ تمام نوع انسانی کو قرآن کی دعوت دے (22/78) معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو خیر امت صرف اس وقت تک قرار دیا ہے جب تک وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہمارے علماء کرام حسب معمول امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دینی مفہوم کو خیر باد کر کے، اس کا وہ مذہبی مفہوم اختیار کرتے ہیں جو ان کے لئے آسان و سہل بھی ہے، اور جس سے ان کا تسلط بھی قائم رہتا ہے، البتہ قوم، اس مفہوم کی وجہ سے قعر مذلت میں جا پڑتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن کریم کی بڑی جامع اصطلاح ہے۔ آپ کے سامنے اس کا دینی و مذہبی مفہوم پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم کی یہ جامع اصطلاح ان ہی الفاظ میں کئی مقامات پر استعمال کی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَ يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (3/103) حضرت مولانا اصلاحی صاحب نے اپنی مشہور تفسیر "تدبر قرآن" میں اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے "اور چاہیئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے، اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ یہ ترجمہ بالبداہت غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن کریم کے تمام تراجم میں تقریباً یہی ترجمہ کیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔ یہ بات نہیں کہ ہمارے یہ محترم و مخلص علماء کرام عربی کے ماہر نہیں تھے، ان حضرات کو عربی زبان اور عربی ادب پر کامل عبور ہوتا ہے اور حضرت مولانا اصلاحی صاحب کا تو عربی ادب میں ایک خاص مقام ہے۔ اصل وجہ پھر وہی ہے کہ ان حضرات کے سامنے دین ہے ہی نہیں کیونکہ ان کے سامنے مذہب ہوتا ہے، اس لئے یہ اس قسم کے تراجم کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

ہمارے علماء کرام اس آیہ کریمہ کے ترجمہ میں جو تسامح کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ

اول تو یہ خیر کا ترجمہ قرآن کی بجائے نیکی اور بھلائی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم نے خود قرآن کے لئے لفظ خیر استعمال کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَ قِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ قَالُوْا خَيْرًا (16/30) اور جب پرہیزگاروں سے کہا کہ تمہارے رب نے کیا اتارا ہے تو انہوں نے کہا خیر۔ یہاں قرآن کریم نے اپنے لئے خیر کا لفظ استعمال کیا ہے اور ہمارا ایمان بھی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف قرآن نازل ہوا ہے۔ قرآن کریم کی جگہ نیکی اور بھلائی ترجمہ کرنے سے یہ حضرات یہ فائدہ اٹھاتے ہیں کہ یہ پھر خود نیکی اور بدی کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں، اور اس طرح خدائی اختیار حاصل کرنے کا چور دروازہ کھول دیتے ہیں۔ اس کا درست ترجمہ یہ ہے کہ تم ایک ایسی امت ہو کہ ساری انسانیت کو قرآن کریم کی طرف بلاتی ہو۔

دوسرا تسامح جو یہ حضرات کرام کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ آیت کا ترجمہ یہ نہیں ہے کہ "اور چاہئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو" بلکہ اس کے معنی یہ ہیں "کہ تم ہی وہ جماعت ہو" علماء کرام کا ترجمہ غلط ہونیکی وجہ عرض کی جاتی ہے۔ جس میں معمولی سے عربی گرامر INVOLVE ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا سی توجہ سے اس کو ملاحظہ فرمالیں تو بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔

عربی زبان میں حرف "من" دو طرح استعمال ہوتا ہے ایک تو بعض کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ و منهم من کلم الله (2/25) ان میں سے (بعض) وہ بھی ہیں جن سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا یعنی کل میں سے بعض، اسے من تبعیضیہ کہتے ہیں اسی طرح ارشاد ہوتا ہے و منها تاکلون (40/79) اور چارپایوں میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ دوسرا استعمال اس کا بیانیہ ہوتا ہے۔ اس کو من بیانیہ برائے استغراق کہتے ہیں ۔فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (22/30)، سب کے سب بتوں کی نجاست سے بچو۔ یہاں اگر من تبعیضیہ لیا جائے تو اس کا ترجمہ ہوگا کہ بعض بتوں کی نجاست سے بچو، جو بالکل غلط ہوگا۔ اس لئے ہمیشہ من تبعیضیہ اور من بیانیہ کا فرق پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اسی طرح ارشاد ہوتا ہے وَ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ هُوَ الْحَقُّ (35/31) اور ہم نے جو کتاب تمہارے پاس وحی کے ذریعے بھیجی وہ بالکل حق ہے۔ اس

آیت میں بھی من بیانیہ ہے اور کسی صورت میں بھی تبعیضیہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر تبعیضیہ قرار دیا جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ قرآن کا بعض حصہ حق ہے اور بعض باطل۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے اس لئے یہاں من بیانیہ ہی لیا جاسکتا ہے اور آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ جو کچھ بھی وحی کیا گیا ہے وہ کتاب ہے۔

یہاں دو آیات من بیانیہ کی اور دو آیات من تبعیضیہ کی دے کر من بیانیہ اور من تبعیضیہ کا فرق قرآنی آیات سے واضح کر دیا گیا ہے۔

آیہ زیر غور (3/103) میں من کے معنی من بیانیہ کے لئے جائیں گے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم (پوری کی پوری امت) وہ جماعت ہو جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرے گی۔ قرآن کریم کی رُو سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ساری کی ساری امت کا ہے نہ کہ امت میں سے کسی خاص ایک گروہ کا۔ ہمارے علماء کرام نے اپنے مخصوص گروہ کے جواز کے لئے 'منکم' کے ترجمہ میں من تبعیضیہ قرار دے کر ایک خاص گروہ کے لئے امر و نہی مخصوص کر دیا ہے۔ حالانکہ اس سے چند آیات بعد ارشاد ہوتا ہے كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ (3/110)، تم بہترین امت ہو کہ لوگوں کی ہدایت کے لئے پیدا کئے گئے ہو کہ تم (پوری اُمت) اچھے کام کا حکم کرتے ہو، اور بُرے کام سے روکتے ہو۔ اس آیہ کریمہ میں امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا فریضہ پوری امت کا بتایا گیا ہے نہ کہ امت کے کسی خاص طبقہ کا۔ اگر آیت (3/103) میں یہ فریضہ صرف علماء تک محدود کر دیا جائے تو ان دونوں آیت میں تضاد واقع ہوگا۔ جو قرآن کے اس دعوے کے خلاف ہے کہ قرآن میں کوئی تضاد واقع نہیں ہوسکتا

حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پوری امت کا فریضہ ہے اور اس فریضہ کو اسلامی حکومت ہی ادا کرسکتی ہے۔ اس کو انفرادی طور پر ادا نہیں کیا جاسکتا سورۃ حج میں ارشاد ہوتا ہے اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22/41)، اس آیہ کریمہ کے چند متداول تراجم پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اس کے بعد ان پر تبصرہ کیا جاسکے۔ یہ آیہ کریمہ اقامت صلوۃ ایتائے زکوۃ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے

لئے عروۃ الوثقی کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو قدرت دیں ملک میں تو وہ قائم رکھیں نماز اور زکوٰۃ اور حکم کریں بھلے کام کا، اور منع کریں بُرائی سے اور اللہ کے اختیار میں ہے آخر ہر کام کا۔ ترجمہ حضرت شیخ الہند۔

(2) وہ کہ جب ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں گے تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور بھلائی کا حکم ادا کریں گے اور بُرائی سے باز داشت کریں گے۔ تفسیر مظہری جلد 8، ص 87۔

(3) یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو روئے زمین پر قابو دیدیں تو (بھی) یہ لوگ پابندی سے نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھے اچھے کام کا حکم کریں گے اور بُری باتوں سے (لوگوں) کو روکیں گے۔ اور (یوں تو) سب کاموں کا انجام خدا کے ہی اختیار میں ہے۔ ترجمہ حافظ فرمان علی صاحب۔

(4) جلالین شریف میں ہے "یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں دنیا میں حکومت دیدیں (دشمن کے مقابل میں) ان کی مدد کر کے، تو یہ لوگ نماز کی پابندی کریں۔ اور زکوٰۃ دیں اور دوسروں کو بھی نیک کام کا حکم دیں اور بُرے کام سے منع کریں۔ (ان **مكنا** میں جو شرط تھا **اقاموا الصلوة** اور اس کے بعد کا جملہ اس شرط کا جواب ہے) قوسین کی عبارت بھی جلالین کی ہے۔ ہمارا اضافہ نہیں ہے۔

صرف چار آیات بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ ان چاروں میں، اقامت صلوٰۃ ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اقتدار ملنے کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ اگر کسی قوم کو اقتدار حاصل نہیں تو وہ ان چاروں فرائض میں سے کسی ایک فرض کو بھی ادا نہیں کر سکتی کوئی بھی مغلوب قوم یہ امور سرانجام نہیں دے سکتی۔ جلالین نے بھی اپنی عربی عبارت میں "**جواب الشرط وهوَ جوابه** تحریر کیا ہے جس کا ترجمہ اوپر قوسین میں درج کر دیا گیا ہے اور بات بالکل واضح کردی کہ ان چاروں چیزوں کے لئے اقتدار اور اپنی حکومت شرط PRE-REQUISITEB ہے۔ اور اقتدار و حکومت کے بغیر یہ چاروں چیزیں سرانجام نہیں دی جا سکتیں۔

قرآن کریم کے دینی مفہوم کی رو سے قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام و قوانین

ہی معروف ومنکر ہوتے ہیں۔ان کا اجراء اسلامی حکومت کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے ہوتا ہے۔قرآن کریم نے جو حدود واقدار متعین کردیں ان میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہے ۔لیکن اسلامی حکومت اپنے دور کے حالات کے مطابق ان احکام کو جاری کرتی ہے یہی احکام معروف ومنکر ہوتے ہیں۔اور POLITICAL PARLANCE میں یہی HUMAN RIGHTS ہوجاتے ہیں، اور اسلامی TERMINOLOGY میں یہی سنت کہلاتے ہیں۔جن میں زمانہ کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔

یہ بات مثال کے ذریعے اس طرح واضح ہوتی ہے کہ قرآن کریم نے جنسی تمتع کے لئے نکاح کو شرط قرار دیا ہے کوئی اسلامی حکومت اس شرط کو تبدیل نہیں کرسکتی۔بغیر نکاح کے جنسی تمتع قطعاً ممنوع ہوگا۔البتہ قرآن نے نکاح کے لئے مہر، بلوغت، اعلان تراضی مابین وغیرہ شرط قرار دیئے ہیں۔اسلامی حکومت اپنے حکم کے ذریعہ، مہر کی رقم کا تعین کرے گی، اسی طرح اسلامی حکومت بلوغت کی عمر خود مقرر کرے گی،اعلان، تراضی مابین کے قواعد بھی جاری کرے گی۔ان احکامات پر عمل کرنا لازمی ہوگا، اور یہی اسلامی حکومت کے معروف ہوں گے اور ان کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہوگی۔یہ بھی واضح رہے کہ اسلامی حکومت میں صرف معروف کی اطاعت لازمی ہوگی۔اس کے علاوہ عوام بالکل آزاد ہوں گے کہ وہ اپنی ذاتی زندگی کو جس STYLE پر گذارنا چاہیں گذاریں، یہی بات آیت کریمہ (60/12)میں بیان کی گئی ہے جو ہمارے موقف کی موید ہے اسلامی حکومت میں رویت ہلال کمیٹی وغیرہ ادارے نہیں ہوتے۔حکومت خود اعلان کردے گی کہ فلاں دن عید ہے، یہ حکومت کا امر بالمعروف ہے تمام پبلک پر لازم ہوگا کہ اسی روز عید منائے۔اس طرح اور بہت سی مثالیں ہوسکتی ہیں۔

ہمارے محترم علماءِ کرام جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جاری ہونے پر اصرار کرتے ہیں، انہیں لازم ہے کہ وہ پہلے اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش فرمائیں پھر اس اسلامی حکومت کے ذریعے معروف اور منکر کا اجراء کریں جس میں پوری امت شامل ہوتی ہے نہ کہ علماء کا کوئی خاص گروہ۔علماء کرام کو اس بات کا اجارہ نہیں ہے کہ وہ خود معروف اور منکر کی فہرستیں بنا کر، ان کو جاری کرنے پر اصرار کریں۔ہمارے علماءِ کرام کو گانا ناپسند ہے، وہ اس کو منکر میں شامل کرتے ہیں جبکہ قرآن کریم میں کہیں گانے کو حرام

قرار نہیں دیا۔ اسی طرح ہر وہ چیز جو مولوی حضرات کو ناپسند ہو وہ منکر نہیں بن سکتی۔ معروف اور منکر صرف اسلامی حکومت ہی طے کر سکتی ہے اور ان پر اجتماعی طور پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ معروف و منکر پر انفرادی طور پر عمل نہیں کیا جاسکتا۔

❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖❖

☆☆☆

سود۔ اللہ اور رسول سے جنگ

قرآن کریم نے ربا کو حرام قرار دے کر اس کے متعلق فرمایا کہ ربا اللہ ورسول کے خلاف محاربہ (جنگ) ہے فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ (2/279) (مفہوم) پھر اگر سود کی رقم کو نہیں چھوڑتے، تو اللہ ورسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اللہ ورسول سے لڑنے کے الفاظ کو نہیں چھوڑتے، تو اللہ ورسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اللہ و رسول سے لڑنے کے الفاظ غور طلب ہیں۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ جسم وجسمانیت سے مبرا ومنزہ ہے۔ اس سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی ایک اصطلاح ہے۔ اور اس سے مراد اسلامی نظام اور اسلامی حکومت ہوتی ہے اور اس بات پر اکثر مفسرین وفقہا کا اتفاق ہے (3/172، 59/4، 5/33، 33/57، 9/3) قرآن کریم اسلامی نظام کے قیام پر اصرار کرتا ہے اور غیر اسلامی نظام، یعنی طاغوت میں زندگی بسر کرنے کو حرام قرار دیتا ہے (4/60) قرآن کریم کے نزدیک ایک مسلمان کا اصل مقصد حیات ہی اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اور اس اسلامی نظام میں ہی اس کے قوانین کا اجراء اور اس کے نواہی سے اجتناب ہو سکتا ہے۔ اسلامی نظام کے بغیر اس کے احکام پر عمل ہو ہی نہیں سکتا۔

☆☆☆

قرآنِ کریم کے موجودہ تراجم

%%%%% %%%%% %%%%% %%%%% %%%%% %%%%% %%%%% %%%%% %%%

کچھ عرصہ پیشتر تک عام طور پر علماء کرام ہی قرآن کریم کا مطالعہ کرتے تھے۔ لیکن یہ دور اس معاملہ میں خوش نصیب ہے کہ اس دور میں علماء کرام کی یہ اجارہ داری ختم ہوگئی ہے اور علماء کرام کے علاوہ عام مفکرین (Laymem) بھی براہ راست قرآن کریم کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ بلکہ علماء کرام کے درس نظامی میں تو اٹھارہ علوم ہوتے ہیں، جس میں قرآن کریم صرف تبرکا و تبرعاً ہی شامل ہوتا ہے وہ بھی صرف سورۃ بقرہ، لیکن موجودہ دور میں جو غیر علماء قرآن سے دلچسپی رکھتے ہوئے، اس کے مطالعہ میں مصروف ہیں، وہ اپنی ساری عمر اس کے مطالعہ میں صرف کر دیتے ہیں۔ علماء کرام صرف سابقہ تراجم پر اکتفاء کرتے تھے۔ اس کے علاوہ موجودہ حالات نے مفکرین قرآن کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ سابقہ تراجم و تفاسیر پر نظر ثانی کریں۔ اس کے علاوہ دو اور امور بھی قرآن فہمی میں مدد معاون ہوئے ہیں۔ ایک تو رسل و رسائل عام ہوگئے ہیں۔ کثرت سے مسلمان اپنے ممالک چھوڑ کر، یورپ و امریکہ میں آباد ہو رہے ہیں۔ یہاں انہیں ان ممالک کے حالات سے سابقہ پڑا اور ان کا Vision بھی وسیع ہوا۔ جس PRIVILAGE سے ہمارے علماء کرام محروم تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں عام آگاہی (AWARENESS) ہوئی ہے۔ اور موجودہ قرآنی مفکرین نے اس نکتہ کو بھی پیش نظر رکھا۔ نیز خود خواتین نے بھی قرآن کریم میں غور و خوض شروع کر دیا ہے اور قرآن کریم پر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ جس کی مثال سابقہ ادوار میں کہیں دکھائی نہیں دیتی، اس تمہید کے بعد اب اصل خبر کی طرف توجہ فرمائیں۔

ڈیلی ٹائمز مورخہ 26-03-2007ء میں ایک خبر بعنوان QURANIC TRANSLATION IYNITES CONTROVERSIES (قرآن کا وہ ترجمہ جس نے آگ بھڑکا دی) طبع ہوئی ہے۔ یہ نہایت مختصر سا تراشہ خالد حسن صاحب کا تحریر کردہ ہے۔ خالد حسن صاحب عرصہ دراز سے واشنگٹن میں مقیم ہیں اور معروف صحافی ہیں، ان کے مضامین اور آرٹیکل بہت کثرت

سے کئی اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ ترجمہ کرنے میں زیادہ محنت درکار ہوتی ہے، اس لئے اس مختصر تراشہ کا GIST تحریر کیا جاتا ہے۔

(اس اخبار میں تحریر ہے) ایک ایرانی خاتون لیلیٰ بختیار نے قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ کرنے میں سات سال لگائے ہیں۔ ان کا یہ انگریزی ترجمہ۔ قاضی پبلی کیشنز 'شکاگو' سے آئندہ سال طبع ہوگا۔ یہ خاتون (لیلیٰ بختیار)

جب آیہ کریمہ وَ الّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَہُنَّ فَعِظُوۡہُنَّ وَ اہۡجُرُوۡہُنَّ فِی الۡمَضَاجِعِ وَ اضۡرِبُوۡہُنَّ (4/34)، اور وہ عورتیں جن کے سرکش ہونے کا تمہیں اندیشہ ہو تو انہیں سمجھاؤ (اور اس پر نہ مانیں تو) تم ان کے ساتھ سونا چھوڑ دو (اور اگر اس پر بھی نہ مانیں) تو تم انہیں مارو۔ پر پہنچی تو انہیں واضربوھن کا ترجمہ مارنا درست معلوم نہیں ہوا۔ اُنہوں نے سارے تراجم دیکھے سب میں اس کا ترجمہ مارنا یا اس کا ہم معنی لفظ لکھا ہوا تھا۔ لیکن چونکہ یہ مترجمہ (لیلیٰ بختیار) اس ترجمہ سے مطمئن نہیں تھیں تو انہوں نے مشہور عربی۔ انگلش لغت، جو ولیم لین (W.LANE) کی تحریر کردہ ہے وہ (CONSULT) کی۔ لین نے اپنی ڈکشنری میں ضرب کے معنی مارنے کے بجائے GO AWAY کیئے ہیں۔ اس ترجمہ پر مترجمہ کا دل ٹھک گیا اور انہوں نے سوچا کہ جب رسول اللہ کو اپنی ازواج سے کوئی دقت پیش آتی ہوگی تو یقیناً وہ اُن کو مارتے نہیں ہوں گے، تو عام مسلمان اپنی بیویوں کو کیوں ماریں۔

قرآن کریم کے تراجم کا دارومدار عربی گرائمر اور احادیث پر ہوتا ہے۔ اس ترجمہ پر اعتراض کرنے والے حضرات لیلیٰ بختیار کے ترجمے پر دو نقطہ ہائے نظر سے اعتراض کررہے ہیں۔ تاہم لیلیٰ کو اس بات کا اعتراف ہے کہ انہیں پہلے سے ہی ان اعتراضات کی توقع تھی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لوگ یہ اعتراض کریں گے کہ یہ ترجمہ ایک امریکن باشندہ کا ہے اور وہ بھی عورت (لہٰذا یہ درست نہیں ہوسکتا) NYT (نیویارک ٹائمز نے لکھا ہے کہ یہ سہ مراحل پروگرام عرب کے اس معاشرے میں جب قرآن نازل کیا گیا تھا، ایک اصلاحی پروگرام تھا۔ اور اس آیت میں مردوں کو مارنے کی ایک عام اجازت بھی نہیں تھی بلکہ ان کو ایک ایسی چھوٹی شاخ سے مارنا تھا جو مسواک کے برابر ہوتی ہے۔

مصر کے مفتی اعظم شیخ علی جُمعہ، نے کہا کہ "آیات کو حالات کے مطابق دیکھنا

چاہیئے MUSTBI VIEWED THROUGH PRISM OF ERA انہوں نے نیز یہ بھی فرمایا
''ہمارے دور میں بیویوں کو مارنا بالکل غیر مناسب ہے کیونکہ معاشرہ اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے مزید اختلافی اضافہ ہوگا اور انتشار پھیلے گا۔'' یہاں آ کر، اس خبر کا خلاصہ ختم ہوتا ہے۔ پیشتر اس سے کہ ضرب کے لفظ کی تشریح کی جائے دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جب بھی شان نزول اور روایات سے صرف نظر کر کے قرآن خالص کو سامنے رکھ کر غور کیا جائے گا، تصریف آیات کے ذریعے قرآن کا نظریہ خود اُبھر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ خاتون (لیلیٰ بختیار) ایرانی علماء سے زیادہ قابل نہیں ہیں اور نہ ہی عربی زبان پر بہت عبور ہے، لیکن یہ صحیح نتیجہ پر صرف اس وجہ سے پہنچ گئیں کہ وہ روایات اور شان نزول میں نہیں اُلجھیں۔

دوسری قابل توجہ بات جو NYT نے QUOTE کی ہے، وہ مفتی اعظم شیخ قوما کا بیان ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ آیات قرآنی کا مطالعہ اپنے حالات کے پیش نظر کرنا چاہیئے۔ اس بات سے علماء کرام کے موقف کی تردید ہو جاتی ہے کیونکہ ہمارے علماء کرام ہر وقت سلف صالحین کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں۔ کہ چونکہ سلف صالحین نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے، اب اس لئے اس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔

اب اصل موضوع آیہ کریمہ کی تشریح کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ضرب کے کئی معنی ہیں۔ اور قرآن کریم نے بھی اس لفظ کو متعدد معانی میں استعمال کیا ہے۔ ان کے حوالوں سے مضمون میں طوالت ہوگی۔ لیکن ضَـرَبَ کے معنی خود قرآن نے بتائے ہیں ''بیان کرنا، کسی بات کو بتانا'' بھی کئے ہیں۔ جو یہاں سب سے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ عربی زباں میں (بلکہ عموماً تمام زبانوں میں) چونکہ الفاظ کے متعدد معانی ہوتے ہیں۔ اس لئے قرآنی آیات میں وہ معانی لینے چاہئیں جو اس مقام پر سب سے زیادہ مناسب ہوں۔ اور یہی چیز تدبر قرآن کہلاتی ہے۔

اس آیہ کریمہ میں ضرب لفظ کے معنی ہمارے علماء کرام ''مارنا'' لیتے ہیں۔ کہ اگر بیویاں نافرماں ہوں، تو ان کو شوہر ماریں۔ لیکن یہ معنی یہاں درست نہیں ہیں۔ دو ذاتی واقعات کمترین تحریر کرتا ہے۔ ایک بہت بڑے عالم دین، جو کمترین کے استاد بھی تھے اور ان سے یہ کمترین اس زمانہ میں حماسہ و متنبی (عربی دواوین) پڑھ رہا تھا، ان سے اس آیہ

کے سلسلہ میں گفتگو ہوئی۔ میں نے ضرب کے معنی "بیان کرنا" کے تجویز کیے۔ انہوں نے فرمایا کہ بے شک ضرب کے معنی بیان کرنے کے آتے ہیں، لیکن یہ صرف اس وقت آتے ہیں جبکہ اس کے ساتھ مثلاً کا لفظ بھی استعمال ہو، اور چونکہ یہاں مثلاً کا لفظ ساتھ نہیں آیا ہے، اس لئے اس آیت میں یہ معنی نہیں ہوسکتے۔ گھر واپس آکر قرآن کریم دیکھا۔ یقیناً وہاں زیادہ مقامات پر ضرب کے ساتھ مثلاً کی PREPOSITION استعمال کی گئی ہے۔ لیکن میں نے مزید جستجو کی تو معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں، کیونکہ لغات القرآن میں وہ آیات دی گئی ہیں جن میں ضرب کے معنی قرآن کریم نے 'بیان کرنا' کئے ہیں لیکن وہاں مثلاً کا لفظ ساتھ نہیں لایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے **كذلك يضرب الله الحق والبلطل** (13/17)، اسی طرح اللہ حق و باطل کی بات سمجھاتا ہے دوسری جگہ ارشاد ہے **ماضر بوة لك الا جدلا** (43/58)، یہ لوگ تجھ سے بات نہیں بیان کرتے بلکہ محض جھگڑا کرتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ ان دونوں مقامات میں تمام مترجمین نے ضرب کے معنی خود بیان کرنے کے لئے ہیں۔ مارنے کے نہیں لئے۔ میں نے یہ بات اپنے قابل صد احترام استاد کے سامنے پیش کی اور آیات کے حوالہ بمع علماء کرام کے تراجم کے پیش کئے۔ لیکن وہ ماننے کو آمادہ نہیں ہوئے اور لمبی بحث میں پڑ گئے۔

دوسرا موقع ایک مشہور اور کامیاب وکیل کے ساتھ ہوا۔ وہ میرے دفتر میں تشریف لائے اور وہ اتفاق سے کسی ازدواجی مقدمہ کی پیروی کر رہے تھے۔ وہ شوہر کی طرف سے وکالت کر رہے تھے، اور اسی آیت کے حوالے سے بیوی کو مارنے کی اجازت کو PLEAD کر رہے تھے مگر یہ اصرار تھا کہ صرف ڈنڈی یا مسواک سے مار سکتے ہیں۔ میں نے ان کے سامنے آیت کا صحیح مفہوم پیش کیا، اور اپنا نظریہ بتایا کہ میرے نزدیک بیویوں کو مارنا چوڑھوں، چماروں کا کام ہے شریف آدمی کو اس سے کیا تعلق۔ آیت کریمہ کا جو مفہوم میں نے عرض کیا انہوں نے فوراً قبول کیا اور یہ عقلی طور پر بھی درست تھا۔ اور شرافت سے بھی نزدیک۔ انہوں نے اس مفہوم کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اس کی بہت تعریف کی۔

آیہ کریمہ **وَ الّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ فَعِظُوْهُنَّ وَ اهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَ اضْرِبُوْهُنَّ** ۔ عورتیں اگر تمہیں ان کی نافرمانی کا خوف لاحق ہو جائے تو انہیں نصیحت کرو (اگر وہ نہ مانیں) تو انہیں بستروں میں الگ کردو اور ان سے

(اس علیحدگی کا) سبب بیان کرو۔ آیہ کریمہ میں **واضربوھن** کے الفاظ ترتیب کے لحاظ سے **واھجروھن فی المضاجع** کے بعد آئے ہیں کہ تم انھیں بستروں میں الگ کرنے کے بعد، ان پر اس اقدام کی وجہ بیان کرو کہ تم نے ایسا کیوں کیا ہے تا کہ تمہارا یہ قول اثر انداز ہو۔ مثلاً اگر تم نے اس کو کسی کے ساتھ دیکھا ہے تو آپ بیان کریں کہ تم فلاں شخص کے ساتھ جارہی تھیں، اور مجھے اس وجہ سے شک ہوا ہے۔ اس کے جواب میں بیوی آپ کو صحیح صورت حال سے اطلاع دے گی۔ ممکن ہے کہ آپ کو غلطی لگی ہو، اور اس طرح وجہ بتانے سے غلط فہمی دور ہو جائے۔ بیوی کو ناراضگی کی وجہ بتانی نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے یہاں مارنے کے بجائے افہام وتفہیم، اور شکوک وشبہات بیان کرنا، زیادہ بہتر ثابت ہوں گے۔

لین (LANE) نے اس کا ترجمہ GO AWAY کیا ہے۔ یوں تو اس کا ترجمہ جانا ہی ہے، لیکن محاورہ میں یہاں یہ ترجمہ ہے کہ اگر وہ نہ مانیں تو ان کو دفع کر دو، اس نے بھی اس کا ترجمہ مارنا نہیں کیا، لیکن تصریف آیات سے یہاں بہترین ترجمہ "بیان کرنا" ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&&

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس معاشرہ میں ایسا نظام رائج ہو جس کی رو سے افراد معاشرہ کو قانوناً اجازت ہو کہ وہ جس قدر چاہے اپنے لئے دولت سمیٹ کر رکھ لیں وہ نظام تباہ ہو کر رہتا ہے اور اس قوم کی جگہ دوسری قوم لے لیتی ہے

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

علماء کرام کی خدمت میں
تحریک طلوع اسلام کا اجمالی تعارف

صدرِ اول سے لے کر آج تک ہم مسلمانوں نے قرآن کریم کو ہی اپنا محور، مرکز اور عروۃ الوثقیٰ بنائے رکھا۔ اس طویل و عریض عرصہ میں صدہا علماء وفقہاء پیدا ہوئے اور سب نے نہایت نیک نیتی سے قرآن کریم پر کام کیا۔ صدہا تفاسیر تحریر کی گئیں اور پھر ہر دور میں قرآن فہمی، درس و تدریس کا سلسلہ قائم رہا۔ ہمارے برصغیر ہندو پاک میں بھی گذشتہ صدی میں قرآن کریم پر خوب کام ہوا۔ ہمارے مفسرین کرام نے اپنی اپنی صوابدید اور اپنی اپنی علمی استعداد کے مطابق بہتر سے بہتر تفاسیر پیش کیں۔ نہایت ذلت و پستی، زوال و ادبار سے دوچار ہو جانے کے بعد، اب مسلمانوں میں ایک بیداری کی لہر ہر طرف موجزن ہے۔ سابقہ صدی میں مصر اور برصغیر پاک و ہند میں چند تحریکیں بھی اُٹھیں، اور قرآن کریم پر بھی بہت تحقیقی کام ہوا۔ ماضی قریب میں ایران میں ایک ایسی ہی ہمہ گیر تحریک پیدا ہوئی اور وہاں قرآن کریم پر بھی موجودہ دور کے مطابق تفاسیر رقم کی گئیں۔ پاکستان میں بھی ماضی قریب سے جو کام شروع ہوا، اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مختلف جماعتوں اور تحریکوں کے علاوہ یہاں تحریک طلوع اسلام نے بھی کام شروع کیا۔ اس تحریک کے بانی و داعی ومنادیا منادی الاسلام، مشہور مفکر قرآن، غلام احمد پرویز تھے۔ جنہوں نے اس تحریک کو خالص قرآنی نظریات پر قائم کیا۔ انہوں نے تقریباً 50 سال رسالہ طلوع اسلام جاری رکھا اور تقریباً 50 کتابیں قرآن فہمی کے سلسلہ میں تحریر کیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہم سب مسلمان قرآن کریم کو مرکز و محور قرار دیتے ہیں لیکن جب بھی کہیں سے خالص قرآن کی آواز بلند ہوئی، مسلمانوں نے ہی اس کی مخالفت کی۔ سرسید اور ان کے ساتھیوں کی مخالفت ہوئی۔ ان پر کفر کے فتوے لگے، پرویز صاحب نے بھی خالص قرآنی نظریات بیان کئے، لیکن ان کی سخت مخالفت ہوئی۔ اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ، اور ملوکیت کے غلبہ کی وجہ سے، خود ہمارے علماء کرام کے زیادہ تر نظریات قرآن کے

خلاف ہوتے چلے گئے، اس لئے خالص قرآنی نظریات کی اشاعت وترویج سے ان کے اپنے نظریات کی تردید ہوتی چلی جاتی ہے، اور یہ بات اُن کو ناگوار گذرتی ہے اور اس کے رد عمل میں وہ نہ صرف ان نظریات کو عام نہیں ہونے دیتے بلکہ وہ اس داعی قرآن کے خلاف بھی طرح طرح کے الزامات و غلط افواہیں عام کرتے رہتے ہیں۔

تحریک طلوع اسلام اور پرویز صاحب کے سلسلہ میں بھی ہمارے علمائے کرام کا یہی رویہ رہا ہے۔ ہمارے علماء کرام کے بیشتر طبقے نے پرویز صاحب کی کوئی کتاب مطالعہ کئے بغیر ہی ان کے خلاف ایک محاذ قائم کرلیا ہے۔ اس مضمون کا مقصد ان کتابوں پر تبصرہ کرنا نہیں ہے کیونکہ یہ کام کسی بہت بڑے عالم کا ہے کہ وہ ان کی کتب پر تبصرہ تحریر کرے، یہ مضمون چند احباب کے اصرار پر بصرف اس غرض سے تحریر کیا جارہا ہے کہ پرویز صاحب یا تحریک طلوع اسلام کے خلاف جو شکوک و شبہات ہمارے علماء کرام میں پائے جاتے ہیں، ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے، اس مضمون میں پرویز صاحب کے بنیادی و اساسی نظریات کو بہت مختصر طور پر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

قرآن کریم شخصیت پرستی کی سخت مخالفت کرتا ہے۔ قرآن کریم کی اس تعلیم کے پیش نظر پرویز صاحب کا تحریر کردہ لٹریچر بھی جو ذہن بناتا ہے، وہ شخصیت پرستی سے سخت نفرت رکھتا ہے۔ پرویز صاحب نے خود بھی ساری عمر جگہ جگہ یہ تحریر کیا ہے کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ قرآن کے صرف ایک ادنیٰ طالب علم ہیں۔ ان کے اور قرآن کریم کے ہر طالب علم کے لئے سند صرف اللہ کی کتاب عظیم قرآن کریم ہے۔ شخصیت پرستی سے ابا کرنے کی وجہ سے اس مضمون میں پرویز صاحب کا نام بار بار تحریر کرنا، گوارا نہیں ہوا، اور اس کی جگہ ہر بار تحریک طلوع اسلام کا حوالہ دیا گیا ہے۔ یہ تحریک ان کی ہی قائم کردہ اور ان ہی کے نظریات کی حامل ہے۔ اس تحریک کی مدافعت سے ان پر عائد کردہ الزامات کی ہی تردید کرنا مقصود ہے۔

یہ بات بھی تحریر کرنی غیر مناسب معلوم نہیں ہوتی کہ یہ کسی کا دعویٰ نہیں ہے کہ طلوع اسلام کی تحریر کردہ ہر بات اور ہر نظریہ درست ہے بلکہ دعوت صرف اس بات کی ہے کہ اس تحریک کے اساسی و بنیادی نظریات خالص قرآن کریم پر مبنی ہیں۔ اور صرف اُن ہی چند اساسی نظریات کا تعارف اس مضمون میں کرلیا جارہا ہے۔ علماء کرام سے حد درجہ عاجزی

وانکساری سے درخواست ہے کہ وہ اس مضمون کو بغیر کسی سابقہ تعصب کے خالصتاً لوجہ اللہ مطالعہ فرمائیں۔

قرآن کریم نے انسان کو نہایت بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ عنایت فرمایا ہے اور اسی سبب نے انسان پر انسان کی حکومت کو حرام قرار دیا ہے قرآن کریم کا یہ اصول زرین حروف سے لکھنے کا متقاضی ہے۔ قرآن کریم نے یہ نعرہ اس وقت بلند کیا تھا کہ جب انسان پستیوں اور مجبوریوں سے دوچار تھا۔ انسانی حقوق کا کوئی تصور تک نہیں تھا قرآن کریم کے نزدیک حق حکومت صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اس کے علاوہ سب بہتان آزری۔ اس بلند نعرہ واصول کے پیش نظر حضورؐ نے اللہ تعالیٰ کی حکومت اس سرزمین پر قائم فرمائی اور اس حکومت کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حکومت منقرض ہوگئی اور مسلمانوں میں ملوکیت درآئی۔ ملوکیت قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے لیکن ہمارے سب علماء کرام ملوکیت کے قائل وحامی نظر آتے ہیں۔ **السلطان ظل اللہ فی الارض** کا نظریہ درست تسلیم کیا جاتا ہے۔ سعدی شیرازی کا یہ مشہور شعر ہے۔

اگر شہ روز اگوید شب است ایں — بباید گفت اینک ماہ پروین

کی تعلیم دینا، اس دور کی عکاسی کرتا ہے۔ بنوعباس کے وہ خلفاء جو نہایت آوارہ اور بدچلن تھے اور جن کے حرم میں کئی کئی سو کنیزیں رہتی تھیں۔ ہمارے علماء ان کو گوارا کرتے تھے اور ان کو دعائیں دیتے تھے۔ ہمارے اپنے دور میں مشہور عالم شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی نے المامون جیسی کتابیں ان کی تعریف میں تصنیف کیں ہمارے علماء کرام ملوکیت سے بالکلیہ COMPROMISE کر چکے ہیں اور تیرہ سوسال سے ملوکیت ہی چلی آرہی ہے۔ آج سعودی عرب میں ملوکیت قائم ہے۔ جمعہ کے خطبوں میں بادشاہوں کا نام لیا جاتا رہا ہے۔ غرض یہ کہ ہمارے علماء کرام قرآن کریم کے اس بنیادی اصول کو بالکل نظر انداز کر چکے تھے، کہ ملوکیت قرآن کے خلاف ہے اس کے علی الرغم تحریک طلوع اسلام نے، اس نعرہ کو بہت زور سے بلند کیا کہ قرآن کی رو سے ملوکیت بالکل حرام ہے اور اللہ ورسول کی اطاعت کا واحد عملی طریقہ اسلامی حکومت کی اطاعت ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ بغیر اس نظام کے قیام کے اللہ ورسول کی اطاعت کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق صرف اس حکومت یا نظام

کی وساطت سے قائم ہوتا ہے اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو ہم اللہ ورسول کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں۔ اس نظریہ کی وضاحت کہ اللہ ورسول کی اطاعت کی عملی شکل اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے، اس بات کی متقاضی تھی کہ طلوع اسلام سب سے پہلے اپنے قارئین کے سامنے دین اور مذہب کا واضح فرق بیان کرے۔ چنانچہ ہماری پوری تاریخ میں تحریک طلوع اسلام پہلی تحریک ہے کہ جس نے اس موضوع پر خوب سیر حاصل مواد مُہیا کیا۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ ہمارے علماء کرام اس کو جس قدر بھی اہمیت دیں وہ کم ہے، اور وہ اس بارے جس قدر مواد چاہیں، وہ حاصل کر سکتے ہیں۔

مذہب میں احکامات الٰہی کی اطاعت انفرادی طور پر ہوتی ہے، لیکن دین کی صورت یہ ہے کہ نزول قرآن کے دوران مختلف امور کے متعلق مسلسل قوانین واحکامات دیئے جارہے تھے ان کی عملی شکل یہ ہوتی تھی کہ مومنین ان پر اجتماعی طور پر ایک نظام کی وساطت سے عمل کرتے تھے، زکوٰۃ، خمس، صدقات کے احکامات نازل ہوئے تو لوگوں نے فرداً فرداً زکوٰۃ ادا نہیں کی کہ جس کا دل چاہا اپنی مرضی سے کسی کو زکوٰۃ دے دی بلکہ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یہ رقم حضورؐ کے پاس پیش کی جاتی اور حضورؐ اس کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے بیت المال میں جمع کر دیتے تھے اور حسب موقع اس کو خرچ کیا جاتا اسی طرح جب احکام حدود نازل ہوئے کہ زانی کے سو کوڑے مارو یا، چور کے ہاتھ کاٹ دو تو لوگوں نے ازخود ان احکامات پر عمل نہیں کیا تھا کہ کسی کے گھر چوری ہوئی تو اس نے چور کو پکڑ کر اور محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے اس چور کے ہاتھ کاٹ دیئے بلکہ صورت حال یہ ہوتی تھی کہ چوری یا زنا کے جرم کی اطلاع حضورؐ کو یا حضورؐ کے مقرر کردہ اسلامی حکومت کے افسران یعنی اولی الامر کو دی جاتی تھی وہ اس جرم کی تحقیق و تفتیش کر کے اس جرم کے مطابق اس مجرم کو سزا دیتے تھے یا اُسے بری کر دیتے تھے اس طرح نکاح وطلاق کے معاملات بھی حضورؐ کی معرفت طے پاتے تھے قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت، اس مرکز کی وساطت سے، اجتماعی طور پر کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر اُن کی اطاعت الگ الگ ازخود نہیں کی جاتی تھی اس مرکز کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ احکام اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے اور ان کو رسول اللہ جاری فرمارہے تھے اس لئے اس نظام (مرکز) کی اطاعت سے اللہ ورسول دونوں کی اطاعت ہوجاتی تھی"

قرآن کریم نے اس بات کی اجازت ہی نہیں دی کہ لوگ خود انفرادی طور پر اس کی اطاعت کریں بلکہ ہر جگہ اطاعت رسول پر اصرار کیا گیا ہے۔ اطاعت رسول پر اصرار کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام کو بحیثیت ایک نظام اور دین کے اختیار کیا جائے اور تحریک طلوع اسلام کی پیش کردہ یہ بات علماء کرام کی توجہ کی متقاضی ہے۔

ہمارے علماء کرام کو تحریک طلوع اسلام کے خلاف ایک عام شکایت یہ ہے کہ یہ حدیث کی منکر ہے۔ لیکن یہ الزام حقیقت پرمبنی نہیں ہے۔ عرصہ دراز تک رسالہ طلوع اسلام کے ٹائٹل کے صفحہ پر ہر ماہ حدیث شریف درج کی جاتی تھی۔ جن حضرات نے تحریک طلوع اسلام کے سالانہ اجتماعات میں شرکت کی ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اجتماع کے پنڈال میں آیات قرآنی کے ساتھ ساتھ احادیث نبوی کے بڑے بڑے بینرز جلی حروف میں آویزاں کیے جاتے تھے۔ جن میں یہ حدیث شریف " ومن استوا یوماہ فھو معبون " بھی ہوتی تھی۔ اصل میں یہ تحریک حدیث کی قطعاً منکر نہیں ہے وہ حدیث کو تسلیم کرتی ہے، حدیث کے بارے میں اس تحریک کا موقف جب آپ بغور مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کا یہ اعتراض ازخود دور ہو جائے گا۔

یہ بات ہر شخص پر عیاں ہے کہ اسلام کا نظام کوئی وقتی یا ہنگامی نظام نہیں تھا بلکہ اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری رہنا تھا۔ اور یہ بات بھی سب پر واضح ہے کہ انك میت وانھم میتون (39/30) اُنہیں بھی مرنا ہے اور تمہیں بھی مرنا ہے کے مطابق حضور کو فوت بھی ہونا تھا۔ اب زیر غور سوال یہ تھا کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں اطاعت رسول کا حکم آیا ہے اس اطاعت رسول کے فریضہ کو کس طرح ادا کیا جائے۔ طلوع اسلام چونکہ اسلامی نظام کا داعی ہے اور ہر جاری نظام میں ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے جو قرآنی احکامات کا اجراء کرے، اس لئے طلوع اسلام کے نزدیک اسلامی نظام کے سربراہ کی اطاعت، حضورؐ کی اطاعت ہے۔ چنانچہ طلوع اسلام کے نزدیک حضورؐ کے بعد حضرت ابوبکر کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی، حضرت ابوبکر کے بعد حضرت عمر کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی کیونکہ وہ سربراہ مملکت کی حیثیت سے قرآنی احکامات نافذ فرمارہے تھے۔ چنانچہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت حضورؐ کی اطاعت کے قائم مقام ہو جاتی ہے جبکہ ہمارے علمائے کرام کے نزدیک صورت حال یہ ہے کہ کیونکہ وہ دین کے بجائے

مذہب پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اور مذہب میں زندہ اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی، کیونکہ اس میں انفرادی طور پر اطاعت کرلی جاتی ہے، اس لئے وہ حضورؐ کے بعد احادیث کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کا قائم مقام بنادیتے ہیں، جو قرآن کے خلاف ہے۔ لیکن اس میں علمائے کرام کا کوئی قصور نہیں ہے جب آپ اسلام کو دین کے بجائے مذہب کی سطح پر لے آئیں گے تو آپ کے سامنے اطاعت رسول کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نکل ہی نہیں سکتی۔ مذہب میں حدیث کی اطاعت، رسول اللہ کی اطاعت کے قائم مقام بن جاتی ہے، جبکہ دین میں اسلامی نظام کے سربراہ کی اطاعت رسول اللہ کی اطاعت کی قائم مقام ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام جواب دین کی طرف آرہے ہیں وہ اس سقم وخامی کا بخوبی اندازہ کررہے ہیں۔ طلوع اسلام خدانخواستہ حدیث کا منکر نہیں ہے بلکہ وہ حدیث کو تسلیم کرتا ہے، البتہ وہ حدیث کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کا مقام نہیں گردانتا۔

ہمارے ہاں تفسیر نویسی کا سلسلہ جب شروع ہوا، تو تفاسیر تحریر کرنے سے پیشتر تفسیر نویسی کے کوئی اصول طے نہیں کیے گئے، اور اس سلسلہ میں نہ صرف قرآن سے کوئی راہنمائی حاصل نہیں کی گئی بلکہ قرآن کریم نے جو قرآن فہمی کے طریقے بتائے ہیں ان کو بالکل نظرانداز کردیا گیا۔ ہمارے مفسرین کرام نے زیادہ زور شان نزول پر دیا ہے اور ہر آیت کا شانِ نزول سامنے رکھ کر آیات قرانیہ کی تشریح کی ہے۔ جب تفاسیر تحریر کرنے کا دور شروع ہوا تو فرقہ بندی کی ابتداء ہوچکی تھی اس لئے آیات کے شان نزول بھی مختلف فرقوں کے مختلف تھے۔ شان نزول آیت کے مفہوم کو بالکل ایک آیت کے ساتھ وابستہ کردیتا ہے اور اس آیت کی ابدیت، ہمہ گیریت، آفاقیت بالکل جاتی رہتی ہے۔ اکثر وبیشتر اوقات شان نزول کی وجہ سے آیات کا مفہوم بالکل برعکس وبرخلاف ہوجاتا ہے۔ عقلی طور پر بھی یہ بات تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات وقتی حادثات وواقعات کے وقوع پذیر ہونے پر نازل ہوتی تھیں فرض کریں کہ اگر وہ واقعہ وجود میں نہ آتا تو کیا وہ آیت نازل نہ ہوتی یا اگر زیادہ واقعات وجود میں آجاتے تو کیا زیادہ آیات نازل ہوجاتیں۔ ہمارے ہاں قذف کی سزا کو واقعہ افک سے منوط کرتے ہیں۔ (جو بظاہر غلط ہے) تو اگر واقعہ افک نہ ہوتا تو کیا قذف کے احکامات نازل نہیں ہوتے، اسی طرح سرقہ، زنا، غیبت اور سینکڑوں امور کو وجہ بنا کر آیات کا نزول ان پر منحصر کردیتے ہیں جو ظاہر بظاہر بالکل خلاف عقل ہے

سورہ نور کی چونسٹھ آیات ہیں، روایات کے مطابق یہ سورت بیک وقت نازل ہوئی ہے تو کیا اس کے نزول سے پیشتر 64 واقعات ایسے وجود میں آئے ہوں گے کہ یہ 64 آیات نازل ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے، اور یہ حقیقت بہت ہی اہم ہے کہ آیات قرآنی انسانیت کے تقاضوں کے مطابق نازل ہوئی ہیں۔ قیامت تک کے لئے انسانیت کے لئے جو جو تقاضے اور ضروریات ہو سکتی تھیں، قرآن کریم میں وہ ساری آیات نازل کر دی گئیں۔

شانِ نزول کے نظریہ کو تسلیم کرنے میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی آیات یقینی ہیں، اور ان میں کسی قسم کا شک و ریب نہیں ہے جبکہ شان نزول کی روایات ظنی ہیں اور شک پر مبنی ہیں ایک یقینی شے اور حق کی تفہیم و توضیح میں شک و ظن کو شامل کرنے سے خود آیات کی تفہیم و تشریح ظنی و مبنی بہ شک ہو جاتی ہے۔ ہمارے مفسرین کرام کا طریقہ یہ ہے کہ آیت تو قرآن سے لے لی، اور اس کی تشریح کے لئے اس کے شان نزول کو روایات کی کتابوں میں تلاش کرنا شروع کر دیا۔ مختلف فرقوں کی مختلف شان نزول ہونے کے علاوہ، خود ایک ہی فرقہ میں، ایک ایک آیت کے تین تین چار چار، پانچ پانچ شانِ نزول ہیں اور ان تمام شان نزول کو سامنے رکھنے کے باوجود بھی قاری کسی حتمی نتیجہ پر نہیں پہنچتا، تفسیر کرنے کے اس طریقہ کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہماری تفاسیر میں بیشتر نظریات قرآنی تعلیم کے خلاف داخل ہو گئے ہمارے مفسرین کرام بھی اس کے معترف ہیں اور وہ اس کو اسرائیلیات نام دیتے ہیں۔ ان خارج از قرآن نظریات و احکامات کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ ان کی اطاعت سے ان مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے۔ جنہوں نے وہ نظریات تفاسیر میں داخل کئے ہیں اور اس طرح ہم مسلمان مجموعی حیثیت سے اللہ و رسول کی صرف دس فیصدی ہی اطاعت کرتے ہیں باقی نوے فیصد اطاعت ان مفسرین کے اپنے داخل کردہ عقائد کی کر رہے ہیں۔

خالص قرآن کریم کو سامنے رکھنے اور خارج از قرآن نظریات کو کاٹ کے الگ پھینک دینے اور سو فیصدی خالص اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی ان اصولوں کے مطابق تشریح و تفسیر کی جائے جو اصول خود قرآن کریم نے تجویز فرمائے ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر کا جو خلاف قرآن طریقہ ایک ہزار سال سے چلا آ رہا ہے، تحریک طلوع اسلام نے اس پر خط تنسیخ پھیر کر، تفسیر القرآن کا طریقہ اختیار کیا۔

تفسیر القرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کرنے میں قرآن کریم نے خود دو اصول لازمی قرار دیئے ہیں اور انہیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایک تو محاورہ عرب، کیونکہ قرآن کریم اسی طرز تکلم میں نازل ہوا ہے جس میں عرب خود کلام کرتے تھے۔ انہ لحق مثل ما انتم تنطقون (51/23)، (ترجمہ) بلاشبہ یہ قرآن حق ہے اور اس کا انداز بیان بالکل وہی ہے جس طرح تم آپس میں روزمرہ گفتگو کرتے ہو، نیز فرمایا کہ لسان عربی مبین میں ہے۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ قرآن فہمی کے لئے تصریف آیات لازمی و لابدی چیز ہے اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْآيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ (6/65) "آپ دیکھئے تو سہی ہم کس طرح دلائل کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں شاید وہ سمجھ جائیں" نیز قرآن کریم کے مطابق حضورؐ کا طریقہ قرآن فہمی کا یہی تھا وَ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (6/105) (مفہوم) اے رسول ہم اس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریف آیات کے ساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا اور تصریف آیات کی دوسری غرض یہ ہے تاکہ ہم عقلمندوں کے لئے اپنی آیات کی خود تبئین کر دیں۔

لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم مسلمانوں میں چودہ سو سال سے قرآن فہمی کے لئے جو اصول مقرر کئے گئے ہیں، اور جس طرح قرآن کی تفاسیر تحریر کی گئی ہیں ان میں یہ دونوں اصول بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان بنیادی اصولوں کو مفسرین کرام نے اہمیت ہی نہیں دی اور آیات کی تفسیر میں سارا زور شان نزول اور متعلقہ روایات پر دیا گیا ہے۔ حالانکہ، جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے، شان نزول کی وجہ سے متعلقہ آیت کی عالمگیریت، ابدیت اور عمومیت بالکل جاتی رہتی ہے اور آیہ کریمہ کسی نہ کسی فرد یا کسی نہ کسی وقتی واقعہ سے مخصوص ہو کر رہ جاتی ہے۔ تحریک طلوع اسلام نے اس طریقہ کو بدل کر تفسیر القرآن بالقرآن کا طریقہ اختیار کیا جس کا ذکر اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ طلوع اسلام قرآن کریم کی کسی تشریح و تفسیر کو دائمی و ابدی نہیں سمجھتا اس کا نظریہ یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ آئندہ کے ازمنہ و ادوار میں جب انسانیت کی علمی سطح بلند ہوتی جائے گی، تو انسانیت قرآن فہمی میں بھی ہم سے آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ ہمارے گذشتہ مفسرین کرام

نے جو تفاسیر تحریر فرمائیں وہ اس دور کی علمی سطح کے مطابق تھیں۔ ان مفسرین کرام نے ان کی تصنیف میں بہت محنت کی ہے۔ انہوں نے جو خدمات سرانجام دیں ہمیں ان کا اعتراف کرنا ضروری ہے لیکن یہ ہماری غلطی ہے کہ ہم ان مفسرین کی تفاسیر کو دائمی سمجھ بیٹھے ہیں اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔

قرآن کریم قیامت تک کے لئے تمام انسانیت کا ضابطہ حیات ہے اس کا وعدہ ودعویٰ ہے کہ جو قوم بھی اس پر عمل کرے گی وہ غالب ہی رہے گی کسی حال میں مغلوب نہیں ہوسکتی۔ اس موضوع پر قرآن کریم میں بے شمار آیات آتی ہیں جو بار بار رسالہ طلوع اسلام کے صفحات پر پیش کی گئی ہیں۔ لیکن ہم مسلمان قرآن کریم کے ان تمام وعدوں کے علی الرغم سب سے زیادہ مغلوب ومقہور قوم ہیں۔ ان آیات کی تشریح وتعبیر میں ہمارے مفسرین کو بڑی دقت پیش آتی تھی اور ان کے لئے کوئی راہ نہیں نکلتی تھی کہ اپنے مغلوبیت وپستی کے حالات کے موجود ہوتے ہوئے، ان آیات کو کس طرح حل کریں، اس کا طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ ان آیات کو آخرت سے منسلک کردیا کہ آخرت میں اس طرح کا غلبہ واقتدار مسلمانوں کو نصیب ہوگا۔ ان آیات کی تفصیل تو بہت طویل وطولانی ہے جس کا یہ مضمون متحمل نہیں ہوسکتا۔ لیکن طلوع اسلام نے ان تمام آیات کی تشریح اس طرح کی ہے جس سے ان کا تعلق اسی دنیا میں اقتدار وغلبہ حاصل ہونے سے رکھا ہے اور مسلمانوں کے عروج واقتدار کا تعلق بھی آخرت کی بجائے اس دنیا کو قرار دیا ہے۔ ان آیات کی تفصیل مفہوم القرآن میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے، جہاں ان آیات کی تفسیر ان کے مفہوم کے مطابق کی ہے جس سے مسلمانوں میں حریت وغلبہ واقتدار حاصل کرنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

تحریک طلوع اسلام سے پیشتر آپ کسی جگہ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کسی عالم نے فرقہ بندی کے خلاف کچھ لکھا یا کہا ہو۔ ہمارے علماء کرام تو خود کسی فرقہ سے متعلق ہوتے ہیں، پھر وہ کس طرح اس کے خلاف کچھ تحریر کرسکتے ہیں۔ بلکہ وہ "اختلاف امتی رحمۃ" جیسی حدیث پیش کرکے فرقہ بندی کی تائید کرتے تھے۔ طلوع اسلام نے فرقہ بندی کے خلاف قرآنی تعلیم کو عام کیا کہ فرقہ بندی شرک ہے۔ قرآن کی رُو سے حرام ہے۔ فرقہ بندوں کا کوئی تعلق حضورؐ سے نہیں رہتا۔ طلوع اسلام نے اس نظریہ کو اس درجہ عام کیا کہ اور اس موضوع پر اتنے مقالے میں طبع کئے کہ اب عام مسلمان فرقہ بندی سے تنفر کرنے لگے

ہیں اور ہمارے علماء کرام میں بھی جو سعید روحیں ہیں وہ اس نظریہ کو درست تسلیم کرنے لگی ہیں کہ فرقہ بندی قرآن کے خلاف ہے۔ ہمارے علماء کرام اس موضوع کے خلاف اس سے زیادہ اس لئے نہیں لکھ سکتے کہ ان کی یہ اپنی مجبوری ہے کہ وہ خود فرقہ واریت کی پیداوار ہوتے ہیں وہ بھلا فرقہ بندی کے خلاف کیسے لکھ سکتے ہیں۔ ہمارے T.V چینلو پر ہمارے علماء کرام نہ صرف مختلف فرقوں کی نمائندگی کرتے ہیں بلکہ وہ ہمیشہ اپنے فرقہ کا حوالہ دے کر بات کرتے ہیں۔

ہمارے علماء کرام ڈیڑھ سو سال سے احمدی حضرات سے مناظرہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کے اپنے نظریات میں کمزوری تھی جس کی وجہ سے احمدی علماء ہمارے علماء کو لاجواب کردیتے تھے خود ہمارے علماء کرام کے جو نظریات قرآن کے خلاف ہیں۔ احمدی علماء ان خلاف قرآن نظریات سے فائدہ اٹھا کر ،ان کو ہی EXPLOIT کرتے تھے۔ احمدی حضرات مرزا کو "مسیح موعود مہدی معہود" کہتے ہیں۔ حالانکہ یہ نام ہی خلاف قرآن ہے۔ لیکن ہمارے علماء کرام ان کے اس نام پر اعتراض نہیں کرسکتے کیونکہ ان کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام مہدی بھی تشریف لائیں گے، اور وہ نزول مسیح کے بھی قائل ہیں۔ لیکن یہ دونوں نظریات قرآن کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم میں دور دور کہیں حضرت امام مہدی کے تشریف لانے کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہی نزول مسیح کا عقیدہ قرآن کے مطابق ہے اس لئے مرزا صاحب کا نام ہی غلط اور خلاف قرآن ہے۔ ہمارے علماء کرام اگر اپنے یہ دونوں خلاف قرآن نظریات ترک کردیں تو احمدیت اسی روز اپنی موت آپ مرجائے گی، مگر افسوس کہ ہمارے علماء کرام اپنے خلاف قرآن عقائد کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پرویز صاحب نے "احمدیت اور ختم نبوت" نام کی کتاب تحریر کی، اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوئیں۔ یہ کتاب کئی مرتبہ طبع ہوئی اور ادارہ طلوع اسلام نے اس کو مفت تقسیم کیا۔ پاکستان میں احمدیت کے فروغ کے خلاف اس کتاب نے نہایت مضبوط بند باندھ دیا۔ لیکن اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے علماء کرام نے محض تعصب کی وجہ سے اس کتاب کی پذیرائی نہیں کی اور نہ ہی اپنے نظریات میں کوئی اصلاح کی۔

مغرب کے نظریات سے متاثر حضرات جو اسلام کو محض ایک چلا ہوا کارتوس

سمجھتے تھے ان کے لئے الگ کثیر تعداد میں مواد فراہم کیا گیا۔ "سلیم کے نام" کی تین جلدوں میں 44 خطوط ہیں۔ اس کتاب سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان متاثر ہوئے۔ قرآن کریم کی حقانیت، قرآن کی رُو سے اللہ کا تصور، وحی کی ضرورت، مقام نبوت، اطاعت رسول، مقام محمدی، قسم کے تمام اہم مضامین کی اس کتاب میں اس طرح وضاحت کی گئی ہے کہ ممکن ہی نہیں کہ قاری اس سے متاثر نہ ہو۔ یہ کتاب ایک ایسا دلدل ہے کہ ہر قاری جس قدر بھی باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے وہ اس کے اندر دھنستا چلا جاتا ہے اور اس کتاب کے نظریات عقلی طور پر ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہماری ایک ہزار سال کی تاریخ میں اس سے بہتر کوئی کتاب علم کلام پر دستیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کتاب نے علم کلام کا ایک نیا طریقہ اور ایک نیا عنوان قائم کر دیا ہے جو ضروریات حاضرہ کے مطابق بھی ہے اور جو موجودہ تعلیم یافتہ ذہن کو مطمئن کر دیتا ہے۔ ہمارا سابقہ علم کلام، آج کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے بالکل قاصر ہے۔

مغرب سے متاثر حضرات کے علاوہ کمیونزم کی تردید میں اس قدر اہم اور پُر مغز کتب و مقالات تحریر کئے گئے کہ خود مغرب میں بھی کمیونزم کے خلاف اس درجہ کا علمی کام نہیں ہوا ہوگا۔ "نظام ربوبیت"۔ "جہاں مارکس ناکام ہوا اس سے آگے"۔ "ماؤزے تنگ اور قرآن" جیسی کتاب اور مقالات طبع کئے گئے۔ پاکستان میں اس علمی کام کے بعد کمیونزم کا سیلاب بالکل رُک گیا ان کتابوں کے تحریر کرنے کی وجہ سے ہمارے علماء کرام کو تحریک طلوع اسلام کی پذیرائی کرنی چاہیئے تھی کیونکہ ہمارے علماء کرام تو اس قسم کے موضوعات پر چند سطور بھی تحریر نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے علمائے کرام نے ان کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔

ہمارے ہاں جب تاریخ نویسی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں چند وجوہات کی وجہ سے معروضیت (OBJECTIVITY) بالکل نہیں رہی، اس لئے ہماری تاریخ کا بیشتر حصہ حقائق اور اصلیت کے بالکل خلاف ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہوئی کہ تاریخ نویسی سے بیشتر فرقہ بندی شروع ہو چکی تھی، اس لئے تاریخ میں زیادہ تر فرضی روایات، خود تراشیدہ قصے، لوگوں کے فرضی فضائل و معائب سب داخل ہو گئے۔ ہر فرقہ نے اپنے فرقہ کے موافق اور دوسرے فرقہ کے خلاف مواد فراہم کیا۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ ہر شخص جانتا ہے کہ جو حکومت زبردستی قبضہ کرتی ہے وہ سابقہ حکومت کو بہت بُری صورت میں پیش کرتی ہے جس سے وہ

اپنے اقتدار کا جواز ثابت کرتی ہے۔ ہماری تاریخ بنو عباس کے دور میں تحریر کی گئی ہے انہوں نے بنوامیہ سے حکومت زبردستی لی تھی، اس لئے ہمارے مورخین نے، اپنے دور کی ملوکیت سے متاثر ہوکر، بنوامیہ کو بہت برے انداز میں DEPICT کیا ہے۔ خصوصاً امیر معاویہ کی سیرت بہت بری بیان کی ہے۔ بنو عباس کے دور میں عموماً جانشینی کے مسئلہ پر کشت وخون ہوا کرتا تھا۔ جو مدعی خلافت دوسرے کو قتل کردیتا تھا وہ زبردستی قوت کے زور پر جانشین بن جاتا تھا۔ محض اس کشت وخون کو جائز قرار دینے کے لئے جنگ جمل وجنگ صفین وجنگ نہروان کے واقعات بیان کئے گئے کہ جب حضرت علی، حضرت عائشہ اور امیر معاویہ جانشینی کے مسئلہ پر جنگ کرسکتے تھے، تو یہ ہمارے دور میں بھی جائز ہے۔ جبکہ قرآن کریم کی رُو سے صحابہ آپس میں جنگ وقتال نہیں کرسکتے تھے (48/29 ۔ 19/96) اسی طرح اپنے لئے نابالغوں کے ساتھ شادی کرنے کا جواز تلاش کرنے کی خاطر حضرت عائشہ کی عمر نکاح کے وقت صرف 9 سال کی قرار دی گئی۔ حالانکہ قرآن کریم نے بلوغت کو نکاح کی شرط قرار دیا ہے (4/6) طلوع اسلام میں بھی حضرت عائشہ کی عمر کے بارے میں تحقیقی مقالات شائع ہوئے جن میں واضح کیا گیا کہ حضرت عائشہ کی عمر رخصتی کے وقت 19 سال کی تھی۔ طلوع اسلام کی یہ خدمت بہت اہم ہے کیونکہ اکثر مستشرقین اور مذہب برگشتہ حضرات اس بارے میں بہت دریدہ دہنی سے کام لیتے ہیں تاریخ کے بارے میں ہمارے علماء کرام کا موقف یہ ہے کہ وہ تاریخ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں اور قرآن کو ثانوی حیثیت دے کر، قرآن کی تفسیر اس انداز سے کرتے ہیں کہ تاریخ کا کوئی واقعہ غلط ثابت نہ ہوسکے۔ اس کے برخلاف تحریک طلوع اسلام کا اصول یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو اساسی معیار قرار دیتی ہے ہر وہ واقعہ جو قرآن کے مطابق ہے وہ درست ہے اور تاریخ کی ہر وہ بات جو قرآن کے خلاف جاتی ہے وہ غلط ہے خواہ اس کے ذرائع کتنے ہی قابل اعتبار کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ ہماری تاریخ کی تو یہ حالت ہے کہ حضورؐ نے دس سال نماز پڑھی روزانہ پانچ وقت پڑھی، صحابہ کے مجمع میں پڑھی، لیکن تاریخ و روایات سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ حضورؐ نے نماز کس طرح ادا کی۔

پرویز صاحب حب رسول میں سر سے پاؤں تک غرق تھے۔ ان کی رگ رگ اور نس نس میں حضورؐ کی محبت موجزن تھی حضورؐ کی سیرت پر انہوں نے جو کتاب "معراج انسانیت" تحریر کی ہے اس کے صفحہ صفحہ اور سطر سطر سے حب رسول اُبلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

جن علمائے کرام نے ان کی یہ کتاب مطالعہ کی وہ سب حیرت میں رہ گئے کہ ان کا تصور پرویز صاحب کے متعلق کیا تھا، اور کتاب پڑھ کے ان کے متعلق کیا تاثر ہوتا ہے۔ راقم سطور علماء کرام سے بصد التجاء درخواست گذار ہے کہ وہ حضورؐ کی سیرت کے سلسلہ میں یہ کتاب ضرور مطالعہ فرمائیں، اس کے مطالعے سے ان کے حب رسول میں اضافہ ہوگا۔

ہمارے علماء کرام میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ قرآن کو سمجھنے اس پر غور وخوض کرنے کے لئے امام راغب کی مفردات اور زمخشری کی کشاف کفایت کرجاتی ہیں۔ اگر کسی کے پاس کوئی اور کتاب نہ ہو تو اُن کے خیال کے مطابق صرف یہ دو کتابیں ہی قرآن فہمی کے لئے کافی ہیں۔ یقیناً یہ دونوں کتابیں بہت بلند مقام کی حامل ہیں۔ لیکن موجودہ دور میں پرویز صاحب کی لغات القرآن اور ان کا تحریر کردہ مفہوم القرآن، قرآن فہمی کے لئے کلید کا درجہ رکھتی ہیں۔ راقم سطور علماء کرام سے نہایت عاجزی سے گذارش کرتا ہے کہ وہ ان دونوں کتابوں کو کشادہ دلی اور بالغ نظری سے مطالعہ فرمائیں وہ ان کتابوں کو انشاء اللہ راغب کی مفردات اور زمخشری کی کشاف سے بہتر پائیں گے۔ ان دو کتابوں کے مطالعہ کی مدد سے آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ قرآن کریم کی ہر آیت اپنا مفہوم خود بول کر آپ کے سامنے پیش کر رہی ہے۔

جیسا کہ صدر مضمون میں تحریر کیا گیا ہے کہ تحریک طلوع اسلام کا مزاج شخصیت پرستی سے ابا کرتا ہے، اس لئے اس مضمون میں حتی الامکان پرویز صاحب کا حوالہ نہیں دیا گیا لیکن ہمارے مذہبی حلقوں میں چونکہ ان کے خلاف ایک سکیم کے مطابق عمداً پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ اس لئے چند فقرے ان کی سیرت کی پختگی کے لئے تحریر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، انہوں نے بوجہ انکسار اپنی زندگی کو تحریک سے بالکل الگ رکھا اس وجہ سے ان کی ذاتی باتیں نہ تو لوگوں کو زیادہ تر معلوم ہیں، اور نہ ہی ان کو معلوم کرنے کی چنداں ضرورت ہے۔ البتہ صرف چند اصولی باتیں جو ایک داعی قرآن میں ہونی چاہئیں ان کا مختصر سا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

کسی کی دعوت پر غور وفکر کرنے اور اس کا اتباع کرنے کا ایک سنہرا اصول قرآن کریم نے خود بیان فرمادیا اتَّبِعُوا مَنْ لَّا يَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا (36/21)، ایسے لوگوں کا اتباع کرو جو تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتے آپ قرآن کریم کے اس اصول کو کسوٹی

ومیزان بنائیں پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ہمارے ہاں کتنے ایسے حضرات ہیں جو اس اصول پر پورے اترتے ہیں۔ اس اجر میں صرف مالی منافع ہی مذکور نہیں ہے۔ اس اجر میں سیاسی اقتدار بھی شامل ہے۔ یہ جو ہمارے سیاسی راہنما قوم کے غم میں گھلے جاتے ہیں، آپ ان سے کہیں کہ بغیر کرسی حاصل کئے قوم کی خدمت کریں، پھر آپ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کتنے لوگ ہیں جو بغیر اجر کے کوئی خدمت کرنے کو تیار ہوں گے۔ یہی صورت ہمارے علماء کرام اور مشائخ عظام کی ہے، انہیں مالی اجر بھی ملتا ہے، اور مریدوں کے دلوں پر حکومت بھی۔ اس ایک ہی اصول کو پیش نظر کرر کھ کر، پرویز صاحب کی سیرت ملاحظہ فرمائیں۔ انہوں نے ساری عمر قرآن کریم کی خدمت میں گذاردی۔ ہزارہا صفحات تحریر کئے، تصنیف وتالیف میں حد درجہ معروف ومشغول رہے، لیکن اس کے باوجود کسی پر بوجھ نہیں بنے۔ ساری عمر ملازمت کی اور صرف اپنی تنخواہ پر گزارہ کیا۔ کبھی کسی سے ایک پیسہ طلب نہیں کیا۔ ساری عمر نہایت سادگی سے بسر کی۔ ان کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ جب بزم میں قائم ہوئیں یا جب طلوع اسلام کالج کے لئے دوسو کنال زمین خریدی، تو وہ کسی مالی معاملہ میں INVOLVE نہیں ہوئے۔ تحریک کے دوسرے ارکان رقوم کا حساب رکھتے تھے۔ نہ ہی انہوں نے کسی کو بیعت کیا۔ نہ اپنے لئے کوئی مقام خاص کیا مختصر یہ کہ وہ اس آیۃ کریمہ کی میزان پر صد فیصد کامیاب اترتے ہیں، اور کسی سے کوئی مالی، سیاسی، یا مزعومہ روحانی اجر طلب نہیں کیا۔

حضورؐ نے اپنی سیرت کو اپنی نبوت کی صداقت کی دلیل میں پیش کیا تھا فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (10/16)، میں تم میں اس سے پیشتر مدتوں رہ چکا ہوں، تو کیا تم نہیں سمجھتے۔ اسی لئے ہر داعی قرآن کے لئے ضروری ہے کہ وہ حضورؐ کی پیروی کرتے ہوئے اپنی سیرت کو پختہ تر رکھے۔ اسی لئے پرویز صاحب اپنی سیرت میں نہایت پختہ تھے، جھوٹ، کذب بیانی، الزام تراشی قسم کے عیوب سے انہیں سخت نفور تھا، ان پر چاروں طرف سے یلغار تھی۔ تقریباً بیس، پچیس ماہانہ رسالے ان کے خلاف مضامین ومقالات چھاپتے رہتے تھے، جو تمام ان کی نظر سے گذرتے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر مضامین میں ان کے خلاف کذب بیانی یا الزام تراشی سے کام لیا جاتا تھا۔ لیکن انہوں نے ان کے جواب میں نہ تو کبھی کوئی الزام تراشی کی اور نہ ہی کوئی سوقیانہ زبان استعمال کی۔ 1963ء میں جب ان کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری ہوا تو انہوں نے ایک سچے، مخلص داعی،

قرآن کی طرح تحمل و برداشت سے کام لیا، اور کسی سے کوئی گلا شکوہ نہیں ہوا۔

جب تحریک طلوعِ اسلام کی دعوت پر تعلیم یافتہ حضرات آہستہ آہستہ قرآن کے قریب آنے لگے، تو قرآنی نظریات کی مزید نشر و اشاعت کی خاطر بزمیں قائم کی گئیں اور سالانہ کنونشن بھی منعقد ہونے لگی۔ پرویز صاحب کا اگرچہ ذاتی طور پر ان بزموں سے کوئی رابطہ نہیں تھا، لیکن بزموں کے جن حضرات کو وہ جانتے تھے وہ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور اپنی شدید ترین مصروفیت کے باوجود ان سے ملنے سے اجتناب نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم میں حضورؐ کو حکم ہوا تھا۔ وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِلۡمُؤۡمِنِیۡنَ (15/88) اور ایمان والوں سے جھک کے ملا کرو۔ چنانچہ حضورؐ اس حکم کے مطابق اپنے صحابہ سے، بہت محبت کرتے تھے۔ اسی سنّت کی پیروی میں پرویز صاحب بھی قرآنی فکر کے لوگوں سے، بہت خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ جب سالانہ کنونشن ہوتی تھی تو وہ ہر بزم کے ارکان کو خود خوش آمدید کہتے تھے اور سب سے بغلگیر ہوتے تھے۔ کنونشن کے قیام کے دوران، سب سے رابطہ رکھتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ کسی کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ وہ طبعاً بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ ان کے خلاف جو ایک جھوٹا تاثر پیدا کیا گیا ہے، اس کو پیش نظر رکھ کر یہ چند سطور تحریر کی گئی ہیں ورنہ اس مضمون کا مقصد ان کی LIFE پیش کرنا نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

طبعی زندگی کے مفاد خواہ کتنے ہی زیادہ کیوں نہ ہوں اخروی زندگی کے مفاد کے مقابلہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتے۔ موت تو بہر حال آنی ہے پھر ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو کیوں ترجیح نہ دی جائے۔ طبعی موت ایک بے اختیار عمل ہے اور حق کی خاطر جان دے دینا عمل بااختیار، اسی میں رازِ حیات ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک آیت کریمہ کی تشریح

رسالہ صوت الحق قرآن خالص اور دین کے قیام کا داعی ہے۔ اس کے قارئین کا حلقہ آہستہ آہستہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ اور اس کا پورا (CREDIT) اس کے مدیر جناب حسین امیر فرہاد کو جاتا ہے، کہ وہ اس عمر میں بھی دن رات اس کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ اس کے قارئین کے حلقہ کا وسیع تر ہونے اور اس حلقہ کا اس کے مضامین و نظریات کو اہمیت دینے کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ قارئین کرام کے استفسارات اور اعتراضات میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اعتراضات کی بھی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ قارئین تک پیغام پہنچ رہا ہے اور وہ اس کو اہمیت دے رہے ہیں۔ یہاں تک تبلیغ کا نصف حصہ سرانجام پا جاتا ہے۔

پشاور سے چند حضرات نے آیۃ **سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَ الۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ** (15-87) کا مفہوم دریافت فرمایا ہے، اس رسالے کے قارئین چونکہ قرآن کریم کے طالب علم ہیں اور اس کے شیدائی ہیں اس لئے ان کے خطوط ملنے سے خوشی ہوتی ہے اور ان کے جوابات دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کے حکم کے مطابق اس آیۃ کریمہ کی تشریح کے بارے میں چند گزارشات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔ **و ھو الرحمٰن و علیہ التکلان۔**

ہمارے مفسرین کرام نے اس آیۃ کریمہ میں **سبعاً من المثانی** سے مراد سورۃ الفاتحہ کی سات آئتیں قرار دی ہیں جو نماز کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ مفسرین کرام کے نزدیک اس سے مراد **السبع الطوال** یعنی سورۃ بقرہ سے لے کر اعراف تک سات لمبی سورتیں ہیں۔ بعض مفسرین نے قرآن کی تمام سورتوں کو اس کا نحوی (مثنا) قرار دیا ہے۔ کیونکہ ان تمام سورتوں میں واقعات تکرار کے ساتھ آئے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ **سبع مثانی** سے **حٰم** والی سورتیں مراد ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے اس کا ترجمہ "درآئینہ دادم ترا ہفت آیت

ازآنچہ درنمازمکررخواندہ میشودیعنی سورۃ فاتحہ ودادیم ترا قرآن بزرگ" کیا ہے۔ان کے محترم ومکرم صاحبزادے جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ "اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آئتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجے کا" تحریر فرمایا ہے۔حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے اس کا ترجمہ کیا "اور ہم نے دی ہیں تجھ کو سات آئتیں وظیفہ اور قرآن بڑے درجے کا" لکھا ہے۔اور اس ترجمہ پر بطور تفسیر شیخ الاسلام جناب مولانا عثمانی نے تحریر فرمایا ہے سبع مثانی کے مصداق میں اختلاف ہے صحیح اور راجح یہ ہے کہ اس سے مراد سورۃ فاتح کی سات آئتیں ہیں جو ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں۔جن کو بطور وظیفہ کے بار بار پڑھا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ کے بارے میں تمام مفسرین نے یہ موقف اختیار کئے ہیں۔چند اور اقوال بھی ہیں جو چنداں لائق توجہ نہیں ہیں۔

(۱) اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔جس کے اندر بسم اللہ شریف کو بھی شامل کر کے سات آیت بنتی ہیں۔اور یہ نمازوں میں بار بار دہرائی جاتی ہیں۔

(۲) اس سے مراد قرآن کی ابتدائی سات سورتیں ہیں۔

(۳) اس سے پورا قرآن مراد ہے۔

جب سے قرآن کریم کی تفاسیر کا سلسلہ شروع ہوا ہے ہمارے ہاں تفسیر القرآن بالروایات کا ایک ہی طریقہ چلا آرہا ہے۔قرآن کی تفسیر تحریر کرنے کا یہ طریقہ مذہب کی طرف منتج ہوتا ہے، کیونکہ تمام روایات مذہب ہی کی تائید کرتی ہیں۔البتہ تفسیر القرآن بالقرآن میں چونکہ قرآن خالص سامنے آتا ہے اور یہ طریقہ تفسیر خارجی و بیرونی نظریات کو نہ صرف داخل نہیں ہونے دیتا بلکہ خارجی نظریات کی جڑ کاٹ دیتا ہے اس لئے اس طریقہ تفسیر سے دین کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔اس آیت کریمہ میں تفسیر القرآن بالروایات کے ذریعے جو مذہبی مفہوم بنتا ہے وہ جناب کی خدمت عالی میں پیش کیا جاچکا ہے اب اس کا دینی مفہوم تفسیر القرآن بالقرآن سے پیش کیا جاتا ہے۔

آپ ایک ہزار سال کی ساری سابقہ تفاسیر ملاحظہ فرمائیں خواہ سلف کی ہو یا خلف کی سب نے اس آیت میں سبع کے معنی سات (SEVEN) کے لئے ہیں۔حتیٰ کہ راغب اصفہانی نے بھی اپنی مفردات میں اسی پر اکتفا کیا ہے، لیکن لغات القرآن میں

مختلف حوالوں سے پرویز صاحب نے اس کے معنی متعدد (SEVERAL/MAN Y) دیئے ہیں لیکن، مختلف لغات کے حوالوں سے بھی طبیعت مطمئن نہیں ہوئی تھی جب تک کہ قرآن کریم کی اپنی کوئی سند نہ ہو اس لئے انہوں نے قرآن سے بھی ایسی مسکت (خاموش کرا دینے والی) سند دی ہے جسے کوئی سرکا نہیں سکتا اور جسے رد کرنے کی کسی کو مجال نہیں۔

جس سند سے سبع کے معانی متعدد اور کئی SEVERAR ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ (2-261) ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اگائے اور ایک بالی میں سو سو دانے ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہاں سبع سنابل سے مراد متعدد (SEVERAL) ہے یہاں اس آیت کریمہ نے سبع کے معنی بہت (MANY) واضح کر دیئے ہیں۔ مثانی مثنیٰ کی جمع ہے اس کے معنی ہیں بار بار دہرائی جانے والی چیز۔

قرآن کریم کا مقصد اس دنیا میں دین کا قیام ہے، قرآن کریم صرف دین کا نظام ہی نہیں دیتا جو میکانکی طور پر کسی طرح بھی قائم کر دیا جائے بلکہ وہ اس نظام کو قائم کرنے کے چند سنہری اصول بھی خود ہی تجویز کر دیتا ہے ان متعدد اصولوں میں سرفہرست یہ اصول ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13-11) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت میں تغیر نہ کریں اللہ ہرگز اس قوم میں تغیر نہیں کرتا۔ قوم کا داخلی تغیر، اس کے عروج اور زوال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے مومنین کے سامنے نہ صرف اصول پیش کیا بلکہ انہیں اس بات کی دعوت بھی دی کہ وہ اس اصول کا اطلاق بھی مختلف قوموں میں دکھا کر اس سے علیٰ وجہ البصیرت اطمینان حاصل کریں۔ اسی وجہ سے قرآن کریم فلسفہ تاریخ اور قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں بیان کرتا ہے۔

قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر غور و تفحص کرنے کے لئے خود قرآن نے اتنا مواد فراہم کر دیا کہ اگر کوئی مفکر اس موضوع پر ساری عمر تحقیق کرتا رہے تو اس کو قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ البتہ مزید اطمینان کے لئے تاریخ داں مفکرین کے نتائج کو بھی دیکھ لے کہ ان کی موجودہ فکر بھی قرآن کریم کے اصولوں کی تائید کرتی ہے؟ تاریخی نظائر اس لئے دیئے گئے ہیں کہ مفکرین تاریخ یہ دیکھ سکیں کہ فلاں قوم نے اس قسم کا نظام قائم

کیا تھا تو ان کا انجام کیا ہوا؟

سورۃ مومن میں ہے اَوَ لَمۡ یَسِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ فَیَنۡظُرُوۡا کَیۡفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیۡنَ کَانُوۡا مِنۡ قَبۡلِہِمۡ کَانُوۡا ہُمۡ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ قُوَّۃً (40-20-30/9) یہی الفاظ تین مرتبہ آئے ہیں۔ کیا ان لوگوں نے زمین پر چل پھر کر نہیں دیکھ لیا کہ جو قومیں ان سے پیشتر ہوئی ہیں ان کا انجام کیا ہوا؟ ۔دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَمَثَلًا مِنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَمَوۡعِظَۃً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ (24-34) ہم نے تو تمہارے پاس ایسی واضح روشن آیتیں بھیجیں اور جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے حالات اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت کی باتیں نازل کیں۔ اس آیت کریمہ میں مثلاً من الذین خلوا من قبلکم کا ترجمہ "جو لوگ تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے حالات رقم کیا گیا ہے۔ اسی حصہ کا ترجمہ حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے فرمایا" اور کچھ حال ان کا جو ہو چکے تم سے پہلے" آیت کے اس حصہ کی وضاحت قرآن کریم نے بے شمار مواقع پر کی ہے۔ اور ہر جگہ اس حصے کی وضاحت میں قوموں کے عروج و زوال کا کوئی نہ کوئی سبب بیان کیا ہے نمبر (9-30-20-40) دونوں میں ارشاد ہے کہ ان کے پاس ہمارے رسول واضح قوانین کے ساتھ آتے رہے، لیکن انہوں نے ان کے احکام سے انکار کیا تو اللہ نے ان کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ قانون الٰہی کے وجود سے انکار ان کی تباہی کا سبب بنا۔

وہ ازمنہ و اعصار جن میں حق و باطل کی کشمکش جاری رہتی ہے۔ اور جن میں حکومت الٰہی قائم کرنے کے لئے جدوجہد کی جاتی ہیں کو قرآن کریم نے ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا مُوۡسٰی بِاٰیٰتِنَاۤ اَنۡ اَخۡرِجۡ قَوۡمَکَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ وَ ذَکِّرۡہُمۡ بِاَیّٰىمِ اللّٰہِ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوۡرٍ (14-5) اور ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا تا کہ قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے اور انہیں اللہ کے وہ دن یاد دلائے اس میں شک نہیں کہ اس میں تمام صبر شکر کرنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں ۔یہاں موسیٰ کی جدوجہد اور زوال سے عروج کی طرف ان کے دنوں کو ایام اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جن کو یاد دلانے کی تاکید نکر ھم میں آتی ہے۔ اس حقیقت کو (11-20) میں ذکری کے لفظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔

تعریف آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ آیت کریمہ وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ (15-87) میں جو الفاظ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ کے آئے ہیں ان کا وہی مفہوم ہے جو دوسری جگہ مَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (24-34) یا ایام اللہ اور ذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ کا آیا ہے یعنی قوموں کے عروج و زوال کے تاریخی شواہد و نظائر۔ آیۃ کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے تمہیں قرآن کریم دیا اور اس قرآن میں ہی وہ بہت سے (سبعًا) تاریخی واقعات و اصول بیان کر دیئے ہیں جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ قرآن کریم قوموں کے عروج و زوال کے جو اسباب بیان کر رہا ہے وہ بالکل درست ہیں اور ان سابقہ اقوام کے حالات ان کی تائید کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ جن اقوام تک اللہ کا پیغمبر یا اس کی وحی پہنچی ہے صرف ان سے ہی مواخذہ کیا جائے گا۔ جن اقوام تک وحیِ الٰہی نہیں پہنچی ان کی گرفت و مواخذہ نہیں لے گا۔ یہ بات ہے بھی معقول کہ جن کے پاس تعلیم ہی نہ جائے ان کا محاسبہ کیسا؟ ارشاد ہوتا ہے۔ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ۝ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ فَكَذَّبْنَا (67-8) جب اس (دوزخ) میں کوئی گروہ ڈالا جائے گا تو ان سے داروغۂ جہنم پوچھے گا، کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا؟ وہ کہیں گے ہاں ہمارے پاس ڈرانے والا تو آیا تھا مگر ہم نے اس کو جھٹلا دیا۔ اسی لئے حضور کو حکم تھا۔ وَ اَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ (14-44)

اور اے رسول لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس دن ان پر عذاب نازل ہوگا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے قم فانذر (74-2) اے رسول اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ نیز یہ حکم ہوا وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا (6-51) (اے رسول اس قرآن کے ذریعے تم ان لوگوں کو ڈراؤ جو اس بات کا خوف رکھتے ہیں کہ وہ اکھٹے کیے جائیں گے۔

اسی طرح کی اور متعدد آیات جن میں حضورؐ کے لئے پوری انسانیت کو قرآن کے ذریعے ڈرانے کا حکم ہے، یہ حکم صرف حضورؐ کے دور کے ساتھ مختص نہیں تھا۔ کیونکہ یہ تمام اقوام و امتوں پر حجت ہے۔ آج کے دور کی اقوام بھی جن کے پاس وحی نہیں پہنچ سکی وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم تک کوئی نذیر یا اس کی وحی کی تعلیم نہیں آئی، اس لئے ہم گرفت یا

مواخذہ سے باہر ہیں آیۃ کریمہ (6-51) نے وضاحت کردی کہ حضورؐ قرآن ہی کے ذریعہ ڈراتے تھے اور جب تک قرآن باقی ہے مومنین پر فرض ہے کہ وہ دیگر اقوام کو ان کے غلط اعمال کے تخریبی نتائج سے ڈرائیں یہ ہر مومن پر قیامت تک فرض رہے گا۔

بالکل یہی صورت ذَكِّرْهُمْ بِأَيَّامِ اللّٰهِ کی ہے (14-5) انہیں اللہ کے دن یاد دلاؤ یہ ہم سب مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم اس کشمکش حق و باطل و حکومت الٰہی کے قائم کرنے کی جدوجہد کو ہمیشہ یاد رکھیں اور جو جماعت بھی دین کے تمکن کے لئے اٹھ کھڑی ہو وہ قرآن میں مذکورہ ان قوانین کو سامنے رکھے جن کے ذریعے انبیاء کرام نے دین قائم کیا تھا۔ اور ان ہی قوانین کو اس جماعت کا لیڈر اپنی جماعت کے سامنے پیش کرتا رہے، ان کی یاد دھانی کراتا رہے۔ اور یہی وہ **مثلاً من الذین خلوا** اور۔ **سبعاً من المثانی**۔ ہیں جو قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔

؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟ ؟؟؟؟

ایک جائز اور دوسرا ناجائز

یہ عجیب بات ہے کہ جب قیام پاکستان کی کوششیں ہو رہی تھیں کہ اس طرح ایک اسلامی حکومت کے قیام کا راستہ صاف ہو رہا تھا، تو اسی دیوبند کے اس زمانہ کے علماء کرام و مفتی صاحبان نے، اسلامی حکومت کے قیام کے خلاف سخت کوششیں کی تھیں۔ کیا اس وقت ان قابل احترام شخصیات کو یہ معلوم نہیں تھا کہ سود حرام ہے اور متحدہ ہندوستان میں سود ختم نہیں کیا جاسکے گا۔ قرآن کریم نے سود کھانے کو اللہ و رسول سے محاربہ قرار دیا ہے۔ اور اسلامی حکومت کی مخالفت و معاندت کو بھی اللہ و رسول سے محاربہ قرار دیا ہے (متعلقہ آیات اوپر تحریر کردی گئی ہیں)۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پاکستان کے قیام کی مخالفت کرنا، جو اللہ و رسول کے خلاف محاربہ تھا، وہ تو ان محترم حضرات کے لئے جائز تھا، لیکن سود، جو اللہ و رسول کے خلاف محاربہ ہے، وہ ان کے نزدیک حرام ہے، ایک محاربہ جائز اور دوسرا ناجائز کیسے ہوسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆

اللہ ورسول کی پکار
اور اس کے جواب کا صحیح مفہوم

مومن صرف اور صرف وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ، واحد مکمل اور آخری ضابطہ حیات اور آخری دین تسلیم کرے، اسی لئے ہر مومن کا فرض عین ہے کہ وہ اس دنیا میں دین الٰہی کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے، وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے، کیونکہ دین خداوندی کسی قیام یا کسی دور سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ وہ تمام نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اُکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اللہ کے قانون اور اس کے دین کو جاری کرے۔ کیونکہ اسی نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے اور جو لوگ اللہ ورسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ازحد ضروری ہے کہ اُن کا دیا ہوا دین جاری کریں۔ جو لوگ بھی اللہ کے نظام یا دین کے علاوہ کسی بھی اور دین کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی، عاصی، نافرمان اور مجرم ہیں (6/122) خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند ہوں اور کتنے ہی درود وظائف ادا کرتے ہوں۔ دین صرف وہ ہے جو قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اور قرآن کے چھوڑنے سے ہی دین چھوٹ گیا۔ آج پھر اسی دین سے تمسک صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب ہم یہ یاد کرلیں کہ دین اور قرآن کریم ایک ہی حقیقت ہیں۔ دین قرآن کے اندر ہے اور جو بات قرآن کریم کے اندر نہیں وہ دین نہیں۔ اسی خالص دین کا اتباع کرنے سے صدر اول کے مسلمانوں نے عروج واقبال حاصل کیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد اسی کو ترک کرنے سے انہیں زوال وادبار سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ اس دین پر عمل کرنے سے ہر مردہ قوم زندہ ہوسکتی ہے شرط صرف اتنی ہے کہ اس دین پر پورا پورا عمل کیا جائے اور اس میں غیر قرآنی نظریات کی آمیزش نہ کی جائے اور اگر اس طرح اس کی تعلیم پر عمل کیا جائے تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قوم زندہ اور دیگر اقوام پر غالب نہ آجائے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا

حتمی وعدہ ہے کیونکہ ان اللہ لا یخلف المیعاد اللہ تعالیٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا آج اس مضمون کا یہی موضوع ہے۔ لیکن اس مضمون کو ملاحظہ فرمانے سے پیشتر چند ضروری گذارشات بطور تمہید کے پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں۔

قرآن کریم کے مطابق اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے "سمعنا واطعنا" یعنی "سماعت واطاعت"، لازم وملزوم ہیں۔ یعنی اطاعت الٰہی کے لئے ضروری ہے کہ ایک زندہ اتھارٹی کی طرف سے احکامات جاری ہوں، پھر سب مسلمان اُن احکامات کی اطاعت کریں اس خیال سے کہ قرآن کریم کا یہ نادر اور اساسی نقطہ نظر قارئین کرام کے اذہان عالیہ میں مُرتسم ہوجائے، اس کی تائید میں (4) آیات کریمات یکجا تحریر کی جاتی ہیں

۔

(۱) وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (5/7) اور جو احسانات اللہ نے تم پر کیئے ہیں ان کو اور اس عہد کو یاد کرو جس کا تم سے پکا اقرار لے چکا ہے، جب تم نے یہ کہا تھا کہ ہم نے (احکامات اللہ کو) سُنا اور مان لیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید سے باخبر ہے۔

(۲) كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2/285) مومنین بھی سب کے سب اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں پر ایمان لائے (اور کہتے ہیں کہ) ہم اللہ کے پیغمبروں میں کسی میں تفریق نہیں کرتے۔ اے پروردگار ہم نے سنا اور مان لیا، ہم تیری مغفرت کی خواہش کرتے ہیں، اور تیری ہی طرف لوٹ کے جانا ہے۔

(۳) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اے ایمان والوں، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب تم سن رہے ہو۔

(۴) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24/51) ایمان

والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کردیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے (حکم) سُنا اور مان لیا، اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

مندرجہ بالا چار آیات کریمات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ اطاعت کرنے سے پیشتر احکامات الٰہی کا سُننا، لازمی قرار دیا گیا ہے۔ سماعت واطاعت آپس میں اس طرح لازم وملزوم ہیں کہ اس کے لئے ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا لازمی ہے کہ جو احکامات جاری کرے اور مومنین اس کے احکامات کو سُن کر اس کی اطاعت کریں۔ اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت شمار کی جاتی ہے۔ اس موضوع کے بارے میں اس موقر جریدہ میں اس قدر مضامین تحریر کیے گئے ہیں کہ ان کو بار بار دُہرانے کر قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ (اس کے لئے کمترین کا مضمون اساس محکم اکتوبر 2004ء صوت الحق میں ملاحظہ فرمائیں) ان سب مضامین میں بے شمار آیات کریمات سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ "اللہ ورسول" کے الفاظ قرآن کریم کی ایک اپنی وضع کردہ اصطلاح ہے جس کے معنی اسلامی حکومت کی فائنل اتھارٹی، اسلامی حکومت کا مرکز، امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، صدر مملکت یا جو نام بھی آپ اس کا تجویز فرمالیں۔ اس سے وہ مراد ہے، وہ ایک ایسی اتھارٹی ہوتی ہے کہ جو قرآن کریم کے احکامات نافذ کرتی ہے، خود ان احکامات کی اطاعت کرتی ہے، اور مومنین سے اس کی اطاعت کراتی ہے۔ اس کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ اس نظام کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے بلکہ انسان کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے صرف اس نظام کی معرفت ہی قائم ہوسکتا ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ سے انسان کا تعلق قائم رکھنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی رُو سے اللہ اور بندے کا ذاتی نجی، پرائیویٹ تعلق قائم نہیں ہوسکتا۔ اس طرح کا تعلق صرف مذہب اور دھرم میں قائم ہوتا ہے، دین میں اس کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین میں اللہ اور بندے کا پرائیویٹ تعلق قائم ہی نہیں ہوسکتا۔ اللہ ورسول کے معنی فائنل اتھارٹی کے ہوتے ہیں، اس کے لئے آپ اپنے نسخوں میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں

(4/100, 59/4, 59/8, 9/3, 9/1, 3/172, 8/13, 5/33, 33/57)

یہ تھی قرآن کریم کی تعلیم کہ جس میں پہلے احکامات خداوندی کو براہ راست

سربراہ مملکت سے سُنتا اور پھر اس کے احکامات پر عمل درآمد کرنا تھا۔ اس طرح نظام کا قیام لازمی اور لابدی ہوجاتا ہے۔ اور اس اطاعت کو ایک اطاعت قرار دیا جاتا ہے، اور اس طرح اللہ ورسول کی اطاعت ایک ہی اطاعت شمار ہوتی ہے، لیکن ہم مسلمانوں کی بدبختی کہ ہم نے ان واضح آیات کے باوجود "سماعت" کی شرط کو جو کہ اطاعت کے لئے لازمی قرار دی گئی تھی، درمیان سے نکال دیا۔ جس کی وجہ سے اسلامی نظام کے قیام کی ضرورت بھی لازمی نہیں رہی اور صرف ایک لفظ کے محو (Ignore) کرنے سے قرآن کریم کی ساری تعلیم کی عمارت خود بخود منہدم ہوگئی۔ اب اطاعت الٰہی کو سربراہ حکومت کی واحد اطاعت کے بجائے، دو اطاعتیں قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذریعہ قرآن کریم، اور حضورؐ کی اطاعت کا ذریعہ روایات قرار دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ آیات جو نظام اسلامی کو پیش نظر رکھ کر، معمولی غور کے بعد، صحیح طور پر سمجھ میں آجاتی ہیں، وہ نظام کے تصور کو نکال دینے کے بعد کسی طرح بھی صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ اور قرآن کریم کی بے شمار آیات چیستان بن کے رہ گئیں۔ اس سلسلہ میں صرف مثال کے طور پر ایک آیت کریمہ جو دو فرقوں میں تنازع کا باعث بنی رہی ہے، اور آج تک کوئی حتمی مفہوم سامنے نہیں آسکا، پیش کی جاتی ہے، یہ سورۃ النساء کی مشہور آیت ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (4/59) اے ایمان والوں اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول کی اور تم میں سے جو صاحبان اختیار ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں جھگڑا کرو، پس اگر تم اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر کو اللہ ورسول کی طرف لوٹا دو۔ اس آیت کریمہ کا مطلب اسلامی نظام کو سامنے رکھتے ہوئے تو بہت واضح ہے کہ اسلامی حکومت کے سربراہ کی اطاعت کرو (**اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول**) اور **اولی الامر** یعنی مقامی حکام کی بھی اطاعت کرو اور اگر تمہارا اور مقامی حکام کا کسی بات میں تنازعہ ہوجائے تو اس متنازع فیہ امر کو مرکزی حکومت (CENTRE) کی طرف (REFER) کردو، اس لئے کہ مرکزی حکومت کا فیصلہ حتمی فیصلہ ہوگا اور اس طرح ملک میں کسی قسم کی انارکی (فوضویت) نہیں رہے گی۔ لیکن اسلامی نظام کو درمیان سے نکال دینے کے بعد جو اس کا مفہوم بیان کیا

جاتا ہے۔ اس کے مباحث اس درجہ پیچیدہ اور متضاد ہیں کہ یہ مختصر سا مضمون ان کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس آیت کریمہ کا حوالہ صرف اس لئے دیا گیا ہے کہ ایک تو یہ اندازہ ہوسکے کہ جو آیات فٹ ہی نظام کے تصور سے ہوتیں ہیں وہ اس تصور کے نکال دینے کے بعد پھر کس قدر اُلجھن کا باعث بنتی ہیں۔ اور دوسرے یہ بات عرض گزار کرنی مقصود ہے کہ اس آیت کریمہ میں تمام مفسرین کرام نے اولی الامر کا ترجمہ ایسا کیا ہے کہ جس کے مفہوم میں اقتدار واختیار ضروری ہوتا ہے شاہ عبدالقادر صاحب نے اس کا ترجمہ اختیار والے کیا ہے۔ اولی الامر کے لئے تو غلبہ واختیار ضروری قرار دیا ہے لیکن اللہ ورسول کے لئے غلبہ واقتدار شرط نہیں قرار دیا اس کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا ہے کہ ہر متنازعہ فیہ یا مختلف فیہ مسئلہ کو قرآن وروایات کی طرف (REFER) کردو اور جو کچھ قرآن وروایات سے اس کا فیصلہ ملے اس پر عمل کرلو۔ لیکن قرآن وروایات سے تو آج تک چودہ سو سال میں کسی ایک مسئلہ کا حل بھی نہیں ملا۔ بلکہ اس طریقہ کو اپنانے سے مزید اختلافات بڑھتے ہیں اور اسی لئے مخالف بھی برابر چلے آرہے ہیں۔ لیکن یہ سب تباہی و بربادی صرف 'سماعت' کی شرط کو درمیان سے نکال دینے سے واقع ہوتی ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ یہ مفسرین عظام اولی الامر کے لئے تو اقتدار ضروری قرار دیتے ہیں۔ لیکن اللہ ورسول کے لئے اقتدار کو شرط قرار نہیں دیتے، جس کا عملاً مفہوم اسلامی حکومت کا سربراہ ہوتا ہے۔ اسی کے ماتحت اولی الامر ہوتے ہیں۔ یہ بات واضح کرنے کے بعد کہ قرآن کریم میں اللہ ورسول کے معنی اسلامی حکومت کے سربراہ کے ہیں، اصل موضوع کی طرف مراجعت کی جاتی ہے۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے، يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (8/24)، اے ایمان والوں لبیک کہو اللہ ورسول کی آواز پر جب وہ تمہیں پکارے اس چیز کی طرف جو تمہیں زندہ کردے۔ یہ آیت کریمہ مردہ قوم کو زندہ کردینے کے اس دعویٰ پر مشتمل ہے کہ جو قوم اللہ ورسول کی پکار کا جواب دے گی، اسے یقیناً یقیناً زندگی حاصل ہوجائے گی۔ آیت کریمہ جس درجہ اہم اور توجہ کی متقاضی ہے، اسی قدر مختصر اور مُوجز ہے۔

اس آیت کریمہ میں اصل کام اللہ ورسول کی پکار اور اس کے جواب دینے کے طریقہ کا تعین کرنا ہے۔ اگر ان دونوں باتوں کا صحیح تعین ہوجائے اور پکار کا صحیح طور پر

جواب دے دیا جائے تو وعدہ الٰہی کے مطابق زندگی کا حصول ایک لازمی امر ہے۔ لیکن اگر نہ تو پکار کا ہی صحیح مفہوم سمجھا جائے اور نہ ہی اس کا صحیح طریقہ پر جواب دیا جائے، تو پھر اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی پورا نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں جس قدر لٹریچر قرآن کریم کی تفاسیر پر مشتمل ہے، اس میں اس آیہ کریمہ کو اس نقطہ نگاہ سے حل ہی نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اس آیہ کریمہ کے ذیل میں اہم کام ہی یہ ہے۔ لیکن افسوس کہ ہماری تفاسیر میں یہ بات پیش نظر نہیں رکھی گئی، اس کی کیا وجہ ہے، وہ مضمون کے آئندہ حصہ میں آتی ہے فی الحال چند تفاسیر کے اقتباسات پیش خدمت کئے جاتے ہیں جن سے قارئین کرام کو اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے ہاں تفاسیر کسی وجہ اپنے دور، اور ملوکیت کے اثرات کے ماتحت تھیں، اور کس طرح صحیح مفہوم سے اعراض کیا جاتا تھا۔ اور موجودہ تفاسیر بھی انہیں کا چربہ ہیں۔

مشہور تفسیر تدبر قرآن میں تحریر ہے "چنانچہ قرآن نے کفار کو جگہ جگہ مردہ کہا ہے۔ اللہ ورسول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہوتی ہے۔ اسی کو قبول کرنے سے بصارت کو بصیرت نصیب ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور حاصل ہوتا ہے جو آفاق وانفس کے اسرار وحقائق سے اس کے لئے پردے اٹھاتا ہے اس سے دل کو وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جو اس کو ایک مُضغہ گوشت سے تجلیات وانوار الٰہی کا آئینہ بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ ورسول کی اس دعوت پر لبیک کہو، اس لئے کہ اسی سے تم کو حقیقی اور جاوداں زندگی حاصل ہوگی (یعنی آخرت میں۔ راقم سطور) جلد 3، صفحہ 458۔

(۲) "یہ دعوت اس دین کی دعوت ہے جو حیات ابدی کا پیغام ہے، اس پر لبیک کہو تا کہ توفیقات الٰہی تمہارے شامل حال ہوں اور اگر تم نے روگردانی کی تو ایسا نہ ہو، کہ تو فیقات تم سے سلب ہوجائیں۔" فصل الخطاب جلد 3، صفحہ 415۔

(۳) یعنی اللہ ورسول تم کو جس کام کی طرف دعوت دیتے ہیں (مثلاً جہاد وغیرہ) اس میں از سرتا پا تمہاری بھلائی ہے۔ ان کا دعوتی پیغام تمہارے لئے دنیا میں عزت واطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیات ابدی کا پیغام ہے۔ پس مومنین کی شان یہ ہے کہ اللہ ورسول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں۔ جس وقت اور جدھر وہ بلائیں، سب اشغال چھوڑ کر اُدھر پہنچیں۔ تفسیر عثمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم۔

(۴) "سُدی نے کہا زندہ کرنے والی چیز سے مراد ہے ایمان کیونکہ کافر مردہ

ہے۔ قتادہ نے کہا قرآن مراد ہے، اس سے زندگی، نجات، اور دونوں جہاں میں عذاب سے بچاؤ حاصل ہوتا ہے۔ مجاہد نے کہا حق مراد ہے، ابن اسحاق کے نزدیک جہاد مراد ہے۔ جہاد کے ذریعے سے اللہ نے ذلت کے بعد عزت عطا فرمائی' تفسیر مظہری جلد 5، صفحہ 49۔

آپ نے زیر نظر آیت کریمہ کا مفہوم مختلف چار تفاسیر میں ملاحظہ فرمایا، ان میں سے کسی تفسیر نے نہ تو اللہ و رسول کی پکار کے مفہوم کو واضح کیا اور نہ ہی اس کا جواب دینے کے طریقے کو۔ اور نہ ہی اس سے یہ مراد لی کہ اس طریقہ سے مردہ قوم زندہ ہو جاتی ہے۔ ان کے ہاں قوم کی زندگی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ حالانکہ آیت کریمہ میں اللہ و رسول کی پکار اور اس کے جواب دینے پر اصرار کیا گیا ہے اور اسی جواب دینے پر زندگی کا انحصار بیان کیا گیا ہے۔ کسی اتھارٹی کے لئے جس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اس میں تین باتوں (Pre.Requisites) کا ہونا ضروری ہے۔ وہ اتھارٹی زندہ ہو، تمکن فی الارض کی حامل ہو، اور اس کا حکم سُنا جا رہا ہو، تاکہ اس کا جواب دیا جائے۔ یعنی اس کی اطاعت کی جائے۔ زندہ اتھارٹی کی ضرورت کس درجہ لازمی ہے وہ مضمون کے ابتداء میں بھی عرض کیا گیا ہے اور اس کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ارشادات الٰہی، اور فرمودات نبوی دونوں میں "سمع وطاعت" کو لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ یعنی پہلے حکم سننا اور پھر اس حکم کی اطاعت کرنا۔ اس کے لئے چار آیات کریمات اوپر درج کر دی گئی ہیں۔ اسی طرح حضورؐ نے فرمایا کہ **لا اسلام الا بجماعته ولا امیر الا بالسمع والطاعة** ۔ اسلام نام ہے جماعت کا اور امیر اس لئے ہوتا ہے کہ اس کے احکامات کو سُنا جائے اور پھر اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی لئے صدر اول میں کہ جس دور میں مسلمانوں کو غلبہ و تسلط حاصل رہا، اللہ کی اطاعت، رسول کی اطاعت اور امیر کی اطاعت سے یہی مفہوم تھا۔ یہ الگ الگ اطاعتیں نہیں تھیں بلکہ یہی اطاعت الٰہی کا عملی طریقہ تھا۔

سابقہ توضیحات کو پیش نظر رکھنے کے بعد اس آیت کریمہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ جب بھی اسلامی نظام کا سربراہ تمہیں کسی بات کا حکم دے تو اس حکم کو سننے کے بعد اس کی اطاعت بجالاؤ۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی نظام کی اطاعت کرے اس سے یہ نتیجہ حاصل ہوگا کہ وہ مسلم قوم عروج و اقتدار کے مراتب حاصل کرے گی۔ اصل یہ ہے کہ جب تک نظام باطل بنیادوں پر قائم رہتا ہے، اس میں قرآن کریم کے مطابق عمل کرنے

کے باوجود قرآنی نتائج حاصل نہیں ہو سکتے، جو قرآنی نظام میں از خود حاصل ہوتے جاتے ہیں۔ اور کوئی نظام قوت کے بل بوتے پر مسلسل نہیں چل سکتا، اس لئے اس نظام کی کوئی مضبوط اساس ہونی ضروری ہے، علامہ اقبال نے اس مفہوم کو ایک ہی شعر میں ادا کر دیا۔

گر تو می خواہی نظام عالمے جستہ او را اساسِ محکمے

اسلامی حکومت کی اساس محکم ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ وہ مضبوط بنیاد ہے جس پر اسلامی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے اور اسی نظام کے قیام میں قرآن کریم نے مسلمانوں کی زندگی کا راز مضمر رکھا ہے اسلامی حکومت کی تعریف (DEFINITION) ہماری ساری دنیا کے علماء یہی کرتے ہیں کہ ہر وہ حکومت جس میں قرآن و روایات کے مطابق قانون تشکیل دے دیئے جائیں وہ اسلامی حکومت ہے۔ لیکن قرآن کریم کی رُو سے یہ تعریف درست نہیں ہے، قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت کی تعریف ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہی یہ ہے اور یہی وہ عروۃ الوثقیٰ ہے جس کے سہارے وہ قائم رہتی ہے۔ اس آیت کریمہ کا مفہوم یہی ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے اسلامی نظام قائم کر لیا اور اس کی اطاعت کو مقصد حیات مان لیا تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ مسلمان مردہ قوم کے بجائے زندہ اقوام میں شامل ہو جائیں گے۔

واضح رہے کہ ہمارے مفسرین کرام نے اس آیت کا یہ مفہوم اس لئے نہیں لیا کہ ان کے ہاں نظام کا تصور محو ہو چکا تھا اس لئے انہوں نے اس آیت کریمہ پر اس نقطہ نگاہ سے غور ہی نہیں فرمایا، یہاں اللہ و رسول کی پکار سے مراد اسلامی حکومت کے سربراہ کے احکامات کو پہلے سُننا اور پھر اس پر عمل کرنا (سمعنا و اطعنا) یعنی اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو مسلمانوں کو زندگی بخشتا ہے اور ان کو عروج و اقتدار عنایت کرتا ہے۔

==========☆☆☆==========

سعودی علماء کی پارسائی پر ڈیلی ٹائمز کا تبصرہ

پاکستان میں مذہب کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ چونکہ ہر ملک کا میڈیا، ملکی حالات کا آئینہ ہوتا ہے، ہمارے ہاں بھی میڈیا پر مذہب پوری طرح مسلط ہو گیا ہے۔ ٹی وی کے تمام چینلز مذہبی پروگرام نشر کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کی کوشش کر رہے ہیں۔ بقیہ یہی حالت پریس کی ہے۔ ہمارے ہاں جس قدر ادبی علمی فکری رسالے جاری تھے۔ وہ تقریباً سب بند ہو گئے ہیں۔ صرف چند رسالے باقی ہیں۔ وہ بھی بمشکل جاری ہیں۔ کیونکہ لوگوں میں اس طرح کے رسالے مطالعہ کرنے کا رجحان ہی نہیں رہا۔ اخباروں کی بھی یہی حالت ہے۔ حتیٰ کہ انگریزی اخبار بھی مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں سارے ملک میں لے دے کے صرف ٹائمز ایک ایسا اخبار ہے جو LEFTIST ہے اور جو مذہب کے اثر سے باہر ہے۔ اس کے اداریوں میں، مذہب، مذہبی طبقہ اور مولوی حضرات کے غلط نظریات پر تنقید ہوتی ہے اور اس کے اداریے عموماً بہت متوازن ہوتے ہیں۔ 'صوت الحق' کے قارئین کو یاد ہوگا کہ اس کے اداریوں پر تبصرہ رسالہ ھذا میں کئی بار طبع ہو چکا ہے جو قارئین کرام نے بہت پسند فرمایا تھا۔ اس اداریوں میں زبان بہت معیاری اور TERSE ہوتی ہے۔ اس لئے اُن کا ترجمہ کرنا، بہت اُکتا دینے والا کام ہوتا ہے مورخہ 10، اکتوبر 06ء کے اخبار میں ایک SUB-EDITORIAL طبع ہوا ہے، چونکہ یہ تراشہ بہت مختصر ہے، اس لئے اس کا ترجمہ پیش خدمت ہے۔ وھو ھذا۔

سعودی (علماء کی) غیر ضروری پارسائی

سعودی عرب کے علماء نے عرب میڈیا کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ستاروں کے زائچے چھاپنے بند کر دیں جو کہ عرب دنیا میں، علماء کی پابندی کے باوجود، بہت مقبول ہیں۔ علماء کرام کے نزدیک زائچے اور علم نجوم ناجائز ہیں۔ اور ان کا خیال ہے کہ ان چیزوں کو عوام

کے سامنے نہیں لانا چاہئے۔ بلکہ ان کو نماز اور دیگر نیکیوں کی ترغیب دینا چاہئے۔

ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک خاص ہیئت میں تبدیل کرنے میں سعودی علماء نے بڑا کردار ادا کیا ہے۔ ہر جگہ لوگوں نے بڑی بڑی ڈاڑھیاں رکھنی شروع کردی ہیں۔ یہاں تک کہ آج کل ڈاکو بھی نہ صرف ڈاڑھی رکھنے لگے ہیں۔ بلکہ جب وہ کسی کے گھر میں ڈاکہ ڈالتے ہیں، تو اسباب کو لوٹنے کے دوران وہ مالک مکان کو نماز کا پابند رہنے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس صورت حال کے ذمہ دار سب سے زیادہ خود عرب کے علماء ہیں کیونکہ نہایت تنگ نظر اسلام کی تبلیغ کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہیں شہزادوں اور تُجار سے ڈالرز ملتے ہیں اور یہ شہزادے اور تُجار ان علماء کو اپنی سیاست میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے مختلف اسلامی ممالک کی تہذیب وتمدن ان علماء کی یلغار کے سامنے دم توڑ چکا ہے اور اس کے نتیجہ میں تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے فرقہ وارانہ تشدد نے جنم لیا ہے۔ ہمارے اردو اخبارات کو چاہئے کہ علماء کی اس اپیل کی طرف کوئی توجہ نہ دیں، کیونکہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مسلمانوں کو زائچوں نے تباہ نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کے زوال کے اسباب اور ہی کچھ ہیں، اور علماء کرام خود اس زوال کا ایک حصہ ہیں (دارا یہ ختم ہوتا ہے)

جہاں تک زائچوں کا تعلق ہے ہمارے نزدیک سعودی علماء کا موقف درست ہے، البتہ اخبار مذکور نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب میں خود علماء کرام کو بھی ایک بڑا سبب گردانا ہے، لیکن یہ کہ مسلمانوں کے زوال میں خود علماء کا کیا کردار ہے اخبار نے اس کی نشاندہی نہیں کی۔ صرف ان کی تنگ نظری پر ہی اکتفاء کیا ہے، لیکن ہمارے خیال میں تنگ نظری صرف ایک علامت ہے۔ اصل سبب یہ بھی نہیں ہے، اصل سبب کچھ اور ہی ہے۔ یہ بات ہر شخص کو بخوبی معلوم ہے کہ نہ تو مولویوں کی بارش آسمان سے ہوتی ہے، اور نہ ہی مولوی زمین سے اُگتے ہیں، اور نہ ہی یہ جنس عجیب کا سد کسی ملک سے IMPORT ہوتی ہے۔ ہم ہی اپنے بچوں کو مولوی بناتے ہیں پھر ان کے نظریات اور اُن کی مختلف معاشرت کی وجہ سے ان سے بیزاری کرنے لگ جاتے ہیں لیکن اگر اس مسئلہ پر بالکل OBJECTLY غور کیا جائے تو اس میں سے چند پہلو خود بخود نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں پہلا پہلو

مولویوں کی سیرت سے متعلق ہے، دوسرا ان کے خلاف قرآن نظریات جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنے، تیسرے ان کی موجودہ دور میں تشدد اور ان کی NUISASE VALUE۔

جہاں تک سابقہ علماء کرام کی پختہ سیرت کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں چند واقعات پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی، بانی دارالعلوم دیوبند، سرسید احمد خان کے ہم عصر تھے۔ ساری عمر انگریزوں کے مخالف رہے اور ساری عمر مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی علمی ترقی کے لئے کوشاں رہے یہاں تک کہ انہوں نے سخت نامساعد حالات کے باوجود دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ اس زمانہ میں انگریزی عدالتوں میں سند یافتہ مولویوں کو بھی سٹاف میں رکھا جاتا تھا تاکہ وہ جج حضرات کو عربی کتابوں کے تراجم مہیا کرسکیں جن کو بنیاد بنا کر وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ مولوی محمد قاسم صاحب کو بھی ایک عدالت میں 75 روپے ماہوار کی مترجم کی پوسٹ پیش کی گئی، مگر مولوی صاحب موصوف نے اس کو قبول کرنے سے فوری انکار کردیا اور ساری عمر مطبع مجتبائی میں صرف 15 روپے ماہوار پر گذار دی جہاں وہ عربی کُتب کی پروف ریڈنگ کرتے تھے۔

مولانا میاں اصغر علی صاحب اپنے دور کے مشہور فقیہ اور دارالعلوم دیوبند میں علم الفرائض کے استاد تھے۔ ان کی تنخواہ (40) چالیس روپے تھی۔ جب دارالعلوم کے مالی حالات بہتر ہوئے اور وہاں اساتذہ کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا، تو میاں اصغر علی صاحب نے اضافی رقم لینے سے انکار کردیا اور کہا کہ ان کا گذارہ 40 چالیس روپے میں بخوبی ہوجاتا ہے۔

مولوی لقاء اللہ عثمانی پانی پتی، مشہور عالم اور سیاسی لیڈر تھے۔ اس دور کے حالات کے مطابق وہ کانگریس سے وابستہ تھے اور مولانا حسین احمد مدنی کے دستِ راست تھے۔ پانی پت میں بوعلی شاہ قلندر کی ایک مشہور درگاہ تھی۔ اس درگاہ میں دور دور تک کے لوگ اپنے ذہنی معذور عزیزوں کو چھوڑ جاتے تھے۔ بعض لوگ تو اس درجہ معذور ہوتے تھے کہ بالکل برہنہ گھومتے رہتے تھے، یہ اس درگاہ پر ایک طرح کی ASYLAM تھی جہاں محتاجوں اور معذوروں کی دیکھ بھال ہوتی تھی، اور ان کی نگرانی کے لئے لوگ مقرر تھے،

جنہیں درگاہ کے وقف سے تنخواہیں ملتی تھیں۔ مولوی صاحب چونکہ دیوبندی فکر سے منسلک تھے، اس لئے ان کا اس درگاہ سے کوئی عقیدتاً وابستگی نہیں تھی۔ لیکن جب تقسیم ہند ہوا اور قتل وغارت کا بازار گرم ہوا، تو پانی پت سے بھی لوگ بذریعہ ٹرین پاکستان آنے لگے۔ قتل وغارت کی وجہ سے ہر شخص جان بچانے کے لئے وہاں سے جلد از جلد نکلنا چاہتا تھا، مولوی لقاء اللہ کو وہاں سے نکلنے کا موقع ملا لیکن انہوں نے اپنے گھر والوں کو تو روانہ کر دیا، لیکن وہ ان معذور محتاج لوگوں کی وجہ سے رُکے رہے اور اپنی نگرانی میں تمام معذوروں کو آخری ٹرین میں سوار کرا کر پاکستان کے لئے روانہ کر دیا اور اس کے بعد بھی وہ پانی پت میں صرف اس وجہ سے ٹھہرے رہے کہ انہوں نے کئی سو مغویہ عورتوں کو پولیس کی مدد سے برآمد کرا کے پاکستان روانہ کیا اور کئی سو بوریاں قرآن کریم کے نسخوں کی جو مسلمان وہاں چھوڑ آئے تھے، پاکستان بھجوائیں اور وہ پانی پت میں بالکل تنہا فوت ہو گئے۔

محکمہ اوقاف جنوری 1960ء میں صدر ایوب خان کے حکم پر قائم ہوا اس سے پیشتر اوقاف کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ محض اوقاف بورڈ ہوتا تھا۔ محکمہ کے قیام کے کچھ عرصہ بعد صدر ایوب کو لاہور آنا تھا۔ محکمہ اوقاف کے افسران کو خیال ہوا کہ محکمہ کے چند مشہور علماء کو ایئر پورٹ پر لے جایا جائے تاکہ وہ صدر ایوب خان کا استقبال کریں تاکہ محکمہ کی کارکردگی کا صدر صاحب کو علم ہو اور افسران بالا کے بھی نمبر بنیں۔ وہ اس سلسلہ میں مدرسہ اشرفیہ فیروز پور روڈ بھی گئے۔ مدرسہ اس وقت زیر تعمیر تھا۔ لیکن "مسجد حسن" بن چکی تھی اور اسی مسجد میں درس و تدریس کا سلسلہ جاری تھا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلوی، شیخ الحدیث تھے درس دینے میں مصروف تھے۔ مدرسہ کے کسی کارکن نے جا کر مولانا کو اطلاع دی کہ محکمہ اوقاف کے چند افسران ان سے ملنے آئے ہیں۔ انہوں نے اس کارکن کو ہدایت کی کہ ان افسران کو مسجد میں ہی لے آؤ۔ سردی کے دن تھے۔ محکمے کے افسران بھی مسجد کے ایک گوشہ میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے۔ مولوی صاحب بہت خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ افسران نے اپنی آمد کا مدعا عرض کیا اور مولوی صاحب سے درخواست کی کہ وہ کچھ وقت نکال کر صدر صاحب کو ایئر پورٹ پر RECEIVE کرلیں۔ اور انہیں کوئی دقت نہیں ہوگی۔ سرکاری کار ان کو لے جائے

گی۔ مولوی صاحب ایک دومنٹ بالکل خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ ہم تو فقیر آدمی ہیں۔ ہمارا صدر صاحب سے کیا تعلق، کہاں وہ، کہاں ہم فقیر لوگ، اس لئے انہوں نے قطعی طور پر معذرت کردی۔ افسران نے کہا کہ صدر صاحب علماء کرام سے مل کے بہت خوش ہوتے ہیں۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا کہ اگر صدر صاحب علماء سے مل کے خوش ہوتے ہیں، تو وہ یہاں تشریف لائیں۔ ہم اُن کا استقبال بھی کریں گے اور اپنی وسعت کے مطابق ان کی ضیافت بھی کریں گے۔ ہر چند کہ افسران نے مولوی صاحب سے اصرار کیا، لیکن انہوں نے نہایت خوش اخلاقی سے افسران کو ٹال دیا

مولانا عبید اللہ سندھی خفیہ تحریک ریشمی رومال کے رُکن تھے اس تحریک کی مختلف پارٹیوں کے مابین ہزاروں روپوں کی TRASACTION کرائی۔ لیکن ان کی اپنی یہ حالت تھی کہ اوکھلے کا علاقہ جو دہلی کے نواح میں ہے، وہاں سے جامع مسجد، دہلی، پیدل جاتے تھے، اور 4 آنے کا کرایہ ادا نہیں کرسکتے تھے۔ انگریزی حکومت چونکہ اس تحریک کی نگرانی کررہی تھی اس لئے وہ رومال گورنمنٹ نے شیخ عبدالرحیم کے پاس سے پکڑ لیا۔ وہ اس وقت اس رومال کو ایک بوری کے اندر سی رہے تھے یہ شیخ عبدالرحیم اچاریہ کربلانی، صدر آل انڈیا کانگریس کے بڑے بھائی تھے۔ رومال پکڑے جانے کے بعد وہ شرمندگی کی وجہ سے روپوش ہوگئے تھے۔ اس قسم کے اور بہت سے واقعات علماء کی سیرت کے متعلق تحریر کیے جاسکتے ہیں۔ جب ہمارا معاشرہ خراب ہوا، تو اس میں ہر طبقہ ہی خراب ہوا۔ کیا ڈاکٹر اور کیا وکیل۔ ڈاکٹروں کا حال کسی کو معلوم نہیں، مریض کو پہلے درست دوا دے کر اس کو روبصحت کردیتے ہیں۔ پھر اس مریض کو چند روز لٹکائے رکھتے ہیں۔ پھر اس کی مالی حیثیت کے مطابق اس کا درست علاج کردیتے ہیں۔ یہی حال وُکلاء کا ہے۔ دونوں طرف کی پارٹیوں سے رابطہ رکھتے ہیں جس سے زیادہ منفعت حاصل ہوسکے، اس کا ساتھ دے دیا۔ معاشرہ جب رُو بہ انحطاط ہوا، اس میں ہم سب ہی لوگ انحطاط کی زد میں آئے۔ الا ماشا اللہ اور جو اپنے مقام پر جمے کھڑے رہے، وہ یقیناً قابل صد احترام ہیں۔ ہمارے علماء کرام یا مولوی حضرات کے بارے میں اصل چیز جو قابل غور ہے وہ ان کے خلاف قرآن نظریات اور ان

کا تعلیمی نظام ہے جس میں IN-BUILT اور INHERENT خرابی ہے۔ خرابی ہے۔ اس کے بارے میں غالب کا مصرع بالکل صادق آتا ہے کہ میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی۔ اس سسٹم کی تعمیر ہی غلط ہے۔ جب تک ہمارے علماء کرام ان نظریات کو نہیں چھوڑیں گے جن نظریات پر یہ سلسلہ قائم ہے، نہ ہی تعلیمی سسٹم درست ہوسکتا ہے اور نہ ہی ہمارے علماء کرام کوئی تعمیری نتائج سرانجام دے سکتے ہیں۔ گذشتہ زمانہ میں ہمارے علماء مولوی حضرات جس طرح تھے وہ قابل برداشت تھے۔ لیکن جب سے مدارس میں TERROR شروع ہوا ان کی

NUISANSE VALUE اور بڑھ گئی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہمارے مدارس میں جو تشدد وتخریب کاری آئی ہے، اس میں ہمارے علماء کرام کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی محض سیاسی وجوہ کی بناہ پر باہر سے ان پر IMPOSE کیا گیا ہے۔ علماء کرام کو دورحاضر کے تقاضوں کے مطابق کرنے، اور انہیں تعمیری کاموں میں فائدہ مند بنانے کے لئے چند اقدام نہایت ضروری ہیں۔

ہمارا اس بات پر ایمان ہے کہ قرآن کریم نے جو وعدے کئے ہیں وہ برحق ہیں۔ ان میں کسی خلاف ورزی کا امکان ہی نہیں ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ (3-9) اللہ کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا، مذہب میں توکل کے معنی ہاتھ پاؤں توڑ کے بیٹھ جانے کے ہیں، لیکن دین میں توکل کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ آپ کو اس بات کا کامل یقین ہے کہ قرآنی اعمال کے نتائج وہی برآمد ہوں گے جن کا قرآن نے وعدہ کیا ہے۔ قرآن کے وعدوں پر جس درجہ بھروسہ ہوگا، اسی درجہ توکل میں پختگی ہوگی۔ قرآن نے مومنین سے وعدہ فرمایا کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3-140) اگر تم مومن ہو، تو لازماً تم ہی بلند تر ہو گے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4/141) اللہ کافروں کو مومنین پر غالب نہیں آنے دے گا۔ سیاسی غلبہ کے علاوہ معاشی خوشحالی کے بھی وعدے کئے گئے ہیں وَ كَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اَللّٰهُ (29-60) زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ نحن نر

زقکم وایاھم (6/151) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔

سیاسی غلبہ اور رزق کی فراوانی کے لئے مزید آیات بھی ہیں لیکن اپنا مدعا بیان کرنے کے لئے ان ہی پر اکتفاء کیا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان تمام وعدوں کے نتائج کیوں بر آمد نہیں ہورہے ہیں۔ اور ہم اس درجہ ذلیل وخوار کیوں ہیں۔ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کے سارے وعدے اس کے دین، اس کے نظام سے وابستہ ہیں۔ ذرا سوجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس کو بخوبی سمجھ سکتا ہے کہ اگر ہم رزق کی تقسیم اپنے وضع کردہ نظام کے مطابق کریں، تو اس کی اچھی یا بری صورت کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوگی وہ خدا پر عائد نہیں ہوسکتی۔ یہ بات کہ نظام معیشت ہم اپنا جاری کریں اور توقع اللہ کے وعدے پورے ہونے کی کریں، یہ بات سخت نادانی اور خود فریبی کی ہوگی۔ منطقی نتیجہ یہی ہے کہ مسلمانوں کی سرفرازی وسربلندی کے سارے وعدے اس کے دین سے مُنوط ہیں جو حضورؐ نے اپنے دور میں قائم فرمایا تھا اور دنیا نے اس کے خوشگوار نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ یہاں تک ایک بات مکمل ہوئی۔

ہمارے سابقہ علماء کرام جو خود مسلمان ملوک وسلاطین کے دور میں رہے، اور اس کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کی غلامی میں رہے، وہ نظری طور پر تو دین کا ہلکا سا تصور رکھتے تھے۔ لیکن ان کا قیام دین پر اصرار نہیں تھا لیکن اب کچھ تو زمانے کے تھپیڑوں اور حالات کے تقاضوں نے مجبور کیا، اور اصل وجہ یہ ہوئی کہ علامہ اقبالؒ اور ان کے تتبع میں تحریک طلوع اسلام نے دین کے تصور کو، اور اس کے وجوب وفرضیت کو اس درجہ واضح اور روشن کیا کہ ہمارے علماء کرام بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ لیکن دقت پھر وہی ہے کہ قیام دین کے قائل ہونے کے باوجود علماء کرام اس کو صحیح طریقہ پر قائم نہیں کرسکے۔ اور اس کی وجہ بھی بہت صاف ہے کہ دین کا نظام خلافت راشدہ تک قائم رہا۔ اور اس کے بعد ہمارے ہاں ملوکیت کا غلبہ ہوگیا جس کی وجہ سے دین کا نظام معترض ہوگیا اور اسلام بطور مذہب کے باقی رہ گیا، جو آج تک ہزار سال سے ہمارے ہاں مروج ہے۔ ہمارے علمائے کرام مذہب کی پیداوار اور اس کے نمائندے ہیں۔ ان کا دین سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

ان کے سارے نظریات وعقائد، رسومات واوہام سب مذہب سے وابستہ ہیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر مذہب پر قائم ہے۔ تمام تفاسیر تمام کتب روایات کے ڈھیر مذہب کو تقویت دیتے ہیں۔ دین کا نظام قائم کرنے اور قرآنی نتائج وثمرات سے متمتع ہونے کے لئے ہمیں اس ایک ہزار سال کے سارے لٹریچر کو خیر باد کہنا ہوگا۔ جس کے لئے ہمارے علماء کرام کسی حال میں بھی آمادہ نہیں ہوسکتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے وہ مذہب کا احیاء ہو رہا ہے۔ دین کا قیام نہیں ہو رہا ہے۔ یہ ہے وہ کشمکش جس جگہ آج ہم کھڑے ہیں۔ اور اس کشمکش سے بخوبی نکلنے پر ہی ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔ اور عملی طور پر دینی نظام کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مولانا حضرات ہو رہے ہیں۔

ہمارے ہاں علماء کرام کا اثر ہمیشہ سے رہا ہے اور موجودہ دور میں زیادہ ہوگیا ہے ۔علماء کرام کے تعاون کے بغیر دینی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ اس کی صرف یہی صورت ہے کہ ہمارے علماء کرام کے زاویہ نگاہ میں تبدیلی لائی جائے۔ موجودہ مدارس جو بالکل فرسودہ نظام پر قائم ہیں اور جو مذہب کی تعلیم دیتے ہیں ان میں تبدیلی لائی جائے۔ علماء کرام کو مذہب کے بجائے دین کا نمائندہ بنانا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک دو دن کا کام نہیں ہے۔ اس کے لئے برسوں درکار ہیں۔ لیکن اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔

ہمارے علماء کرام دینی نظام یا اسلامی حکومت کے لئے یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ اگر کسی مملکت کے قوانین کتاب وسنت کے مطابق بنادیئے جائیں تو وہ اسلامی حکومت ہوجاتی ہے اور ان کا زیادہ اصرار حدود وتعزیرات کے اجراء پر ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ قرآن کریم کی رُو سے، اس طرح کی حکومت اسلامی حکومت نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت کی تعریف (DEFINITION) میں یہ لازمی شرط ہے کہ ایک زندہ اتھارٹی قرآن کریم کے قوانین جاری ونافذ کرتی ہے۔ اور اس اتھارٹی کی اطاعت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت قرآنی قوانین نافذ کرتی ہے جو اقدامات لیتی ہے اور اس کے بارے جو فیصلے کرتی ہے وہ ہی سُنّت ہوتی ہے۔ حضورؐ کے اپنے اور خلافت راشدہ کے دور کے قرآنی احکامات نافذ کرنے کے بارے میں جو اقدامات کیۓ گئے، اور اس بارے میں جو

فیصلے ہوئے وہ سُنّت تھے اسی لئے حدیث میں حضورؐ کی سُنّت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سُنّت کو شامل کیا گیا تھا۔ **علیکم بسنتي و بسنة الخلفاء الراشدين المهديين** ۔ تم پر میری اور میرے خلفاء راشدین کی پیروی ضروری ہے۔ اب جب بھی اسلامی حکومت قائم ہوگی، اس حکومت کے فیصلے مع سُنّت قرار پائیں گے۔ ہم مسلمانوں کو تباہی و بربادی سے نکالنے کا واحد حل دین کا قیام ہے جس سے سارے قرآنی وعدے پورے ہونے لازمی ہیں۔ جس میں سیاسی غلبہ و رزق کی فراوانی ہوگی اس کے علاوہ جو عیوب و اسقام ہمارے اندر مذہب کی وجہ سے بار پاگئے ہیں، وہ بھی دین کے قیام سے از خود دور ہو جائیں گے۔

(1) ہمارے ہاں فرقہ بندی صرف مذہب کی بناء پر ہے۔ اگر دین کا قیام ہو جائے تو فرقہ بندی خود بخود ختم ہو جائے گی۔ دینی نظام میں پبلک لاز اور پرسنل لاز کی کوئی تفریق نہیں ہوتی یہ تفریق مذہب میں ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت میں ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے، اور ہر مسلمان کو اس کی اطاعت کرنی ضروری ہوتی ہے۔ اسلامی حکومت خود نماز، روزہ کے اوقات، نکاح وطلاق اور جملہ عائلی قوانین اور سارے پبلک قوانین جاری کرتی ہے۔ اس میں فرقہ کا وجود نہیں ہوتا۔ البتہ غیر مسلم حضرات کا معاملہ اس سے دیگر ہے

(2) اسلامی حکومت کے قوانین ہی اس حکومت کی فقہ و شریعت ہوتے ہیں۔ اسلامی حکومت، قرآن کریم کی روشنی میں، آپس کے باہمی مشورے سے، روزمرہ کی ضرورت کے مطابق، قوانین وضع کرتی چلی جاتی ہے، اور یہی اسلامی اجتہاد کہلایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ دین میں اجتہاد حکومت کرتی ہے انفرادی اجتہاد مذہب میں ہوتا ہے۔ سابقہ ایک ہزار سال پیشتر کے وضع کردہ قوانین، آج کی ضروریات پوری نہیں کر سکتے، ہماری مذہبی پیشوائیت میں، قدامت پسندی و جمود اس وجہ سے ہے کہ یہ سابقہ قوانین جاری کرتی ہے۔ موجودہ دور کے مطابق قوانین بنانے سے ہمارے موجودہ دور کے علمائے دین میں روشن خیالی پیدا ہو سکتی ہے اور ہمارے علماء اسی طرح روشن خیال ہو جائیں گے جس طرح آج کے بیرسٹر اور وکلاء صاحبان اور جج حضرات ہوتے ہیں۔

(3) سُنّت کی اس تعریف سے جو اوپر تحریر کی گئی ہے۔ ہمارے مذہبی طبقہ کی

معاشرت بالکل تبدیل ہو جائے گی۔ ہمارے علماء کرام نے عربی معاشرت کو، اور خصوصاً اس دور کی عربی معاشرت کو، دین کا جزو بنا رکھا ہے یہ قرآن کریم کی اقدار پر کم، اور عربی معاشرت پر زیادہ اصرار کرتے ہیں۔ ہم میں سے جو شخص بھی مذہب کی طرف راجع ہوتا ہے وہ فوراً ایک خاص وضع کی ہیئت کذائی بنالیتا ہے۔ ڈاڑھی رکھنا ضروری سمجھتا ہے۔ مسواک کرنا، لمبے کرتے، اونچے پاجامے عمامے، استعمال کرنا سُنّت خیال کرتا ہے۔ اس سے معاشرہ میں یبوست وضیاقت پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ بالکل جامد STATIC ہو کر رہ جاتا ہے اور ڈیڑھ ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے۔

(4) اس زمانہ کے تقاضے کے مطابق ہم مسلمانوں کے لئے اہم ترین بات رواداری اور حسن سلوک کا پابند ہونا ہے۔ خود مسلمانوں میں باہمی طور پر بھی۔ اور خصوصاً غیر مسلموں کے ساتھ۔ آج دنیا کے مہذب ممالک بظاہر مطمئن اور پُرسکون دکھائی دے رہے ہیں۔ اگرچہ وہ ہم سے تو بہتر ہیں، لیکن ان کے معاشروں میں بھی زندگی پُرسکون نہیں ہے۔ ان کے اندر رہ کر اس بات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ امریکہ اور دیگر نام نہاد مہذب ممالک کی جیت (ADVANTAGE) یہ ہے کہ انہوں نے ٹیکنولوجی پر قبضہ کرکے فطرت کی قوتوں کو مُسخر کر کے، ان سے حد درجہ فائدہ اٹھالیا ہے، جس کی وجہ سے وہ دیگر اقوام کے مقابلہ میں طاقتور ہیں۔ ورنہ جن اقوام میں HOMOSEXUALITY۔ لواطت وسحاقت جیسے شنیع ومذموم افعال جائز ہوں، ان کا تہذیب سے کیا تعلق، اور ان کا اقدار VALUES سے کیا علاقہ۔ ان کے مقابلے میں ہماری اقدار نہایت اچھی، بلند اور پُرکشش ہیں۔ کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ ان اقدار کو ان تک PEACEFULLY پہنچا دیا جائے جس میں تشدد VOILENCE استعمال نہ کیا جائے۔ پھر آپ دیکھیں کہ کیسے عمدہ نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن کریم اسلام کی طرف دعوت دینے والوں کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف حکمت وموعظت، دلائل وبراہین کے ساتھ دعوت دیں۔ **اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَ الۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَ جَادِلۡہُمۡ بِالَّتِیۡ ہِیَ اَحۡسَنُ** (16/125) (اے پیغمبر) (لوگوں کو) اپنے پروردگار کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے بلاؤ اور بحث ومباحثہ

کرو بھی تو ایسے طریقے سے جو (لوگوں کے نزدیک سب سے اچھا ہو) داعیان اسلام کو چاہئے کہ وہ غیر مسلموں کے علم وبصیرت اور دانش وبینش کو اپیل کریں اور اس طرح ان کو ان حقائق کو تسلیم کرنے کے لئے آمادہ کریں۔ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ (12/108) اے رسول ان سے کہہ دو کہ میرا طریقہ تو یہ ہے کہ میں (لوگوں کو) خدا کی طرف بلاتا ہوں، میں اور میرے متبعین (دونوں) مضبوط دلائل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ ہم نے غلط اور خلاف قرآن راستہ اختیار کرکے، تشدد کو جو اپنا شعار بنالیا ہے یہ ہمارے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔ اور اس کے نقصانات مزید پریشان کن برآمد ہوں گے۔ ہمیں تشدد کے بجائے تمام انسانیت کو قرآن کے اس نظریہ سے آگاہ کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے دنیا کو وحدت خلق کی بلند ترین حقیقت اور احترام انسانیت کے روشن ترین اصول سے روشناس کرایا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کی بڑی قدر و قیمت ہے اور کسی کی جان لینا اس کے ضابطہ آئین میں عظیم ترین جرم ہے۔ انسانی زندگی کی قدر و قیمت کو ظاہر کرنے کے لئے اس نے ایسا جامع اور پرکشش بیان اختیار کیا ہے کہ جس سے ایک طرف وحدت خلق کا عالمگیر اصول واضح ہو جاتا ہے تو دوسری طرف تشدد اور قتل ناحق کے خلاف سخت ترین سرزنش وعتاب کا پہلو ظاہر ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (5/32)، جو شخص کسی کو نہ جان کے بدلے میں، نہ ملک میں فساد پھیلانے کی سزا میں (بلکہ ناحق) قتل کر ڈالے گا تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کے مطابق تو مسلمان کی یہ حالت ہونی چاہئے کہ کسی کے خلاف ناحق ہاتھ اٹھانا اور تشدد کرنا تو بڑی چیز ہے وہ تو غیر مذاہب کے لوگوں کی گالی کا جواب بھی گالی سے نہیں دے سکتا۔ وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (6/109)، یہ مشرکین جن کی اللہ کے سوا عبادت کرتے ہیں انہیں تم برا نہ کہا کرو ورنہ یہ لوگ بھی اللہ کو بے سمجھے عداوت سے برا کہیں گے۔

غیر اسلامی حکومتوں میں اللہ کی اطاعت وفرمانبرداری چند رسوم میں محدود ہو کر رہ

جاتی ہے اور یہ حکومت صرف حیوانی سطح کی زندگی کے مسائل حل کرتی ہے۔ یہ حکومتیں، روٹی ، کپڑا، مکان، ملازمت وغیرہ قسم کے مسائل بخوبی حل کرتی ہیں لیکن قرآن کا موضوع حیوانی سطح کی زندگی نہیں ہے اس کا تو موضوع بھی یہی "انسانی زندگی" ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن نے "حیوانی سطح زندگی" کے متعلق قطعاً کوئی ہدایات نہیں دی۔ حیوانی زندگی، انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے کہیں ہدایت نہیں دی کہ سردی میں گرم کپڑے استعمال کرو اور گرمی میں ٹھنڈے کپڑے، کھانا، پینا جو ہمارے روز کے معمولات ہیں، جن کا تعلق حیوانی زندگی سے ہے، اس کے متعلق قرآن نے کوئی ہدایت نہیں دی کہ کس طرح ان کو تیار کیا جائے۔ جس کا دل چاہے گھی استعمال کرے اور جس کا دل چاہے مکھن۔ لیکن قرآن کریم نے یہ حکم دے دیا کہ جو شخص بھی گھی استعمال کرے وہ جائز ذرائع سے حاصل کردہ ہو نا جائز ذرائع سے حاصل کردہ گھی انسانی زندگی کو نقصان دے گا۔ قرآن کریم کا موضوع "انسانی زندگی" ہے۔ اسی لئے اسلامی حکومت کا تعلق بھی خالص انسانیت سے ہوتا ہے۔ اسلامی حکومت ان مسائل کا حل پیش کرتی ہے جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہوتا ہے اور یہی وہ بنیادی فرق ہے ایک اسلامی اور غیر اسلامی حکومت میں۔ اسلامی حکومت دنیا میں مقاصد خداوندی کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتی ہے ۔اور یہ ایک بہت بڑی سیاست ہے ان لوگوں کے لئے جو اس طرح مقاصد خداوندی کو پورا کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس زمرہ میں شامل فرمائے

اصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کا اولین مقصد انسان میں وہ استعداد پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے یہ ارتقاء کی اگلی منزل طے کر سکے۔ اس طرح کی استعداد پیدا کرنے میں اسلامی حکومت کس طرح مدد معاون ہوتی ہے، اور حیوانی وطبعی سطح کی زندگی، اس میں کیا کردار ادا کرتی ہے، یہ ایک خالص علمی مضمون ہے، جو شاید قارئین کی دلچسپی کا موجب نہ ہو ۔ہاں اگر قارئین کرام نے حکم فرمایا تو اس موضوع کی وضاحت کردی جائے گی۔ یہ موضوع خود ایک الگ مضمون کا متقاضی ہے۔

مملکتِ مارا اساس دیگر است　　　این اساس اندر دلِ ما مضمر است

ایک عریضہ بنام جناب ایڈیٹر صاحب رسالہ 'صوت الحق'

موقر رسالہ "صوت الحق" کے قارئین کرام کو بخوبی علم ہے کہ اس رسالہ کا عملی سیاست سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نہ پاکستان میں، اور نہ پاکستان سے باہر کسی اور ملک میں۔ البتہ اس مرتبہ امریکہ کے مڈ ٹرم الیکشن کے سلسلے میں ایک ایسی خوش آئند بات سامنے آئی کہ دل چاہتا ہے کہ قارئین کرام کے علم میں بھی وہ بات لائی جائے، تا کہ وہ اس سے بے خبر نہ رہیں۔

امریکہ کی آبادی 28 کروڑ ہے۔ پچاس STATES پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک سینٹ ہوتی ہے اور ایک HOUSE OF REPRESETATIVES، (مجلس نمائندگان) سینٹ کی تعداد سو 100 ممبران کی ہوتی ہے اور ہر سٹیٹ سے دو نمائندہ اس میں منتخب ہو کر آتے ہیں جبکہ مجلس نمائندگان کی تعداد 435 ہے جو تمام ریاستوں سے انتخاب لڑ کر آتے ہیں۔ ان دونوں HOUSES کو ملا کر کانگریس کہتے ہیں۔ ان دونوں ہاؤس کے انتخاب ہر دوسرے سال ہوتے ہیں۔ چونکہ واقعہ پیش نظر کے بارے میں صرف اتنی ہی معلومات کافی ہیں اس لئے ان پر ہی اکتفاء کیا جاتا ہے۔ مزید معلومات، جس قدر بھی تحریر کی جائیں گی، یہ خط طویل تر ہو جائے گا۔

1930ء میں امریکہ میں ایک شخص فرد محمد نام کا کسی ملک سے وارد ہوا، اور اس نے اسلام کی تبلیغ شروع کر دی۔ اس نے بہت کافی لوگوں کو مسلمان کیا جن میں سے اکثریت (BLACK CRIMINALS) کی تھی۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے ایک شخص ELIJAH MUHAMMAD۔ اردو میں اس کو عموماً عالیجاہ محمد لکھ دیتے ہیں اگر چہ اس کا صحیح تلفظ علائی جاہ محمد ہے۔ یہ شخص بھی قید کے دوران مسلمان ہوا۔ یہ شخص غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل تھا۔ فرد محمد تو 1934ء میں امریکہ سے واپس چلا گیا اور کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں سے

آیا تھا اور کہاں چلا گیا۔ البتہ وہ ایک کافی تعداد مسلمانوں کی بنا گیا جس میں سب سے نمایاں شخصیت عالیجاہ محمد کی ہی تھی۔ ان لوگوں نے اسلام کی تبلیغ جاری رکھی اور NATION OF ISLAM نام کی ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی۔ یہ تحریک آہستہ آہستہ ترقی کرتی چلی گئی۔ عالی جاہ چونکہ بہت غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس نے اس تحریک کو بڑی SOUND بنیادوں پر استوار کیا تھا، اور ایک بہت بڑی جائیداد اس تحریک کے نام خرید لی۔ اور یہ تحریک مالی طور بہت آسودہ ہوگئی۔ دیگر افراد کے علاوہ ایک شخص میلکم ایکس (MALCOM,X) نام کا بھی اس تحریک میں شامل ہوگیا۔ یہ شخص بھی جرائم پیشہ تھا اور اس کی قید کے دوران اس کے بھائی، عالی جاہ محمد کے اثر سے مسلمان ہوگئے تھے۔ اس کے بھائیوں نے اس کو دوران اسیری میں ہی مسلمان کرلیا۔ قید سے رہائی کے بعد میلکم ایکس نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کے حصہ لینا شروع کردیا۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس نے عالی جاہ محمد کو بھی OVER-SHADOW کردیا۔ اگرچہ اس تحریک کا نام نیشن آف اسلام ہے، لیکن یہ اس طرح کے مسلمان نہیں ہیں، جیسے ہم ہیں۔ یہ فرد محمد کو خدا مانتے ہیں اور عالی جاہ کو اس کا رسول۔ لیکن یہ بائبل اور قرآن دونوں کو حجت مانتے ہیں۔ اور قرآن پر اپنی دانست کے مطابق عمل کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں، اور کہلاتے ہیں۔ یہ سب BLACK ہیں، محمد علی کلے مشہور BOXER بھی ان ہی میں سے ہے، ان کے دعویٰ کے مطابق ان کی تعداد گیارہ ملین یعنی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ ان کا ایک ہفتہ وار اخبار FINAL CALL بھی نکلتا ہے۔ عالی جاہ محمد ایوب خاں کے دور میں پاکستان آئے تھے، اور ایوب خان نے ان کا اچھے انداز میں استقبال کیا تھا۔ یہ 1975ء میں فوت ہوگئے اور ان کی جگہ ان کے بیٹے ڈاکٹر W.W. DEEN، اس تحریک کے صدر ہوئے میلکم ایکس ان میں بہت زیادہ مشہور شخصیت ہے۔ وہ حج پر بھی گیا اور کرنل قذافی کی دعوت پر وہ لیبیا بھی گیا۔ لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ میلکم ایکس حج کے بعد عام مسلمانوں جیسا ہی مسلمان ہوگیا لیکن اس دوران میلکم ایکس اور عالیجاہ محمد کے درمیان شدید اختلافات رونما ہوئے۔ اور میلکم ایکس نے عالی جاہ پر الزام لگایا کہ اس کے اپنی سیکریڑی سے ناجائز تعلقات ہیں پہلے

تو عالیجاہ اس الزام کا انکار کرتے رہے، لیکن بعد میں، حالات سے مجبور ہو کر، انہوں نے اس کا اعتراف کرلیا۔ لیکن ان دونوں کے تعلقات کشیدہ سے کشیدہ تر ہوتے چلے گئے، یہاں تک کہ میلکم ایکس کو قتل کردیا گیا۔ عام خیال یہی ہے کہ عالیجاہ محمد نے اسے قتل کرلیا، لیکن نیشن آف اسلام والوں کا دعویٰ ہے کہ حکومت نے اس کو قتل کرایا تھا۔ میلکم ایکس پر کئی فلمز بھی بنی ہیں۔ وہ فلمز یہاں پاکستان میں بھی Videos پر دستیاب ہیں جو بآسانی مل جاتی ہیں، امید ہے کہ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ دیکھی بھی ہوں۔ میلکم ایکس اور عالیجاہ پر ضخیم کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے چند پاکستان میں بھی دستیاب ہیں۔ البتہ انٹرنیٹ پر کافی کتابیں پڑھی جاسکتی ہیں۔

مجھے گذشتہ بیس 20 پچیس 25 سال سے اس جماعت کے متعلق چند معلومات حاصل ہوئی تھیں تو میں بھی اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا بہت مشتاق تھا۔ لیکن کوشش بسیار کے باوجود مجھے معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ اس زمانہ میں کمپیوٹر بھی نہیں تھا کہ اس کے ذریعہ معلومات حاصل کرتا۔ میرے جن عزیزوں اور دوستوں کی امریکہ آمد ورفت تھی، اُن سب سے میں نے معلومات حاصل کرنا چاہیں، لیکن مجھے کہیں سے کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ نہ ہی کوئی کتاب یا کوئی مضمون کسی اخبار بھی اس بارے میں کہیں سے دستیاب ہوا۔ اس تمام طویل عرصہ میں جناح باغ لاہور کی لائبریری میں ایک جرنل (JOURNAL) میں بھی ایک مختصر سا مضمون میرے ہاتھ آیا۔ اتفاق سے 1995ء میں میری خواہر زادی نے میری مشکل حل کی اور مجھے بتایا کہ ان کے دفتر میں ایک صاحب جو اس تحریک سے وابستہ ہیں ان کے ساتھ کام کرتے ہیں، اور وہ ان کو مجھ سے ملادیں گی۔ چنانچہ اگلے ہی روز ایک صاحب LEE ROY MUHAMMAD نام کے ان کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لے آئے۔ یہ صاحب بالکل جوان تھے، اور اس جماعت کے نہایت فعال وسرگرم رکن تھے۔ مجھے انہوں نے عالیجاہ محمد کی تین کتابیں بھی مطالعہ کرنے کے لئے چندروز پر واپسی شرط کے ساتھ دیں اور یہ بھی بتلایا کہ ان لوگوں کی ایک مسجد BRIXTON کے علاقہ، لندن میں موجود ہے اور چندروز کے بعد وہاں ایک لیکچر بھی ہونا ہے۔ چنانچہ چندروز

کے بعد، جب وہاں لیکچر ہونا تھا تو میں ایک عزیز دوست کے ساتھ اس مسجد میں گیا۔ وہاں ایک صاحب DENNIS MOHD نام کے CHASTITY (عفت) اور FAMILY SANCTITY پر تقریر کر رہے تھے اور مجمع تقریباً سو 100 آدمیوں پر مشتمل ہوگا، مرد وخواتین دونوں موجود تھے لیکن سب BLACK ہی تھے ان BLACK لوگوں کی انگریزی قدرے مختلف اور غلط ہوتی ہے، اور ان کا تلفظ و لہجہ بھی الگ ہوتا ہے جس کو مشکل سے سمجھا جاتا ہے، اس لئے پوری تقریر تو میرے سمجھ میں نہیں آئی البتہ جب وہ آیات کا حوالہ دیتے تھے، تو میں ان کے مفہوم کے قریب قریب پہنچ جاتا تھا۔ چونکہ امریکہ میں بدچلنی عام ہے، اور کنبہ کی گرفت بھی کمزور ہوگئی ہے، اس لئے یہ موضوع ان حضرات کے لئے بہت اہم تھا۔ LEE ROY MOHD نے مجھے یہ بھی اطلاع دی تھی کہ ان کا اخبار Final Call، امریکہ سے نکلتا ہے اور ہر اتوار کی شام کو اس تحریک سے متعلق لڑکے Diceadilly بازار میں اس کو فروخت کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اتوار کی شام کو وہاں جا کر اخبار خرید لیا۔ جس کی قیمت ایک پاؤنڈ تھی۔ یہ اخبار اب بھی نکلتا ہے آپ حضرات بھی اس کو W.W.W.Final Call.Com پر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ اس وقت اس تحریک کے سربراہ LOUIS FARRA KHAN ہیں۔ اس اخبار سے آپ کو اس تحریک کی پوری معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

LEE ROY MOHD سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس تحریک سے ٹوٹا ہوا گروپ، یعنی اس کا ایک SPLINTER GROUP بھی ہے، جو ہم مسلمانوں جیسے عقاید رکھتا ہے۔ اور اس گروپ کے علماء مولوی یا مولانا کے بجائے اپنے نام کے ساتھ امام کا سابقہ استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بتایا کہ ڈاکٹر امام علاء الدین شہباز اور امام WW.DEEN، اس گروپ میں بہت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ اور یہ حضرات CHICAGO میں رہتے ہیں اور انہوں نے مجھے ان کا مکمل پتہ دیا۔ چنانچہ میں نے لندن سے ہی امام شہباز کو ایک خط تحریر کیا اور انہوں نے فوری اس کا جواب مجھے دیا، جو مجھے چند روز میں مل گیا۔ ان کے اس گرامی نامہ سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ تحریک طلوع اسلام سے واقف ہیں۔ بلکہ اس تحریک کے بہت مداح ہیں۔ کیونکہ یہ حضرات بھی صرف قرآن کو حجت سمجھتے ہیں اور حدیث کو کوئی اہمیت نہیں

دیتے نہ ہی عرب معاشرت اور فقہ کے قائل ہیں۔ بالکل طلوع اسلام کے نظریات کے حامل لوگ ہیں۔ مجھے اس بات پر تعجب بھی ہوا کہ وہ اس قدر باخبر لوگ ہیں حالانکہ یہ لوگ اردو سے بالکل ناواقف ہیں ۔ انہوں نے ڈاکٹر عبدالودود صاحب کی کتاب CONSPIRASIES AGAINST QURAN پڑھی ہوئی تھی۔اسی طرح مجھے اس تحریک کے اور علماء کا بھی علم ہوا، جن کی چند کتابیں پڑھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی قرآن پر گہری نظر ہے ۔لندن میں ہی میں نے ایک VIDEO، امام ڈبلیو ڈبلیو ڈین کے پروگرام کا دیکھا۔ یہ صاحب عالیجاہ محمد کے صاحبزادے ہیں، اوران کے انتقال کے بعد یہ ہی اس تحریک کے صدر مقرر ہوئے تھے۔لیکن چونکہ یہ اس تحریک کے نظریات چھوڑ کے خالص قرآنی بن گئے تھے اس لئے یا تو انہوں نے خود اس تحریک کو چھوڑ دیا، یا جماعت نے ان کو ہٹا دیا ہوگا۔لیکن FINAL CALL کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اب بھی ان کی عزت کرتے ہیں۔

لاہور آنے کے بعد میں نے دفتر طلوع اسلام میں بھی بیٹھ کر ایک طویل خط، ڈاکٹر امام علاء الدین شہباز کی خدمت عالی میں ارسال کیا، اور انہیں وہ خط اور ادارہ کی تین کتابیں ارسال کردیں۔ میں نے اپنے خط میں تحریک طلوع اسلام کی HISTORY TRACE کی اور انہیں عرض کی کہ یہ ادارہ تقریباً 50 سال سے خالص قرآن کریم کی تبلیغ کررہا ہے اور ہر ہر موضوع پر قرآن خالص کی روشنی میں مواد تحریر کیا ہے۔ اوران سے درخواست کی کہ اگر انہیں کسی CORNER سے کوئی اعتراض ایسا آئے جس کے جواب میں ان کو کوئی دقت محسوس ہو تو وہ اس اعتراض کو اس ادارہ کی طرف REFER کردیں، یہ ادارہ کو اس کا جواب تحریر کرکے ارسال کردے گا۔ میرے عریضے اور کتب کے جواب میں ان کا گرامی نام آیا جس میں انہوں نے کتابوں کے وصول کرنے کا شکریہ ادا کیا۔ اور انہوں نے بھی اپنی دو کتابیں ارسال فرمائیں ایک HOMOSEXUALITY اور دوسری POLYGAMY ان دونوں کتابوں کے لئے انہوں نے اجازت دی کہ ادارہ ان کو طبع بھی کرسکتا ہے اور ترجمہ بھی کراسکتا ہے۔ چنانچہ ادارہ نے پہلی کتاب کا ترجمہ ’’ہم جنس پرستی‘‘ کے نام سے طبع کرایا۔ دوسری کتاب کے سلسلہ میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ ’طاہرہ کے خطوط‘ اور ان کی کتاب

POLYGAMY میں نظریات ایک جیسے ہی ہیں ۔ بعض مقامات پر انہوں نے نشان تک لگا دیئے تھے جس سے وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ادارہ کے نظریات اور ان کے نظریات میں بہت تطابق ہے۔ مجھے انہوں نے یہ بھی اصرار فرمایا کہ میں ادارہ کا لٹریچر کثرت سے انہیں ارسال کروں اس طرح وہ عام لوگوں کو، اور خصوصاً نیشن آف اسلام کے لوگوں کو، مسلمان بناتے چلے جائیں گے۔ یہ لوگ خالص قرآنی نظریات کے حامل ہیں ۔ جیسا کہ تحریر کیا گیا ہے صرف قرآن کو حجت تسلیم کرتے ہیں ۔ اور عرب معاشرت کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں ۔ میں نے لندن میں ایک VIDEO، امام W.W.DEAN کا دیکھا تھا۔ اگر چہ نسلاً وہ BLACK ہیں لیکن ویڈیو میں وہ بہت DIGNIFIED معلوم ہورہے تھے۔ اسی ویڈیو میں ان کے گروپ کے ایک عالم کو دکھایا کہ وہ شراب کی ایک دکان کے باہر کھڑے ہیں اور وہ دکان عربوں کی تھی۔ وہ ان عربوں کو بُرا کہہ رہے تھے کہ ان کی وجہ سے اسلام کی تبلیغ میں رکاوٹ ہوتی ہے، کیونکہ وہ عرب شراب بھی پیتے ہیں اور جوا بھی کھیلتے ہیں ۔ اس پر ان عربوں نے اس عالم کا مذاق اڑایا ، اور کوئی اثر نہیں لیا۔ اس گروپ کے علماء بہت اچھے عالم ہیں ۔ ان کی کتابوں کے مطالعہ سے ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے ۔ انہوں نے تفسیر قرآن بھی لکھی ہے۔ ایک مرتبہ کسی کتاب میں ایک عالم نے لکھا تھا کہ ہم امام غزالی اور ابن تیمہ اور علماء کے حوالے دیتے ہیں اور ان سے INSPIRE ہوتے ہیں ۔ لیکن ہمارے (یعنی اس گروپ) کے اپنے علماء بھی جاہلیت میں ان سے کم نہیں ہیں ۔ ہمیں اپنے علماء کا ہی حوالے دینا چاہئے

یہ ساری تمہید اس لئے تحریر کی گئی ہے تا کہ قارئین کرام نفس مضمون سے بخوبی واقف ہوجائیں ۔ 7، نومبر 06 کو امریکہ میں جو الیکشن ہوا ہے اس میں ایک صاحب نیشن آف اسلام کے بھی کامیاب ہوکر مجلس نمائندگان میں آئے ہیں ۔ ان کا اسم گرامی KEITH ELLISON ہے۔ ان کی عمر صرف 43 سال ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے وکیل ہیں ۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے ممبر ہیں ۔ اُنیس 19 سال کی عمر میں رومن کیتھولک مذہب کو خیر باد کہہ کر نیشن آف اسلام میں شامل ہوگئے تھے۔ جس وقت کہ یہ اپنے آبائی وطن DETROIT، سینٹ میں طالب علم تھے۔ لیکن اب یہ MINNESOTA کی سیٹ سے آئے ہیں ۔ یہ عراق کی لڑائی کے

خلاف ہیں۔ الیکشن کے دوران جیسا کہ دستور ہے ہر پارٹی اپنے مخالف امیدوار پر ہر طرح کا الزام لگاتی ہے ان پر بھی اسلام کا لیبل لگنے کے الزام کو بہت ہوا دی گئی۔ نیشن آف اسلام نے 1995ء میں ایک جلوس نکالا تھا۔ انہوں نے اس جلوس میں بہت حصہ لیا تھا، ان کی اس کمزوری پر مخالفین نے بہت گرفت کی لیکن اس کے باوجود وہ کامیاب ہوگئے۔ کامیاب ہونے کے بعد انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ حلف برداری کی تقریب میں بائبل پر حلف نہیں لیں گے، بلکہ قرآن کریم پر حلف اٹھائیں گے۔ مجلس نمائندگان میں قرآن کریم کی یہ پہلی آواز ہے۔

موقر رسالہ 'صوت الحق' کے محترم مدیر صاحب کے نام یہ خط برائے طباعت ارسال کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین کرام اس کو ملاحظہ فرمائیں۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ نیشن آف اسلام کے سلسلہ میں ضرور بالضرور کام کریں خصوصاً وہ حضرات جو خود امریکہ میں موجود ہیں ۔ ان کو وہاں قرآن کی تبلیغ میں سہولت ہوگی، اس وقت، اس عہد کا یہ اہم ترین کام ہے ۔ نیشن آف اسلام کے علاوہ جو اس کا ٹوٹا ہوا گروپ ہے (SPLINTER GROUP) جس کا کافی تذکرہ مضمون میں کر دیا گیا ہے، اس کے قائدین (آئمہ) سے رابطہ قائم کریں ان میں سے چند حضرات CHICAGO میں رہتے ہیں۔ وہ آپ کی مدد کے طلب گار ہیں۔ جس قدر مواد آپ ان کو دیں گے، یا پاکستان سے انٹرنیٹ کے ذریعے ارسال کریں گے، وہ اس سے اسلام کی تبلیغ میں مدد لیں گے۔ جو حضرات واقعتا کام کرنا چاہیں وہ راقم سطور سے ای میل پر رابطہ قائم فرمالیں۔ اگر براہ راست وہ امام علاء الدین یا دوسرے حضرات سے رابطہ کریں تو راقم سطور کا حوالہ دے دیں اس سے انہیں اس فکر کو IDENTIFY کرنے میں سہولت ہوگی۔ آپ کی سہولت کے لئے دو ای میل اکاؤنٹ تحریر کئے جاتے ہیں۔ www.Newminal Production.com,www Final call.com

تمام مسلم ممالک میں کسی جگہ امید کی کرن نظر نہیں آتی چاروں طرف اندھیرا ہے اور یہ اندھیرا بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ پاکستان کی حالت آپ کے سامنے ہے۔ کیا عجب کہ امریکہ سے یہ آواز بلند ہو، آخر تاتار کا واقعہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک ایک تاتاری بیس

ہیں مسلمانوں کو مار دیتا تھا۔ ان کا اس درجہ خوف تھا کہ بعض اوقات ایسا ہوا کہ کسی تاتاری کے پاس تلوار نہیں ہوتی اور اس نے کسی مسلمان کو پکڑ لیا۔ تو وہ تاتاری اس مسلمان کو ایک جگہ کھڑا کر کے چلا جاتا تھا کہ میں تلوار لا رہا ہوں اور وہ مسلمان خوف کے مارے وہاں سے سرکتا تک نہیں تھا اور وہ تاتاری تلوار لا کر اس کو ذبح کر دیتا تھا۔ تاتاریوں کا اس درجہ خوف تھا۔ پھر وہی تاتار مسلمان ہو گئے اور وہ خود اسلام اور مسلمانوں کے محافظ بن گئے۔ اور بقول علامہ کے۔ پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے۔ اس لئے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ کام کو بہت اہم خیال فرمائیں اور اس میں ضرور ضرور پوری پوری کوشش وجدوجہد فرما دیں۔ باقی اللہ تعالیٰ کی مدد ضرور ہمارے ساتھ ہوگی۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ۔ اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا (اور وہ مدد یہ ہوگی کہ) تمہارے قدموں کو جما دے گا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جس معاشرہ یا نظام میں مقصد حیات محض طبعی ضرورت کی تکمیل یا حیوانی جذبات کی تسکین ہو وہ انسانی اقدار کو نظر انداز کرے وہ معاشرے یا نظام تباہ ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مسلمانوں کے زوال پر حضرت شیخ الہند صاحب مرحوم کا تبصرہ

حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب ہمارے طبقہ علماء میں نہایت بلند مقام کے حامل تھے۔ مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، بانی دار العلوم دیوبند، نے مولانا محمود الحسن صاحب کو بھرپور تربیت سے سرفراز فرمایا تھا۔ 1914ء میں جب پہلی عالمی جنگ شروع ہوئی تو انگریزوں کے لئے وہ عرصہ بہت دشوار گذار تھا۔ اور انہوں نے ہر اس شخص کو جس سے انہیں خدشہ تھا، یا قید کر دیا، یا اپنی زیر نگرانی رکھا۔ انہی حالات وخدشات کے پیش نظر، حضرت شیخ الہند کو بھی برٹش گورنمنٹ نے جنوری 1917ء میں مکہ مکرمہ میں گرفتار کر لیا تھا۔ پھر انہیں جزیرہ مالٹا میں منتقل کر دیا، اسی وجہ سے ان کا نام اسیر مالٹا مشہور ہو گیا تھا۔ جب حالات برٹش گورنمنٹ کے لئے کچھ سازگار ہوئے تو انہوں نے حضرت اقدس کو تین سال سات ماہ کے بعد مالٹا سے رہا کر دیا۔ اپنی رہائی کے بعد حضرت نے پھر قومی کاموں میں بھرپور حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی دوران انہوں نے مسلمانوں کے زوال وادبار کے بارے میں ایک بیان دیا جو بعد میں بہت مشہور ہوا۔ اور بیشتر رسالوں اور کتب میں اس کا حوالہ دیا گیا۔ ترجمان القرآن، بابت اگست 06ء میں بھی ان کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے۔ جہاں سے یہ بجنسہ (VERBATIM) نقل کیا جاتا ہے، انہوں نے ارشاد فرمایا:۔

"میں جیل کی تنہائیوں میں مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی تباہی کے اسباب پر غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس کے دو سبب ہیں۔ (1) مسلمانوں کا قرآن کو چھوڑ دینا (2) ان کے آپس کے اختلافات۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی قرآن کو لفظاً ومعناً عام کروں۔ بچوں کے لئے تعلیم کے مکاتب ہر ہر بستی میں قائم کراؤں بڑوں کو عوامی درس قرآن کے لئے قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کروں۔ علماء کے باہمی اختلاف کو سلجھاؤں اور اتحاد کی سعی کروں۔ علمی اختلاف کو

آپسی جدال اور تعصب میں تبدیل کرنے میں انگریز بہادر کی چالوں اور مکاریوں کا پردہ فاش کروں۔'' کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت کا یہ بیان آنکھوں پر رکھنے کے قابل ہے۔ حضرت نے مسلمانوں کے زوال کی تشخیص قرآن کو چھوڑنا اور آپس کے اختلاف تجویز فرمائی ہے۔اور ساتھ ہی اس کا علاج قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا، اور انگریزوں نے جن چالوں سے علماء کو آپس میں لڑایا ہے، ان چالوں کو واشگاف کرنا، بتایا ہے۔

قرآن کریم نے مسلمانوں کے زوال کے ان دونوں اسباب کی نشاندہی پہلے ہی فرمادی تھی جب کہ قرآن نے حضورؐ کی شکایت ان الفاظ میں بیان فرمادی تھی کہ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا (25/30) اور کہا رسول نے اے میرے پروردگار میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔ حضرت اقدس نے اپنے بیان میں قرآن کو چھوڑنے کا علاج وتدارک یہ فرمایا کہ وہ کثرت سے مکاتب قائم فرمائیں گے جن میں بچوں اور بڑوں کو تعلیم دینے کا بندوبست ہوگا اور جن میں انہیں قرآن کی تعلیم پر عمل کرنے پر آمادہ کیا جائے گا۔ حضرت اقدس مولانا محمود حسن کے شاگرد رشید مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے ان کی غیر مکمل تفسیر کی تکمیل فرمائی ہے۔ انہوں نے اس آیت کی تفسیر ذیل میں تحریر فرمایا ہے" آیت میں اگرچہ مذکور صرف کافروں کا ہے۔ تاہم قرآن کی تصدیق نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس پر عمل نہ کرنا، اس کی تلاوت نہ کرنا۔ اس کی صحیح قرات کی طرف توجہ نہ کرنا، اس سے اعراض کرکے، دوسری لغویات یا حقیر چیزوں کی طرف متوجہ ہونا یہ سب صورتیں درجہ بدرجہ ہجران قرآن کے تحت داخل ہوسکتی ہیں۔ اس تفسیری حاشیہ میں مولانا عثمانی نے قرات کی صحت کا خیال نہ رکھنا، تلاوت نہ کرنا، اس میں تدبر نہ کرنا، اس کی تصدیق نہ کرنے کو قرآن کے چھوڑنے کے برابر قرار دیا ہے۔

آپ نے ان دونوں علماء کرام کا نظریہ مسلمانوں کے زوال اور اس کے علاج کے متعلق ملاحظہ فرمایا۔ جناب شیخ الہند کا نظریہ ان کے مشہور بیان میں درج ہے اور حضرت مولانا عثمانی نے اپنا نظریہ آیت کریمہ کے حاشیہ میں تحریر فرمادیا ہے۔ زوال کے اسباب تو یقیناً درست ہیں اور قرآن کریم کے مطابق ہیں۔ لیکن اس کا علاج قطعاً درست نہیں ہے۔

کیونکہ بچوں اور بڑوں کو ناظرہ قرآن پڑھانے، تلاوت کرنے، قرات (تجوید) کا اہتمام کرنے، سے مُردہ قوم زندہ نہیں ہوتی۔ یہ دونوں حضرات جنہوں نے اپنی ساری عمر مذہب اور مسلمانوں کی خدمت کرنے میں گذاردی، نہایت احترام کے مستحق ہیں۔ ان سے اختلاف کرنے کی جرات بہت مشکل سے ہوتی ہے۔ اصل مصیبت اور عذاب یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کے سامنے مذہب تھا۔ دین کا تصور ان کے سامنے تھا ہی نہیں۔ یہ مذہب کے نمائندے تھے، دین کی نمائندگی ان کے بس کی بات نہیں تھی اور ہم مسلمان بھی زوال وادبار کے غار سے نہیں نکل سکتے جب تک قرآن کریم کو دین کی حیثیت سے اختیار نہ کریں۔ مذہب میں آپ خواہ کسی قدر بھی چاہیں کہ قرآن کو پکڑے رکھیں، آپ مذہب میں قرآن کو پکڑ ہی نہیں سکتے۔ قرآن کو آپ صرف دین میں پکڑ سکتے ہیں۔ آپ دین اور صرف دین میں ہی اس پر عمل کرسکتے ہیں۔ قرآن کو چھوڑنے کا اصل سبب ہمارا مذہب کے معیار پر آجانا ہے۔ آپ جب بھی قرآن پر عمل کرنا چاہیں، اس کو دین کی حیثیت سے اختیار کریں۔ اس سے آپ قرآن کو پکڑ لیں گے اور دین کے لئے اپنی حکومت کا ہونا لازمی ہے۔ دین یا حکومت کے قیام پر قرآن کا جو اصرار و تاکید ہے وہ ان آیات میں ملاحظہ فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ ......(۸/۶۰) اور کفار کے مقابلے کے لئے تم میں جس قدر استطاعت ہو قوت مثلاً بندھے ہوئے گھوڑے (وغیرہ) تیار رکھو، جس سے تم اپنے اور اللہ کے دشمن کو ڈرائے رکھو۔

اس آیہ کریمہ میں حکم دیا جارہا ہے کہ ہم اپنی استطاعت کے بقدر اعدائے دین سے مقابلے کے لئے قوت فراہم کریں تنظیم افراد، اقامت حکومت، یا دوسرے لفظوں میں نصب امام خود قوت کا، بلکہ اس نوعیت کی کل قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ کیا قیام حکومت، یا اقامتہ دین کے بغیر ان قوتوں کا ہونا ممکن ہے؟

(2) دوسرا حکم ارشاد ہوتا ہے۔ یٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۔۔۔ الخ (4/59)، اللہ، اس کے رسول اور اپنے اولی الامر

کی اطاعت کرو، یہاں نہایت واضح طور پر اطاعت اولی الامر کا حکم دیا جارہا ہے۔ اس چیز کا تصور بھی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک خود کسی اولی الامر کا وجود نہ ہو، اسے وجود میں لانا یا بالفاظ دیگر نصب اولی لامر مقتضائے نص ہے اس کی فرضیت میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ اطاعت اولی الامر بغیر نصب اولی الامر کے ایک ایسی ناممکن چیز ہے جس کا خیال بھی کوئی شخص نہیں کرسکتا۔ اسی لئے دین کا قیام ہم سب مسلمانوں پر فرض علی الکفایۃ ہے

(3) اقامت دین کی فرضیت کے بارے میں سب سے پہلے آیات جہاد ہمارے سامنے آتی ہیں۔ جہاد کا تصور بھی بغیر حکومت کے نہیں ہوسکتا۔ جو آیات جہاد کا فریضہ ہم پر عائد کررہی ہیں، وہ اقامت دین کو بھی فرض قرار دے رہی ہیں، یہ بات اس قدر بدیہی ہے کہ یحتاج تفصیل وبیان نہیں ہے۔

(4) چوتھا حکم ارشاد ہوتا ہے، **وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ** (49/8)۔ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان مصالحت کرادو پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر تعدی کرے تو اس سے جنگ کرو تا آنکہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف رجوع کرے۔ یہاں یہ حکم دیا جارہا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو دوسرے مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان میں باہم مصالحت کرائیں۔ یہاں **تفیٓ الی امر اللہ** سے مراد اس فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے جو مصالحت کرانے والوں نے فریقین کے سامنے رکھا ہے۔ اگر کوئی پارٹی اس سے گریز کررہی ہے تو وہ گویا اللہ کے حکم کے آگے جھکنے سے گریز کررہی ہے۔ اس صورت میں مسلمانوں کی حکومت کو تعدی کرنے والی پارٹی سے جنگ کرنی لازمی ہے۔ یہ امور صرف اس وقت سرانجام دیئے جاسکتے ہیں جب مسلمانوں کی ایک مضبوط حکومت ہو اور دین کا نظام قائم ہو۔ یہاں ایک بات نہایت غور طلب یہ ہے کہ یہاں اس آیت میں مصالحت کرانے والوں کے فیصلے کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کرکے اس کو امر اللہ کہا ہے۔ اسلامی حکومت کے فیصلوں اور اس کے اقدامات کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا

ہے۔ انسانوں کے لئے اس سے بڑا اور کوئی شرف نہیں ہو سکتا۔

(5) اس بارے میں پانچواں حکم شوہر اور بیوی کے اختلاف دور کرنے کے سلسلے میں ہوتا ہے وَاِنۡ خِفۡتُمۡ شِقَاقَ بَیۡنِهِمَا فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا (4/35) اگر تمہیں ان دونوں میاں بیوی کے درمیان باہمی مخالفت کا اندیشہ ہو، تو ایک منصف شوہر کے خاندان سے مقرر کرو، اور ایک منصف بیوی کے خاندان سے۔ یہاں فابعثوا امر کا صیغہ لایا گیا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کے حاکم وقت یا عدالت سے مرافعہ کرنا ضروری و لازمی ہے اور یہ حکومت یا اس کی نمائندہ عدالت کا فرض ہے کہ وہ ایک ثالثی بورڈ مقرر کر کے معاملہ کی تحقیق کرائے۔ نیز یہ کہ طلاق بھی عدالت کی اجازت کے بغیر نہیں دی جاسکتی۔ ان دونوں کاموں کے لئے اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔

(6) قرآن کریم میں مومنین کے لئے چھٹا حکم یہ ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا كُتِبَ عَلَیۡكُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی (2/178)، اے ایمان والو تم پر مقتولین کا قصاص لینا فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ قاتل کا کھوج لگانا اور اس کا تعاقب کرنا قصاص ہے۔ قصاص وہ سزا ہے جس میں مجرم کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جس کا مرتکب وہ خود ہوا ہے۔ اس حکم کی مخاطب اسلامی حکومت ہے کیونکہ قاتل کا کھوج لگانا اور اس سے بدلہ لینا، مقتول کے ورثا کے بس کی چیز نہیں ہے۔ اس معاملہ میں اصل ذمہ داری حکومت کی ہی ہے۔ افراد متعلقہ کی نہیں ہے۔ مقتول کے ورثا کی حیثیت (زیادہ سے زیادہ) استغاثہ کے گواہوں کی ہوگی۔ مستغیث کی نہیں ہوگی۔ مستغیث تو خود حکومت ہی ہوگی۔

(7) ساتواں حکم مومنین کے لئے یہ ہے کہ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاجۡتَنِبُوا الطّٰغُوۡتَ (16/36)، اللہ کی اطاعت کرو اور طاغوت سے بچو، نیز فرمایا، یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یَّتَحَاكَمُوۡۤا اِلَی الطَّاغُوۡتِ (4/60) یعنی یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت کے لئے کرائیں۔ وَقَدۡ اُمِرُوۡۤا اَنۡ یَّكۡفُرُوۡا بِهٖ (4/60) حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ طاغوت کو بالکل نہ مانیں۔ آیت نے خود واضح کر دیا ہے کہ طاغوت فیصلہ کرانے کی اتھارٹی ہے۔ کوئی ذہنی تصور یا شیطان وغیرہ نہیں ہے بلکہ طاغوت کے معنی وہ حاکم، وہ

عدالتیں، وہ حکومتیں، وہ نظام جو خدا کے قانون (قرآن) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رُو سے معاملات کے فیصلے کریں۔ اس آیت سے اسلامی حکومت کے قیام کی فرضیت واضح ہو جاتی ہے۔

(8) سورۃ مائدہ میں تین مرتبہ کی تکرار کے ساتھ ارشاد ہوتا ہیا وَ مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ (5/44)، جو بما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہ کرے وہ کافر ہے وہ ظالم ہے اور فاسق ہے (5/47, 45)

(9) دین قائم کرنے کے لئے نواں حکم ارشاد ہوتا ہے فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوۡکَ فِیۡمَا شَجَرَ بَیۡنَہُمۡ (4/65) پس اے رسول تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکم صرف حضورؐ کے دور تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کی فرضیت حضورؐ کے جانشینوں کو بھی اپنے احاطہ میں لیتی ہے۔

(10) دسواں حکم ارشاد ہوتا ہے کُنۡتُمۡ خَیۡرَ اُمَّۃٍ اُخۡرِجَتۡ لِلنَّاسِ تَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ تَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ (3/110) تم بہترین گروہ ہو کہ لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو کہ تم لوگوں کو اچھے کام کا حکم کرو اور بُرے کاموں سے روکو۔ ظاہر ہے کہ یہ فریضہ بغیر ایک مضبوط حکومت کے کسی اور طرح ادا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ احادیث نبویہ بھی اس بارے میں کثرت سے موجود بھی ہیں جن میں سے چند نقل کی جاتی ہیں۔

(1) ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة جاهلیة (مسلم شریف، باب لزوم الجماعة) جو شخص ایسی حالت میں مرجائے کہ اس کی گردن میں کسی امیر کی بیعت نہ ہو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

(2) وانما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به فان امر بتقوی الله وعدل فان له بذلك اجراً وان قال بغیر فان علیه منه (مشکوۃ شریف، کتاب الامارۃ) بیشک امام وہ سپر ہے کہ جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی

ہے اور اس کے ذریعہ سے حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔ پس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو اُسے ثواب ملے گا، اور اس کے خلاف کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔

(3) علم کلام کی مشہور کتاب مواقف کے مصنف اجماع صحابہ سے استدلال فرماتے ہوئے اس مسئلہ میں اہل سنت والجماعت کا اجماع اس طرح ظاہر فرماتے ہیں۔

نصب الامام واجب عد نا سمعواً ۔امام کا تقرر ہمارے اوپر دلیل نقلی کی بناء پر واجب ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء میں تحریر فرمایا۔

مسئله واجب بالكفايه است بر مسلمين الى يوم القيامه نصب خليفه مستجمع شروط۔

یہ دس آیات کریمات اور چند احادیث نبویہ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ جن میں سے ہر ایک آیت اس بات پر دال ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام مسلمانوں پر فرض ہے۔ لیکن ان آیات کی تشریح وتوضیح ہماری تفاسیر میں جس طرح کی گئی ہے ان میں اس بات کا خاص التزام واہتمام رکھا گیا ہے کہ کسی جگہ بھی اسلامی حکومت یا دین کے قیام کا تصور مسلمانوں کے سامنے نہ آنے پائے۔ ان تمام آیات کی تفاسیر کے اقتباس نقل کرنے سے مضمون کے طویل تر ہونے کا خدشہ ہے۔ اگر آپ خود تفاسیر مطالعہ کر سکیں تو قرآن کریم کے تراجم وحواشی ہی ملاحظہ فرمالیں آپ کو اس بات کی خود تصدیق ہوجائے گی۔ یہ تمام آیات مذہب کی رو سے واضح کی گئی ہیں۔ لیکن قرآن کریم چونکہ دین کا داعی ہے اس لئے آپ جب بھی مذہب کی سطح پر آئیں گے قرآن از خود ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ قرآن چھوٹنے کا سبب اس کے نظام کو چھوڑنا ہے۔ اس کی تلاوت یا اس کی تجوید کو چھوڑنا، اس کا سبب نہیں ہے۔ آپ جب بھی قرآن کو بطور دین کے نافذ کریں گے، اس دین کے قیام سے اس وعدے پورے ہوں گے۔ جب اس کے وعدے آپ کی آنکھوں کے سامنے پورے ہوں گے، آپ کو سرفرازی وسربلندی حاصل ہوگی، رزق کی فراوانی ہوگی، آپس میں محبت ومودت ہوگی، آپ خود قرآن کو اپنی جان سے عزیز شمار کریں گے، اور قرآن کو پکڑے رکھیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ **یا ایھا الذین آمنوا** کا مفہوم ہم مسلمان صرف نظری طور پر ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اور اس کا یہ مفہوم مذہب کی سطح کا ہے، اس کا دینی مفہوم یہ ہے کہ اے وہ لوگوں جو اس بات پر یقین کامل رکھتے ہو کہ اللہ کا دیا ہوا نظام، انسانوں کے اپنے ذہن سے بنائے ہوئے تمام نظام ہائے باطل سے بہتر ہے اور ہم اس بات پر قائم ہیں کہ ہم صرف اور صرف اس نظام کے مطابق ہی اپنی عملی زندگی بسر کریں گے، کیونکہ ساری انسانیت کی فلاح اسی نظام میں مضمر ہے اس طرح ایمان لانے کے بعد ساری زندگی قرآن کے مطابق بھی گذرتی ہے اور قرآن ہاتھ سے بھی چھوٹنے نہیں پاتا۔

اختلاف کی انتہائی شکل فرقہ بندی ہے۔ فرقہ بندی نے جس درجہ مسلمانوں کو نقصان پہنچایا ہے، اس میں نہ تو دورائے ہوسکتی ہے اور نہ کوئی صحیح الدماغ انسان حضرت اقدس کے اس بیان سے اختلاف کرسکتا ہے۔ غیر مسلم حضرات کو مسلمانوں کی فرقہ بندی سے انتہائی خوشی ہوتی ہے اور وہ اس کو ہوا دینے کے لئے کوشاں بھی رہتے ہیں جس کا تذکرہ آگے آتا ہے۔ لیکن اصل بات تو یہ ہے کہ غیر مسلم لوگ ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ فرقہ بندی مسلمانوں میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ صدر اول کے فوری بعد سے فرقہ بندی شروع ہوگئی تھی اور آج تک یہ فرقہ بندی قائم ہے۔ نہ صرف عقائد، بلکہ تمام ارکان اسلام مختلف فرقوں میں مختلف ہیں، نماز، روزہ، زکوۃ، حج، خمس، سب نے مختلف فرقوں میں مختلف صورت اختیار کی ہوئی ہے۔ مختلف فرقوں کی تفاسیر فقہ بالکل مختلف ہیں۔ ایک فرقہ کے علماء دوسرے فرقہ کے علماء کی نہ تفسیر کا مطالعہ کرتے ہیں اور نہ ہی احادیث کی کتب کا۔ سنی حضرات کی صحاح ستہ اور ہیں، اور شیعہ حضرات کی کتب اربعہ اور ہیں۔ اچھے تعلیم یافتہ سنی علماء کو شیعہ حضرات کی کتب اربعہ کا نام تک معلوم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس فرقہ بندی نے قرآن کریم تک کو نہیں چھوڑا، کہ ہر فرقہ آیات قرانیہ کا مختلف مفہوم لیتا ہے۔ یہ سب امور آپ کے علم میں ہیں۔ صرف حیرت نہیں بلکہ سخت حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ ہمارے علماء کرام اس فرقہ بندی کو ڈیڑھ ہزار سال سے برداشت کرتے آرہے ہیں، اور کسی نے ایک لفظ بھی اس کے خلاف نہیں لکھا۔ آپ ڈیڑھ ہزار سال کا اسلامی لٹریچر پورا کھنگال

ڈالیں آپ کو ایک لفظ فرقہ بندی کے خلاف کسی جگہ نہیں ملے گا۔ حضرت اقدس نے بھی فرقہ بندی کے لفظ سے گریز کر کے، اختلافات کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ اس ڈیڑھ ہزار سال کے طویل عرصہ کے بعد تحریک طلوع اسلام وہ تحریک ہے جس کو یہ شرف حاصل ہوا کہ اس نے فرقہ بندی کے خلاف کھل کر لکھا، طلوع اسلام نے وہ آیات پیش کیں جن سے فرقہ بندی شرک ثابت ہوتی ہے۔ اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ فرقہ بندی کرنے والوں کا کوئی تعلق حضورؐ سے نہیں رہتا۔ اس موضوع پر پُر مغز مقالات تحریر کیے جن کو رسالہ میں طبع کرنے کے علاوہ ان پمفلٹ کو ہزاروں کی تعداد میں مفت تقسیم کیا گیا۔ طلوع اسلام کی اس کوشش کا بہت اچھا اثر ہوا اور لوگ فرقہ بندی سے بیزاری ظاہر کرنے لگے۔ یہ آیات کریمات ہمارے علماء کرام کے سامنے بھی تھیں لیکن انہوں نے ان آیات کو ہمیشہ نظر انداز کیا اور فرقہ بندی کے خلاف کبھی بھی کچھ نہیں لکھا۔ اس کے دو اسباب تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ علماء کرام خود فرقہ بندی کی تخلیق ہوتے ہیں۔ وہ فرقہ بندی کے خلاف کیسے لکھ سکتے ہیں دوسرے ان کے سامنے دین ہوتا ہی نہیں وہ مذہب کی سطح پر ہوتے ہیں۔ مذہب میں فرقہ بندی جائز ہوتی ہے۔ فرقہ مذہب میں ہوتا ہے، دین میں فرقہ ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک غیر مسلموں کا مسلمانوں سے دشمنی و عداوت رکھنے کا تعلق ہے قرآن کریم نے مسلمانوں کو پہلے ہی متنبہ کر دیا تھا وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (2/120)، یہود و نصاریٰ تم سے کبھی خوش نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم ان کے مذہب کی پیروی نہ کر لو۔ قرآن کریم کی اس پیشگوئی کی تصدیق برابر ڈیڑھ ہزار سال سے ہوتی چلی آ رہی ہے اور اس دور میں خصوصاً چاروں طرف سے مسلمانوں پر یلغار ہے۔ ہمارا روزمرّہ کا مشاہدہ اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ لیکن یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم اب بھی فرقہ بندی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مسلمان خود اپنے آپ کے دشمن ہیں۔ مشرق وسطیٰ میں اپنا اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں، ایران و عرب میں برابر کشمکش جاری ہے۔ اس کی ایک مثال پیش خدمتِ عالی ہے۔ ڈیلی ٹائمز 30، اگست 06 کے ایک مضمون کا اقتباس ان کے اپنے الفاظ میں تحریر کیا جاتا ہے، جس سے آپ کو اندازہ ہو سکتا

ہے کہ عربوں اور ایران، یا دوسرے الفاظ میں سنی شیعہ میں کس قدر دشمنی ہے۔ اصل الفاظ اس لئے درج کئے جاتے ہیں کہ ترجمہ کی ذرا سی لغزش سے بھی ذمہ داری مترجم پر آ جاتی ہے ۔ بجنسہ الفاظ یہ ہیں۔

3.This rivalry was at the heart of the eight-year Iran Iraq war and the reason why Iran supplied oil to Iraq during 4the 1973 Arab. Irael war. میں نے بطور احتیاط مضمون کے مصنف اعجاز الحسن صاحب کے اپنے الفاظ تحریر کردیئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایران نے عربوں کی مخالفت میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران اسرائیل کو پیٹرول فراہم کیا تھا۔ ان حالات میں جبکہ مسلمان چاروں طرف سے نرغہ میں ہیں فرقہ بندی کی وجہ سے آپس میں اختلاف کرنا، تباہی و بربادی کو دعوت دینا ہی ہے۔ اسی اخبار "ڈیلی ٹائمز" نے اپنے اداریہ بنام۔ TIME TO GET BACK TO BUSINESS میں ہندوستان کے عزائم کے بارے میں، ان کی خفیہ ایجنسی کے ارادے، انہی کے اپنے الفاظ میں، جو ایجنسی نے لکھے ہیں وہ نقل کرتا ہے۔ 4. India is looking at sectarian and ethnic fault Lines in Pakistan and Bangladesh which can be xploited to its adv antage یہاں بھی اغیار کی وہی دشمنی اور ہماری فرقہ بندی سے فائدہ اٹھانے کی ہی کوشش ہے۔ ہماری فرقہ بندی سے فائدہ اٹھانے کی تیسری مثال وہ ہے جس کا حوالہ میں نے اپنے ایک سابقہ مضمون میں دیا ہے اس کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے وھـــــو ھـــــذا "فرقہ بندی کے نقصانات کے سلسلہ میں اپنے قارئین کرام کے ازدیاد علم کے لئے ایک اور بات کا اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، کچھ عرصہ ہوا پروفیسر۔ M. SAMUEL.P.HUNTNGTON جو ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک پروفیسر ہیں، ان کا ایک مضمون THE CLASH OF CIVILIZATION ایک مشہور رسالہ SUMMER 1993 کے FOREIGN AFFAIRS کے اشو میں طبع ہوا تھا۔ اس مضمون نے بہت شہرت پائی، ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں دوسرے مضمون کا موضوع پر کشش ہے، اور مضمون علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ۔

دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہذیبوں کا ہوگا۔ ایک طرف مسلمان اور کنفوشس کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی مضمون پُر مغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات وواقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے زیر نظر مضمون کو اس کی صحت وسُقم سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ اس زیر تسوید مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو بات قارئین کرام کی خدمت عالیہ میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ، اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے، اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دے ان مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:۔

TO EXPLOIT DIFFERENCES AND CONFLICTS AMONG CONFUCIAN AND ISLAMIC STATES کنفوشس کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں آپس کے اختلافات سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یعنی کنفوشس کے پیروکاروں میں جو اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہئے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں جو باہمی اختلافات ومناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

واضح رہے کہ جن حضرات نے اس عبارت کا یہ مفہوم لیا ہے کہ کنفوشس کے پیروکاروں اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے تو انہوں نے اس عبارت کا مفہوم غلط سمجھا ہے۔ اس عبارت کا درست مفہوم یہ ہے کہ کنفوشس کے پیروکاروں کے اپنے باہمی اختلافات اور مسلمانوں کے اپنے باہمی (فرقہ وارانہ اختلافات۔ از راقم سطور) اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس عبارت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہ ہے۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ تجاویز جناب پروفیسر صاحب نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف کے اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرقہ

بندی کی لعنت ہمارے لئے کس درجہ مہلک اور تباہ کن اور ہمارے اغیار و اعداء کے لئے کیسی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

فرقہ بندی ختم کرنے اور مسلمانوں کو زوال و ادبار سے نکالنے کا واحد حل دین کا قیام ہے۔ دین کے قیام سے فرقہ بندی از خود ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس کو ختم کرنے کی کوشش کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ جبکہ مذہب میں فرقہ بندی کے ختم ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ دین کے قیام کی کوشش کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ دین کا صحیح تصور اور مذہب اور دین کا فرق ذہن میں بالکل واضح ہو۔ اس بارے میں تمام قارئین کرام کی خدمت عالی میں عرض ہے کہ اس موضوع کے لئے ایک مرتبہ پھر وہ "سلیم کے نام" کتاب کا چوبیسواں خط "اطاعت رسول" ضرور بغور ملاحظہ فرمائیں۔ اس ایک ہی مضمون کے مطالعہ سے دین اور مذہب کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ جس طرح تحریک طلوع اسلام ڈیڑھ سو سال کے دوران وہ واحد تحریک ہے جس نے فرقہ بندی کے خلاف آواز بلند کی، اسی طرح یہ وہ واحد تحریک ہے جس نے دین کا واضح تصور پیش کیا ہے، اور جو دین کی داعی ہے۔ ورنہ صدر اول کے فوری بعد سے، دین کا تصور ہم مسلمانوں میں بالکل محو ہو چکا تھا۔

آخر میں عرض ہے کہ چونکہ میری ابتدائی زندگی، مدارس عربیہ میں گذری ہے اس لئے میری رگ رگ میں علماء کرام اور خصوصاً حضرت شیخ الہند کی عزت و محبت سرایت کئے ہوئے ہے۔ ان کے اخلاص، جذبہ قربانی و ایثار میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان حضرات کی ساری عمر قوم کی خدمت میں گذری، ان کی خامی صرف یہ تھی کہ ان کے سامنے دین کا تصور نہیں تھا انہوں نے ساری عمر مذہب کی سطح پر ہی گذار دی۔ اور یہ ان کی مجبوری تھی، انہیں تعلیم ہی مذہب کی دی گئی تھی اور اب بھی تمام مدارس عربیہ میں بغیر کسی استثناء کے، مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے، دین سے ان کو کیا علاقہ؟

خاص حضرت شیخ الہند کی عقیدت کے جذبہ کے زیر اثر تحریر ہے کہ وہ دار العلوم دیو بند کے پہلے طالب علم تھے۔ چونکہ اس وقت تک دار العلوم کی عمارت تعمیر ہونی شروع نہیں ہوئی تھی، اس لئے دار العلوم کی ابتداء ایک درخت کے سایہ میں شروع ہوئی تھی

حضرت کا اسم گرامی محمود الحسن تھا۔ اتفاق سے جن استاد نے سبق دینا شروع کیا ان کا اسم گرامی بھی محمود تھا۔ استاد وشاگرد دونوں کا نام محمود ہی تھا۔ حضرت کے مُربی اور دار العلوم کے بانی، مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب، اور سر سید احمد خاں، دونوں، مولانا مملوک العلی کے شاگرد تھے، ایک نے دیوبند کی بنیاد رکھی، اور دوسرے نے علی گڑھ کی۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی مساعی جمیلہ کو قبول فرمائے۔ وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ (41/33) اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جو لوگوں کو خدا کی طرف بلائے اور خود اچھے کام کرے اور کہے کہ میں بھی یقیناً اللہ کے فرمانبردار بندوں میں سے ہوں۔

☆**استدعا**☆ ہم نے نہایت ہی نامساعد حالات میں دین کی ایک شمع صوت الحق کی صورت میں روشن کی ہے۔ خالص لوجہ اللہ۔ اب یہ دین کے شیدائیوں کا کام ہے کہ وہ اس روشنی کو لے کر قرآن میں دیئے گئے پیغام کو عالم انسانیت میں پھیلائیں، کیونکہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کے پیغام کو سمجھنا اور سمجھانا اور اس کے عطا کردہ نظام کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر عائد ہوتی ہے.................... (6/19)

☆

جس معاشرہ کا اندازہ یہ ہو کہ جس پارٹی کی زیادہ اور جتھہ مضبوط ہو اس کی عزت کی جائے (خواہ وہ جوہر ذاتی کے اعتبار سے کیسا ہی کمزور اور نالائق کیوں نہ ہو) اور جو شخص تنہا اور بے آسرا رہ جائے اسے کوئی نہ پوچھے وہ معاشرہ کبھی پنپ نہیں آسکتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلامی قانون سازی
کے بارے میں چند گذارشات

اخباری اطلاعات کے مطابق صدر محترم جناب پرویز مشرف صاحب نے مورخہ 17 جولائی 06 کو لاء منسٹری (وزارت قانون) کی ایک تقریب میں ارشاد فرمایا کہ ملک کے تمام قوانین کو قرآن وسنت کے مطابق بنایا جائے، تاکہ لوگ عزت کی زندگی بسر کر سکیں اور ملک سے ناانصافیاں دور کی جاسکیں۔ جناب صدر محترم نے جو بیان ارشاد فرمایا ہے وہ ہمارے ملک کے علماء کرام اور عام مسلمانوں کے نظریہ وعقیدہ کے مطابق ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ہمارے ہاں مسلمانوں میں قانون سازی کا طریقہ بھی یہی چلا آرہا ہے کہ ہماری فقہ کی اساس قرآن وسنت پر ہی ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے تمام قوانین قرآن وسنت کے مطابق ہونے چاہئیں تو اس کا عملی مفہوم یہ ہوتا ہے کہ تمام اسلامی قوانین قرآن وروایات کے مطابق ہونے چاہئیں۔ یعنی سنت کا عملاً مفہوم کتب روایات ہوتا ہے۔ وقتی اور موجودہ حالات سے بالاتر (DETACHED) ہوکر اس موضوع کے بارے میں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ قارئین کرام کو یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ اب تک ہماری فقہ کس طرح تیار ہوئی ہے۔ اس کے ماخذ کیا تھے، اور اس سابقہ فقہ کی موجودہ دور میں کیا اہمیت ہے۔ اور اس کو قرآن وسنت کے مطابق کس طرح کیا جاسکتا ہے۔

ہمارے ہاں اسلامی قانون کے چار ماخذ چلے آرہے ہیں۔ قرآن، وحدیث، اجماع، وقیاس، انہیں اصطلاحاً اَدِلّہ اربعہ کہتے ہیں، اور ان چار ماخذوں نے ایسی مُسلمہ حیثیت اختیار کی ہوئی ہے کہ کوئی عالم ان سے انحراف کرنے کا خیال بھی نہیں کرسکتا۔ قانون کا ماخذ ہونے کے لحاظ سے بھی ان کی یہی ترتیب واہمیت ہے، جس ترتیب سے یہ تحریر کیئے گئے ہیں۔

قیاس سے یہ مراد ہے کہ جس معاملہ ومسئلہ کا کوئی حکم قرآن وحدیث میں نہیں ہوتا ، اس معاملہ میں اپنی عقل سے کام لے کر قرآن وحدیث کے احکامات کو پیش نظر رکھ کر ، نئے مسئلہ کے متعلق استنباط کر لیتے ہیں۔ مثلاً جب قرآن کریم نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے، تو فقہا نے بھنگ اور ہر نشہ آور چیز کو ممنوع قرار دے دیا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قیاس درحقیقت قانون سازی کا ایک عمل ہے۔ خود قانون کا ماخذ نہیں ہے۔ لیکن جب دورِ بنی عباس میں ہمارے فقہ کی تدوین ہوئی، تو ہم نے اس کو ایک PROCESS کے بجائے ، قانون کے ماخذ کا درجہ دے دیا۔

یہی صورت اجماع کی ہے کہ اس پر اس قدر طول طویل بحثیں ہوئی ہیں۔ اور اس کی اس قدر متضاد و مختلف تعریفیں DEFINITIONS ہیں، کہ آج تک تیرہ سو سال بعد بھی ان پر کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔ اس کا منعقد ہونا ایک امر محال ہے، اور آج تک کسی مسئلہ میں بھی مسلمانوں میں کبھی اجماع نہیں ہوا۔ یہ قانون کا ماخذ نہیں بن سکتا۔ یہ بھی قانون سازی کا ایک PROCESS ہے کہ ہر دور میں، امت کے مشورے سے فیصلوں تک پہنچنا ، اور اُنہیں نافذ کرنا، ہر دور کا اجماع کہلائے گا۔

حدیث شریف کے بحیثیت ماخذ قانون ہونے کے بارے میں جس قدر کم گفتگو کی جائے ، اس قدر بہتر ہوگا۔ اس کا درجہ ومقام مذہب میں ہوتا ہے، دین میں اس کا صحیح مقام یہ ہے کہ اسلامی نظام کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے اس میں اطاعت رسول کے لئے الگ حدیث کی اطاعت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی ، اسلامی حکومت کی اطاعت سے ہی حدیث کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں جو سُنتیں مشہور ہیں کہ ڈاڑھی رکھنا سنت ہے، ایک خاص وضع کا لباس پہننا سنت ہے۔ مسواک کرنا، سرمہ لگانا ، اونچے پاجامے اور نیچے کرتے پہننا، یہ سنت کا اتباع ہے، سنت کا یہ اتباع مذہب میں ہوتا ہے، دین میں سنت کا اتباع اسلامی حکومت کے مقرر کردہ معاشرتی احکام کا اتباع ہی سنت کا اتباع ہوتا ہے۔ یہ جو معاشرتی احکام مقامی حالات، موسم، وغیرہ کی وجہ سے تبدیل ہو سکتے ہیں۔ قرآن کریم کے نزدیک تو اسلامی قانون کا ماخذ صرف اور صرف قرآن ہے۔

قرآن کریم کی رُو سے یہ نظریہ اس درجہ واضح ہے کہ اس میں دو رائے ہونے کا امکان ہی باقی نہیں۔ ارشاد ہوتا ہے

(1) وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (5/47) جو کوئی بھی ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ فاسق ہے۔

(2) وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (5/45) جو ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہ کرے وہ ظالم ہے۔

(3) وَ مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5/44) جو لوگ ما انزل اللہ کے مطابق حکومت نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ ان تین آیات کریمات سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ:

(1) جس حکومت میں ما انزل اللہ کے مطابق فیصلے نہیں ہوتے، اس میں کسی کام کو بھی نیک عملی نہیں کہا جاسکتا۔ خواہ وہ کام انفرادی طور پر کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ حکومت ہی فاسقین کی ہے۔

(2) ایسی حکومت کا کوئی فیصلہ عدل پر مبنی نہیں ہوسکتا کیونکہ اس حکومت کی اساس ہی ظلم پر قائم ہے۔

(3) ایسی حکومت اسلامی نہیں کہلا سکتی، کیونکہ وہ کافرانہ نظام ہے۔

قرآن کریم نے یہ بھی خود ہی واضح فرمادیا ہے کہ ما انزل اللہ صرف قرآن ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ (13/36) اور (اے رسول) جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی وہ تو اس سے جو تجھ پر نازل ہوا ہے خوش ہوتے ہیں۔ اس آیہ کریمہ نے بات بالکل واضح فرمادی ہے جب کہ **انزل الیک** کی وضاحت کتاب سے کردی ہے۔ اس آیہ کریمہ میں انزل الیک اور کتاب ایک دوسرے کا بدل اور مُبدل منه واقع ہوئے ہیں۔ یعنی جو کتاب ہے وہ انزل الیک ہے اور جو کچھ بھی انزل الیک ہے وہ صرف اور صرف کتاب ہے اور ما انزل الیک میں کوئی اور چیز مثل حدیث وغیرہ کے ہرگز ہرگز شامل نہیں ہے۔

(1) وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَ مُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ (5/48) اور ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو گذشتہ کتابوں کی مصدق ہے اور سب پر شامل ہے پس تو ان میں حکم کر اس کے ساتھ جو کچھ اتارا اللہ نے اس آیت نے خود ما انزل اللہ کی وضاحت کتاب سے کر دی کہ ما انزل اللہ صرف کتاب ہے جس کے مطابق حکم کرنا لازمی ہے اور اس کے علاوہ نہ تو ما انزل اللہ میں کوئی چیز شامل ہے اور نہ ہی اس کے مطابق احکام دیئے جاسکتے ہیں

(2) اٰمَنَ الرَّسُوۡلُ بِمَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡهِ مِنۡ رَّبِّهٖ وَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ (2/285) (رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب نے اس کی طرف نازل کی اور مومنین بھی اسی پر ایمان لائے)

(3) وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ (42/10) اور تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف رکھتے ہو، اس کا فیصلہ اللہ کے ہی حوالے ہے۔

(4) اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونه اولیآء (7/3) جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اور اس کے علاوہ کسی کارساز کا اتباع نہ کرو۔

اسی کتاب کو حضورؐ نے امت کو دیا اور امت کو اس کا وارث بنایا۔ قد ترکت فیکم ما تضلوا بعده لن اعتصتم به ۔کتاب الله میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑ رہا ہوں کہ اگر تم نے اس کو تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے اور وہ ہے کتاب اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے بھی امت مسلمہ کو صرف اسی کتاب کا وارث بنایا۔ ثُمَّ اَوۡرَثۡنَا الۡكِتٰبَ الَّذِيۡنَ اصۡطَفَيۡنَا مِنۡ عِبَادِنَا (35/32)

پھر ہم نے اس کتاب کا وارث انہیں بنایا جنہیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چُنا۔ ان مندرجہ بالا آیات کریمات سے روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت میں قانون کا ماخذ صرف ما انزل اللہ یعنی قرآن کریم ہے۔ قرآن کے علاوہ حدیث، اجماع قیاس قانون کے ماخذ نہیں ہو سکتے۔

اصل یہ ہے کہ یہ بحث کہ اسلامی قانون کے ماخذ کیا ہیں، مذہب میں پیدا ہوتی ہے۔ دین میں تو نہ اس قسم کا کوئی سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے اور نہ ہی اس پر بحث ومباحثہ کی گنجائش ہوتی ہے۔ بات بہت واضح ہے کہ ایک مرکزی اتھارٹی قرآن کریم کے احکام نافذ کرتی ہے۔ اس اتھارٹی کے سامنے صرف قرآن ہوتا ہے۔ یہ اتھارٹی امت کے باہمی مشورہ سے، حالات کے مطابق، قوانین بناتی ہے اور انہیں جاری کرتی ہے۔ اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان دو مطاعوں کی اطاعت ایک اطاعت ہوتی ہے۔ اس نظام کی معرفت اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوتے ہیں جو اس نے مومنین سے قرآن کریم میں کئے ہیں۔ انسانوں کی عزت وعظمت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نظام کے چلانے والوں کے کاموں کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور ان کے کاموں کو اپنا کام بتاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (8/17) اور (مسلمانوں) ان کفار کو تم نے قتل نہیں کیا بلکہ ان کو خود اللہ نے قتل کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (9/111)، اللہ نے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس بات پر خرید لئے ہیں کہ (ان کی قیمت) ان کے لئے جنت ہے، اس طرح اسلامی حکومت جو مومنین کی جانیں اور مال خریدتی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ نیز ارشاد عالی ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ (48/10) بے شک جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ لوگ اللہ سے ہی بیعت کرتے ہیں۔ ان آیات میں مومنین کے کاموں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کام بتائے ہیں اور ان کاموں کو اپنی طرف نسبت دی ہے۔

چونکہ اس حکومت کے قوانین اللہ تعالیٰ کی صفات پر منحصر و مُنَوّط (وابستہ) ہوتے ہیں، اس لئے مومنین ان کی پیروی کرنے سے اپنے میں صفات الٰہی کی نمود و پرورش کرتے چلے جاتے ہیں، اور اس طرح ان کا تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے اللہ تعالیٰ کی صفات کی نمود سے ان میں دیانتداری، عدل وانصاف، رحم وحسن سلوک، بلند اخلاقی، پختہ سیرتی

جیسی صفات پیدا ہو کر ان کا تزکیہ نفس ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تصوف میں جس چیز کو تزکیہ نفس کہا جاتا ہے۔ وہ اصل میں نفس کو مارنا ہوتا ہے تزکیہ نہیں ہوتا، تزکیہ تو اسلامی حکومت میں ہوتا کہ اس میں انسانی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو ونما ہو جاتی ہے، اُنہیں تکمیل تک پہنچایا جاتا ہے۔ غیر اسلامی معاشروں میں قوانین میں ردو بدل کرنے، اور خارج سے پابندیاں عائد کرنے سے جرائم کا انسداد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن اسلامی حکومت میں انسان پر خارج سے پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں، بلکہ اس میں انسان خود اپنے آپ پر اندر سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس حکومت کی اطاعت نہیں کی تو وہ عنداللہ ماخوذ و معتوب ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ سیکولر نظریہ حیات کی رُو سے انسانی زندگی کا تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس میں نفع و نقصان کا مدار طبعی امور پر ہوتا ہے۔ جبکہ قرآنی حکومت میں نفع و نقصان کا مدار اس کے نفس پر اچھے یا بُرے اثرات کے مرتب ہونے سے ہوتا ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے سامنے دین کا تصور ہی نہیں ہے۔ ہمارے مسلمانوں کی مذہبی حکومتیں بھی سب سیکولر ہیں ان میں قرآنی حکومت کا تصور ہی نہیں ہے۔ قرآنی حکومت کی چند خصوصیات تحریر کی جا چکی ہیں، وہ حکومت اللہ تعالیٰ کے وعدے اور قرآن کریم کے دعاوی کو پورا کرتی ہے قرآن کریم نے دعویٰ کیا وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (11/6) اور زمین پر چلنے والوں میں کوئی ایسا نہیں جس کی روزی اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ اسلامی حکومت ہی یہ وعدہ پورا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ اس حکومت میں حکومت کی اطاعت کرنے کی وجہ سے تزکیہ نفس ہوتا ہے جس کا مختصر سا حوالہ تحریر کیا جا چکا ہے۔ اس میں پابندیاں اندر سے پیدا ہوتی ہیں۔ قرآنی حکومت محض اقتصادی مشکلات حل نہیں کرتی بلکہ وہ اس سے بہت بلند مقام تک لے جاتی ہے۔ روٹی کا مسئلہ تو انسانی و حیوانی زندگی کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ قرآنی نظام ان مسائل کا بھی حل پیش کرتا ہے۔ جن کا تعلق خالص انسانیت سے ہے۔ یہی ایک بنیادی فرق ہے سیکولر حکومت اور قرآنی حکومت میں ،سیکولر حکومت تو انسانی سطح پر پہنچتی ہی نہیں وہ تو صرف حیوانی سطح پر جا کر رُک جاتی ہے غیر

مسلموں کے علاوہ ہم مسلمانوں کے ذہن میں بھی انسانی سطح کی حکومت کا خیال اس لئے نہیں آتا کہ ہم خود مذہب کے مارے ہوئے ہیں اور مذہب گزیدہ ہیں ہم تو خود ہی انسانی سطح پر زندگی بسر نہیں کر رہے ہیں۔ جب ہماری اپنی سطح حیوانی سطح ہے، تو پھر ہم انسانی سطح کی حکومت، یعنی دین کا تصور کیسے لاسکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم ان طفلانہ بحثوں اور لا یعنی نظریات میں، کہ حدیث قانون کا ماخذ ہے یا نہیں، اُنہیں میں اُلجھے رہتے ہیں۔

خارج سے پابندیاں عائد کرنے کی بجائے اندر سے پابندیاں از خود عائد کرنے کی مثالیں خود قرآن کریم نے بھی پیش فرمائی ہیں۔ اس بارے میں حضرت یوسفؑ کی مثال چمکتے ہوئے ستارے، اور ایک مینارہ نور کی مانند ہے۔ ہمارے علماء کرام کا اصرار ہے کہ عورتوں کو پردے میں رکھا جائے کیونکہ عورتوں کے بے پردہ باہر چلنے پھرنے سے علماء کرام کے جذبات برانگیختہ ہوتے ہیں، اور چال چلن خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا اصرار ہے کہ عورتوں کو گھروں کی چار دیواری کے اندر، لحافوں میں لپیٹ کر ہی رکھنا ضروری ہے۔ لیکن آپ غور فرمائیں کہ حضرت یوسفؑ کے معاملہ میں، دولت وحشمت، غلبہ واقتدار کی مالکہ عورت گھر کے اندر ہے۔ گھر میں حضرت یوسفؑ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ وہ عورت اُنہیں ہر طرح کی ترغیب وترہیب دیتی ہے اور اُنہیں حد درجہ مجبور کر دیتی ہے۔ قرآن کریم نے هيت لك (12/23) کے الفاظ استعمال کئے ہیں، بظاہر جن کا ترجمہ "لو، آؤ" ہوسکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا صحیح ترجمہ اردو میں ہو ہی نہیں سکتا کہ اس میں کس درجہ رغبت دلائی جاتی ہے اور اس میں کس درجہ (PERS USI ON) ہے۔ لیکن حضرت یوسفؑ ۔

عجب درمانده ام درکار اینان مرا زندان بہ از دیدار اینان

کہہ کر اور اپنا کرتہ چھڑا کر بھاگ جاتے ہیں۔ اس کے بعد، اس وقت کی خوبصورت ترین عورتوں کا ایک ہجوم ان کو گھیر لیتا ہے۔ ان کو دھمکی ملتی ہے کہ اگر وہ بدچلنی پر آمادہ نہیں ہوتے تو اُنہیں قید کر دیا جائے گا۔ لیکن ان کا ایمان ہے کہ ۔

حُسن کی ایک ایک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی گذرنے جانے میں ہے

وہ اپنے سامنے دو (ALTERNATIVES) دیکھتے ہیں۔ یا تو بد چلنی پر آمادہ ہو جائیں، یا پھر جیل خانہ کی لمبی قید اُن کا مقدر ہوگی۔ وہ نہایت بہادری اور ایمانی حرارت سے کہتے ہیں کہ **قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ** (12/33)، اے میرے پروردگار جس بات کی یہ عورتیں خواہش رکھتی ہیں۔ اس کی نسبت قید خانہ مجھے زیادہ پسند ہے۔ یہاں جرائم کے انسداد کے لئے جو لفظ غور کرنے کے قابل ہے وہ **احب الی** کا لفظ ہے۔ یہ لفظ ہی جرائم کا انسداد کرنے کی کلید ہے انہوں نے فرمایا کہ اس عورت کے ساتھ بد چلنی کرنے کے مقابلہ میں قید کی زندگی زیادہ نفع بخش ہے۔ انسداد جرائم کا سارا فلسفہ اس بات پر مُوقوف ہوتا ہے کہ آپ کس چیز کو زیادہ منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ اور اس پر آپ کا پورا پورا ایمان بھی ہو۔ یہ ایمان ہی اندر سے عائد کردہ پابندی بن جاتی ہے اس کا باہر کی (IMPOSED) کردہ پابندی سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔

دوسری مثال ساحرین (علماء) دربار فرعون کی ہے۔ جب حضرت موسیٰؑ کی طرف سے پیش کردہ صداقت پر وہ ایمان لے آئے تو فرعون نے ان کو دھمکی دی کہ تم میری اجازت حاصل کئے بغیر موسیٰؑ کی تعلیم پر ایمان لے آئے ہو، اب میں تمہارے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تمہیں صلیب پر لٹکا دوں گا۔ یہاں بھی ساحرین نے دونوں (ALTERNATIVES) پر غور کیا اور نہایت دلیری و دل جمعی سے جواب دیا کہ ہم تمہاری بات پر غور و فکر کرنے کے بعد یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ **واللہ خیر وابقی** (20/73) تمہاری طرف داری کی نسبت اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اچھی اور ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی اور تابندہ نتائج کی حامل ہے ۔ یہاں غور فرمائیں کہ فرعون کی اتنی بڑی دھمکی انہیں ڈرا نہیں سکی اور اب وہ سابقہ علماء اور بقول مُفسرین کے جادوگر راسخ الایمان مومنین تھے۔ انہوں نے اتنی بڑی دھمکی کے جواب میں کہا کہ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر گزرو، اب ہم ان روشن دلائل کے بعد اپنے خالق پر جس نے ہمیں پیدا کیا ہے، تمہیں ترجیح نہیں دے سکتے۔ تم اگر کچھ بھی کر سکتے ہو تو اسی دنیا کا کر سکتے ہو، اور ہمیں اس دنیا کی کوئی پروا نہیں ہے۔

یہاں یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ یہ ایمان کا اثر ہے کہ یہ وہی جادوگر تھے

ہے جن کا حال قرآن نے دوسری جگہ یہ بیان کیا تھا کہ جب وہ حضرت موسیٰؑ کے مقابلے کے لئے بلائے گئے تھے تو انہوں نے فرعون سے اپنی کامیابی کی صورت میں انعام کی درخواست کی تھی، جس پر فرعون نے انہیں یقین دلایا تھا کہ کامیابی کی صورت میں وہ اس کے مقرب بنا دیئے جائیں گے اور اب ایمان لانے کے بعد اس دنیا کی کسی چیز کی اہمیت ان کے سامنے نہیں رہی اس طرح کے نفسیاتی تغیر METAMORPHOSIS، سے اسلامی حکومت میں جرائم کا انسداد از خود ہوتا چلا جاتا ہے۔

تیسری مثال آل فرعون کے مرد مومن کی ہے جس کا تذکرہ قرآن کریم نے سورہ مومن میں فرمایا ہے کہ یہ مرد مومن اگرچہ فرعون کے شاہی خاندان اور اس کے عزیزوں میں سے تھے، لیکن شروع سے ہی ان کی ہمدردیاں حضرت موسیٰؑ کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی حضرت موسیٰؑ کو آگاہ کیا تھا کہ حکومت انہیں قتل کرنا چاہتی ہے اور انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر کہیں باہر چلے جائیں۔ جب تک انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایمان کو پوشیدہ رکھ کر حضرت موسیٰؑ کے مشن کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں، انہوں نے اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھا۔ آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ فرعون کے اندرونی حلقوں کے رکن تھے۔ لیکن جب ان کو محسوس ہوا کہ ان کے خاموش رہنے سے دین کو خطرہ ہوگا، تو انہوں نے مصلحت کا پردہ چاک کر دیا، اور نہایت دلیری اور بہادری سے فرعون کے بھرے دربار میں حضرت موسیٰؑ کی حمایت بھی کی اور اپنے ایمان کا اعلان بھی کیا۔ اس مرد مومن کی تقریر اس درجہ جامع و پُر اثر تھی کہ قرآن کریم نے اس کو اپنے دامن میں جگہ دے کر اس کو محفوظ کر لیا۔

اللہ تعالیٰ نے ہم مسلمانوں سے بھی یہی فرمایا کہ سیکولر نظام حیات کے حامی لوگوں نے حرام طریقوں سے بھی جو کچھ دولت جمع کر رکھی ہے تم اس سے دھوکا نہ کھا جانا۔ خوب یاد رکھو۔ زق ربك خیـر والبقی (20/13)، اللہ تعالیٰ کے نظام میں حاصل کردہ رزق اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور تابندہ اور ہمیشہ رہنے والا ہے یہاں بھی سیکولر نظام حیات اور قرآنی نظام حیات کا فرق بیان فرمایا ہے۔ اور اس طرح رزق حرام کھانے کا دروازہ مسدود کر دیا، اور اس طرح مالی و معاشی معاملات سے متعلق جرائم کا انسداد ہوتا ہے

اسلامی قانون کی تدوین کے بارے میں مضمون کے آخر میں ایک نہایت اہم بات تحریر کی جاتی ہے جو قرآنی حلقوں میں زیادہ غور طلب اور قابل پذیرائی ہوگی۔

اسلامی قانون کا اجراء صرف اسلامی حکومت میں ہو سکتا ہے غیر اسلامی حکومت میں اسلامی قانون کا اجراء نہیں ہو سکتا خواہ وہ قانون قرآنی ہی کیوں نہ ہو۔ قرآن کریم کی رو سے شراب پینا حرام ہے۔ اگر ہندوستان کی حکومت قرآنی حکیم کے مطابق شراب خوری کو قانوناً منع کر دے تو وہ قانون اسلامی نہیں ہوگا۔ ترکی کی حکومت اگر زنا کی سزا کے لئے سو کوڑے مارنے لگے تو یہ حکم اسلامی نہیں ہوگا۔ اسی طرح سعودی عرب کی حکومت خالص ملوکیت ہے، وہاں نافذ کردہ حدود، اسلامی قوانین نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں جب فقہ کی تدوین ہوئی تو اول تو وہ انفرادی کوششیں تھیں دوسرے یہ کہ بنو عباس کی حکومت اسلامی حکومت نہیں تھی۔ اسلامی حکومت کی خصوصیات مضمون ہذا میں تحریر کی جا چکی ہیں وہ صرف مسلم حکومت تھی۔ اس نے ہمارے وہ قوانین جو فقہ اسلامی کے نام سے مشہور ہیں، اور جن کی بناء پر ہمارے ہاں فرقہ بندی کی لعنت چلی آ رہی ہے وہ اسلامی قانون ہی نہیں ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ قوانین صرف اپنے دور اور اپنے عصر کے لوگوں کے لئے تھے، ہم ان کی اطاعت کرنے کے مُکلّف نہیں ہیں۔ یہی صورت ہماری آج کل کی حکومت کی ہے۔ ہماری پاکستانی حکومت مسلم حکومت ہے۔ اسلامی حکومت نہیں ہے۔ جو قوانین بھی اسلام کے نام پر جاری کر رہی ہے۔ یہ سرے سے اسلامی قانون ہی نہیں ہیں۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جو قوانین اسلام کے نام پر جاری ہوئے ہیں۔ وہ اسلامی قطعاً نہیں ہیں۔ حدود آرڈیننس کے بارے میں یہ بحث کرنا کہ وہ اسلامی ہے یا نہیں، یا اس کی کتنی دفعات اسلامی ہیں اور کتنی قرآن کے خلاف، بالکل بے معنی بحث ہے۔ وہ قرآن کے مطابق ہونے کے بعد بھی غیر اسلامی رہیں گے۔

اسلامی حکومت میں کونسل آف اسلامک آئیڈیالوجی، cii نہیں ہوا کرتی۔ اس طرح کے قانونی مشورے دینے والے ادارے سیکولر حکومت میں ہوتے ہیں صدر محترم نے اس کونسل کو حکم دیا ہے کہ وہ حدود آرڈیننس میں ترمیم کرے اور مختلف الخیال، اور سارے

حلقوں کے علماء کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور ان علماء کے باہمی مشورے CONSENSUS سے اس میں ترمیم و تنسیخ کرے۔ انہوں نے جو یہ ہدایت مذکور بالا کونسل (cii) کو فرمائی ہے، اس پر عمل درآمد کرنا ہی ممکن نہیں ہے۔ ہمارے علماء کرام کے مختلف حلقے کسی بات پر بھی اتفاق نہیں کریں گے۔ کیونکہ انہوں نے حدود اللہ کے تحفظ کے لئے تحریک چلانے کا اعلان کر دیا ہے۔ بہتر یہ تھا کہ صدر صاحب اس کونسل کو یہ حکم فرماتے کہ وہ اس آرڈیننس کو قرآن کے مطابق کرے خواہ اس میں علماء کرام کا CONSENSUS ہو یا نہ ہو، کیونکہ حجت تو صرف قرآن کریم ہے، علماء کرام حجت نہیں ہیں۔ ہمارے نزدیک اسلامی قانون تو وہ بھی نہ ہوتا البتہ، اس قانون کی وجہ سے خواتین کو جو نقصان و ضرر اسلام کے نام پر ہو رہا ہے وہ ختم ہو جاتا۔ موجودہ قوانین کو قرآن و سنت کے مطابق کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ پہلے خود موجودہ حکومت کو آہستہ آہستہ اسلامی بنائیں، اس کا عمل کوئی ایک دو دن کا عمل نہیں ہے، اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا۔

جب حکومت خود اسلامی ہو گی اور قرآنی احکام نافذ کرے گی۔ اس کے نافذ کردہ احکام اسلامی ہوں گے، اور ان احکام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گی۔ اسلامی حکومت سب سے پہلے حضورؐ نے قائم فرمائی تھی۔ اس میں احکام اللہ کے ہوتے تھے۔ اور ان کو نافذ حضورؐ کرتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت اللہ و رسول دونوں کی اطاعت ہوتی تھی، حضورؐ کے بعد آپ کے جانشین، حضرت ابوبکرؓ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ اگر یہ سلسلہ قائم رہتا، تو اب تک حکومتوں کے سربراہوں کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہی ہوتی رہتی۔ اب جو حضرات قوانین کو اسلامی بنانے کی خواہش رکھتے ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ پہلے خود حکومت کو اسلامی بنائیں، اس حکومت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دیں۔ اس کے سربراہ کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت کے بمنزلہ قرار دیں۔ پھر اس حکومت کے جاری کردہ قوانین اسلامی بھی ہوں گے اور قرآن و سنت کے مطابق بھی ہوں گے

۔فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ (40/44)

جو کچھ میں تم سے کہتا ہوں، عنقریب ہی تم اسے یاد کرو گے۔

ارتداد

کرنل ریاض جعفری صاحب کا ایک خط 12 مئی 2006ء کے ''دی نیوز'' میں اور پھر وہی خط 13 مئی کے ڈیلی ٹائمز میں طبع ہوا جس سے معلوم ہوا کہ نیشنل اسمبلی میں ارتداد کا بل پیش ہونے والا ہے۔ اس بل کی حمایت میں 23 ممبرز کے دستخط ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ T.V چینلو کے پروگرام الف میں بھی ارتداد کا موضوع زیر بحث آیا۔ نیز 24 مئی کے ڈیلی ٹائمز میں ایک مضمون بعنوان:

DOES ISLAM TRUELY REQUIRE DEATH PENALTY FOR APOSTASY

شائع ہوا ہے۔ اس کے تحریر کرنے والے حاجی عبدالرحمٰن واحد صاحب ہیں جن کے متعلق تحریر ہے کہ موصوف انڈونیشا کے سابق صدر ہیں۔ یہ صاحب دنیا کی سب سے بڑی تنظیم نھضت العلماء کے 1984ء سے 1999ء تک ڈائریکٹر رہے ہیں انہوں نے بھی اپنے اس مضمون میں تحریر فرمایا ہے کہ اسلام کے علماء کرام اسلام کو اسلامی قانون کا از سر نو جائزہ لینا چاہئے۔ بہر حال کیونکہ ارتداد کا موضوع آج کل اہمیت رکھتا ہے، اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ اس بارے میں قرآن کریم کا موقف معلوم کریں۔ اصولی اور اساسی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم فکر انسانی کی پرورش کے ذرائع مہیا کرتا ہے اور کوئی اصول یا حکم ایسا نہیں دیتا کہ جس سے فکر انسانی کی نشوونما میں کوئی رکاوٹ واقع ہو۔ اسی وجہ سے قرآن کریم آزادی مذہب کا داعی ہے۔ آزادی مذہب کے مدعی ہونے کا لازمی و منطقی نتیجہ تبدیلی مذہب کی اجازت ہے۔ اس مضمون میں پہلے آزادی مذہب کی آیات پیش کی جائیں گی اور اس کے بعد تبدیلی مذہب سے متعلق آیات دی جائیں گی۔ اگر یہ دونوں موضوع قرآن کریم کے ذریعے واضح ہو جائیں تو ارتداد کا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جاتا ہے کہ جب قرآن کریم نے آزادی مذہب اور تبدیلی مذہب کی اجازت دے دی، تو پھر قرآن کی رو سے

ارتداد کوئی جرم ہی نہیں رہتا، پھر اس کی سزا کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب پہلے آزادی مذہب کی آیات ملاحظہ فرمائیں۔

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اجازت عنایت کی گئی ہے کہ اگر وہ چاہے تو ہدایت خداوندی کا اتباع کرے اور اگر چاہے تو اس سے انحراف کی راہ اختیار کرے، وہ اس معاملہ میں بالکل آزاد ہے ارشاد ہوتا ہے۔ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2/38)، تو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ حزن ہوگا۔ اور اس کے برعکس ارشاد ہوا کہ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (2/39) اور جو لوگ میری ہدایت کا انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے تو یہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ یہ دونوں مسلسل آیات ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے دونوں راہوں کو ایک دوسرے سے ممیز کر دیا تاکہ ہر شخص اپنی مرضی سے جو راہ چاہے اختیار کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے۔ نیز فرمایا۔

(2) اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا (76/3) ہم نے ہر انسان کو راستہ دکھا دیا ہے اس کے بعد وہ جی چاہے تو شکر گذار بندہ بن جائے اور چاہے تو نافرمان بن جائے۔ انسان کو پورا پورا اختیار عطا فرما دیا گیا ہے۔

(3) وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ (18/29) کہہ دو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے آچکا ہے تو اب جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے وہ کفر کی راہ اختیار کرے۔

(4) اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا (39/41) ہم نے تمہارے پاس کتاب سچائی کے ساتھ لوگوں کی ہدایت کے واسطے نازل کی تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے ہی بھلے کے لئے اور جو گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ یہاں آزادی فکر کا ذکر کرنے سے

پہلے نزول کتاب کا ذکر عمداً کیا گیا ہے۔تا کہ یہ واضح کردیا جائے کہ اس درجہ اہم کتاب کے نزول کے باوجود ہر شخص کو اختیار ہے کہ جو مذہب چاہے اختیار کرے اس سے زیادہ آزادی مذہب پر اور کیا بیان کیا جاسکتا ہے۔

(5) لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (2/256) دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ کیونکہ ہدایت گمراہی سے واضح ہوچکی ہے۔اس لئے ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی فکر وصوابدید کے مطابق جو مذہب پسند ہو وہ اختیار کرے۔(6) وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (10/99) اگر تیرا رب چاہتا تو روئے زمین پر جتنے آدمی ہیں وہ سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرنا چاہتے ہیں کہ وہ سب کے سب ایمان لے آئیں۔

(7) قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَ مَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَ مَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (6/104) تمہارے پاس تو سمجھانے والی چیزیں آچکی ہیں، پھر جو دیکھے (سمجھے) تو اس کے اپنے لئے ہے، اور جو اندھا بنے تو اس کا نقصان بھی خود اسی پر ہے اور اے رسول، ان سے کہہ دو کہ میں تم لوگوں کا نگہبان تو ہوں نہیں۔

ان آیات سے آپ نے بخوبی اندازہ فرمالیا ہوگا کہ قرآن کریم مذہب اختیار کرنے کی پوری پوری آزادی دیتا ہے اور انسان پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں کرتا۔
اب تبدیلی مذہب کی اجازت سے متعلق آیات پیش خدمت عالی کی جاتی ہیں

(1) كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَ شَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّ جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ○ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ (3/88-85)

بھلا خدا ایسے لوگوں کی کیوں کر ہدایت کرے گا جو ایمان لانے کے بعد پھر کافر ہوگئے، حالانکہ وہ اقرار کرچکے تھے کہ پیغمبر برحق ہے اور ان کے پاس واضح اور روشن دلائل

بھی آچکے تھے اور خدا ایسے ہٹ دھرمی کرنے والے لوگوں کو ہدایت نہیں کرتا۔ ایسے لوگوں کی سزا یہ ہے کہ ان پر خدا اور فرشتوں اور سب لوگوں کی پھٹکار ہے ہو اور وہ ہمیشہ اسی پھٹکار میں رہیں گے۔ نہ تو ان کے عذاب میں ہی تخفیف کی جائے گی اور نہ ہی ان کو مہلت دی جائے گی۔ مگر ہاں جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ کرلی اور اپنی خرابی کی اصلاح کرلی تو بے شک خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

اس آیہ کریمہ میں مرتدین اور ان کی سزا کا نہایت واضح بیان ہو رہا ہے اس آیہ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خود ان کی سزا اللہ و ملائکہ اور سب انسانوں کی ہمیشہ ہمیشہ کی لعنت مقرر فرمادی ہے۔ وہ ہمیشہ عذاب الٰہی میں رہیں گے۔ نیز انہیں توبہ و اصلاح کا بھی موقع دیا گیا ہے کہ ان میں سے جو توبہ کرلیں اور اصلاح کرلیں تو اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ اگر مرتد کی سزا قتل ہوتی تو یہاں اس کا بیان لعنت کے ساتھ ساتھ ضرور کیا جاتا۔ مزید یہ کہ ان کو توبہ کا موقع بھی نہ ملتا توبہ و اصلاح کا موقع تو جب ہی ہوسکتا ہے کہ وہ زندہ رہیں اور قتل نہ کیے جائیں یہ آیت واضح طور قتل مرتد کے خلاف راہنمائی کرتی ہے، اور قتل مرتد کی مخالفت کرتی ہے۔

(2) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (3/90) (ترجمہ) جو لوگ اپنے ایمان کے بعد کافر ہوگئے، پھر اپنا کفر بڑھاتے چلے گئے تو ان کی توبہ ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ اور یہی لوگ گمراہ ہیں۔

اس آیت میں بھی ان کے قتل کی بجائے یہی فرمایا کہ ان کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ نیز آیت کا یہ حصہ کہ ثم ازاد د کفراً پھر وہ کفر میں بڑھتے چلے گئے خصوصی طور پر قابل غور ہے۔ یعنی وہ مرتد ہونے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں کہ وہ کفر میں بڑھتے ہی چلے جائیں۔ اگر وہ ارتداد کے بعد قتل کر دیئے جاتے، تو کفر میں اضافہ کرتے چلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(3) إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا ثُمَّ ازْدَادُوا

كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا (4/137) جو لوگ ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر ہو گئے، پھر ایمان لائے اس کے بعد پھر کافر ہو گئے اور پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے تو نہ خدا ان کی مغفرت کرے گا اور نہ انہیں راہ راست کی ہدایت ہی کرے گا۔

یہاں صرف ایک بار مرتد ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ دو بار مرتد ہونے کا تذکرہ ہے۔ اگر ارتداد کی سزا قتل ہوتی تو کوئی دو بار مرتد کیسے ہو سکتا ہے۔ یہاں بھی ان کے متعلق یہ حکم نہیں دیا گیا کہ انہیں قتل کر دو بلکہ یہ فرمایا کہ ان کی بخشش نہیں ہو سکے گی۔

(4) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ (5/54) اے ایمان والوں تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا تو عنقریب ہی خدا ایسے لوگوں کو ظاہر کر دے گا جنہیں خدا دوست رکھتا ہو گا اور وہ اس کو دوست رکھتے ہوں گے۔ ایمان والوں کے ساتھ منکسر اور کافروں کے ساتھ سخت۔ اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی کچھ پروا نہ کریں گے۔

اس آیت میں خود مرتد کا لفظ استعمال کر کے اس معاملہ کو بالکل ہی واضح فرما دیا کہ اگر کوئی شخص اسلام چھوڑتا ہے تو بے شک چھوڑ دے وہ اسلام کا کچھ نقصان نہیں کر سکتا۔ مومنین کو حوصلہ اور تقویت دی جا رہی ہے کہ کسی کے مرتد ہونے پر پریشان نہ ہوں، اگر کچھ لوگ اسلام چھوڑ بھی دیں تو ان کی جگہ ایسے لوگ مسلمان ہو جائیں گے، جو مومنانہ فضائل کے حامل ہوں گے۔ یہاں بھی قتل کا کوئی تذکرہ دور دور تک نہیں ہے۔

(5) مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَ قَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَ لٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (16/106) اس شخص کے سوا جو (کفر پر) مجبور کیا جاوے اور اس کا دل ایمان کی طرف سے مطمئن ہو۔ جو شخص بھی ایمان لانے کے بعد کفر اختیار کرے گا بلکہ خوب

سینہ کشادہ (جی کھول کر) کفر کرے تو ان پر خدا کا غضب ہے اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

اس آیہ کریمہ میں بھی ارتداد کی سزا خود غضب الٰہی کا نزول اور آخرت کا عذاب مقرر فرمادی گئی ہے، لیکن قتل کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات سے آپ نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا کہ قرآن کریم اس معاملہ میں کس درجہ واضح موقف رکھتا ہے۔ اصل بات تو یہی ہے کہ قرآن کریم کے نزدیک ارتداد کوئی جرم ہی نہیں ہے۔ اسی لئے جو حضرات علماء کرام ارتداد کی سزا قتل بتاتے ہیں وہ بھی اپنے نظریہ کی تائید میں قرآن کریم سے ایک آیت بھی پیش نہیں کرسکتے۔ ان کا سارا دارومدار صرف دو روایات پر ہے۔

ارتداد کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے ایک اہم بات ضرور پیش نظر رکھنی چاہیئے ہم آج اس مسئلہ کو مذہب کی نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہمارے علماء کرام جو ارتداد کی سزا قتل مقرر کررہے ہیں وہ بھی اس مسئلہ کو مذہب کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ صدر اول میں یہ معاملہ دین کے نقطہ نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وقت جو مرتد ہوتا تھا وہ حکومت کے خلاف بغاوت ہی کرتا تھا۔ اوقت ارتداد اور بغاوت لازم وملزوم تھے۔ اُس وقت ارتداد کے معنی صرف مذہبی عقائد کی تبدیلی نہیں ہوتی تھی بلکہ ارتداد کے معنی اسلامی حکومت کو تبدیل کرنے کے ہوتے تھے۔ اور مرتد حکومت کا باغی ہوتا تھا اس لئے اس کی سزا قتل تھی۔ اسی وجہ سے ہماری فقہ میں ہے کہ اگر عورت، یا نابینا یا معذور ضعیف مرتد ہوجائے تو اس کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ ارتداد میں قتل کی اصل وجہ ارتداد نہیں بلکہ بغاوت تھی۔ اب حالات بالکل مختلف ہیں۔ اب دین کا تصور تو دور دور تک نہیں ہے۔ لیکن ارتداد کی جو سزا دین میں تھی یعنی حکومت سے بغاوت کی سزا، ہمارے علماء کرام اس پر اصرار کرتے چلے آرہے ہیں۔

عیسائیت میں بھی اس قسم کے حالات پیش آتے تھے۔ انگلستان میں TUDOR اور STUARTS کے زمانہ میں کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کی شدید مخالفت تھی۔ وہاں اکثریت پروٹسٹنٹ کی تھی۔ وہاں جو شخص کیتھولک ہوتا تھا تو اس کے معنی صرف یہ نہیں تھے

کہ اس نے اپنا مذہب بدل لیا، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کی ہمدردی اپنی حکومت سے بدل کر فرانس اور سپین سے ہو جاتی تھی، جو اس وقت اس مذہب کے مرکز تھے۔ اسی وجہ سے اس زمانہ میں تبدیلی مذہب کی سزا زیادہ سخت تھی۔ اب ایسی صورت نہیں ہے۔ مذہب تبدیل کرنے سے حکومت کو کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح ہمارے ہاں صدر اول میں ہوتا تھا۔ روایات میں جو مرتد کی سزا کا ذکر آتا ہے اس کی اصل وجہ ارتداد نہیں بلکہ حرابہ ہوتی تھی۔ بہرحال قرآن کریم کی رُو سے ارتداد کوئی جرم نہیں ہے۔

آزادی مذہب و تبدیلی مذہب کے بارے میں آپ نے بالترتیب 7 عدد، 5 عدد، آیات ملاحظہ فرمائیں جس سے قرآن کریم کے موقف کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے اور مزید کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ لیکن اس سلسلہ میں ایک آیت ایسی حُجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے کہ اس کا نقل کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ آیہ کریمہ انسانی جان کی قدرو قیمت اور حفاظت وصیانت کو بطور ایک اصول کے پیش کرتی ہے اور اس میں قتل کی سزا کا اس طرح ذکر کر دیا ہے کہ یہ رجم کے عقیدہ کی بھی تردید کر دیتی ہے۔ یہ امر واقعہ صرف ایک اتفاق پر ہی محمول کیا جا سکتا ہے، کہ ہمارے عالی مرتبت علماء اہل قرآن کی توجہ اس آیہ کریمہ کی طرف منعطف نہیں ہوتی، یا کم از کم راقم سطور کی کوتاہ نگاہی کے باعث وہ راقم سطور کے زیر مطالعہ نہیں آئی۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا** (5/32) تفسیر "تدبر قرآن" میں اس کا ترجمہ تحریر ہے "جس کسی نے قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا" حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے ترجمہ فرمایا "جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض ایک جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو"۔ تمام تراجم اسی طرح ہیں اور واضح ہیں کوئی ابہام نہیں ہے میں اس کا ترجمہ مزید آسان اور واضح عرض کرتا ہوں، "جو کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو، اور نہ ہی زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو۔ تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا"۔ یہ آیہ کریمہ بطور ایک واضح اصول کے نہایت روشن درخشندہ ہے۔ اس

آیہ کریمہ میں کسی ایک فرد کے قتل کرنے کو ساری انسانیت کے قتل کے مرادف بیان کیا گیا ہے اور یہ قتل کی حد درجہ مذمت کررہی ہے اس سے زیادہ پُر زور FORCEFUL انداز شاید ہی کوئی دوسرا ہو سکے۔ لیکن کسی کو بھی قتل نہ کرنے کے سلسلہ میں یہاں صرف دو استثناء (EXCEPTIONS) بیان کی گئی ہیں ایک تو قاتل کو قتل کے بدلے میں قتل کرنے کی اجازت ہے (6/153) اور دوسرے باغی کو قتل کرنے کی اجازت ہے (5/133) اس آیت کی یہ دونوں رخصتیں آیات (6/153، 5/33) میں بھی ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی حال میں بھی، کسی جرم کے بدلے، کسی فرد کو قتل نہیں کیا جاسکتا۔ اس آیت نے ایک ایسا حصر قائم کردیا ہے کہ جس کو کسی حال میں توڑا نہیں جاسکتا۔ اس آیہ کریمہ کے پیش نظر ان دو افراد (قاتل و باغی) کے علاوہ کسی کو قتل کرنا جائز نہیں ہے فلہذا مرتد و زانی کا قتل کرنا قرآن کریم کے خلاف ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ اس آیہ کریمہ سے قتل مرتد اور رجم دونوں کی تردید ہوجاتی ہے۔

@@@@@@@@ @@@@@@@ @@@@@@@@ @@@@@@@ @@@@@@

قرآنی انقلاب کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہنگامی شورش برپا کرنا نہیں سکھاتا وہ اپنی اساس فکری تبدیلی پر رکھتا ہے جسے وہ علیٰ وجہ البصیرت پیدا کرتا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ان جذبات کی بھی حسن کارانہ انداز سے پرورش اور ترتیب کرتا ہے جو انقلاب کی
قوت محرکہ ہوتے ہیں۔ وہ قلب اور دماغ عقل و عشق، جنون وخرد، ذکر، فکر، خبر اور نظر، دلائل اور جذبات کے صحیح امتزاج سے داخلی اور خارجی دنیا میں ایسی تبدیلی پیدا کرتا ہے جس میں ہر قدم تعمیر کے لئے اٹھتا ہے۔ جنون وخرد جیسے متضاد عناصر میں ہم آہنگی پیدا کرکے انہیں ایک بے پناہ قوت کا امین بنادینا قرآن کی بنیادی خصوصیت ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

==========☆☆☆==========

برادر مکرم عزیز محترم جناب نسیم احمد خاں صاحب کا ایک گرامی نامہ ماہ جون کے موقر رسالہ صوت الحق میں اس کم ترین ہیچمدان کے نام طبع ہوا ہے جس میں عزیز موصوف نے حد درجہ مہربانی فرما کر یہ تحریر کیا ہے کہ انہوں نے میرے مضمون کو پسند فرمایا ہے۔ میں اس بارے میں ان کا بہت شکر گزار ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ شکایت بھی تحریر فرمائی ہے کہ اکثر حضرات جنہوں نے محترم القام پرویز صاحب سے اکتساب علم کیا ہے وہ اپنی کتابوں اور تحریرات میں پرویز صاحب سے استفادہ کرنے کا اعتراف نہیں کرتے۔ اور یہی شکایت انہوں نے مجھ سے بھی فرمائی ہے، اس کے ساتھ ہی انہوں نے پرویز صاحب کی خوبیاں بیان فرمائی ہیں اور پرویز صاحب کی ان نوازشات کا تذکرہ کیا ہے جو انہوں نے قرآنی خدمت کے بارے میں سر انجام دی ہیں۔ نسیم صاحب نے دیگر مصنفین کے متعلق جو کچھ شکایتاً تحریر فرمایا ہے۔ میں اس کے متعلق کچھ عرض نہیں کرسکتا کیونکہ انہوں نے کسی خاص شخص کو PIN-POINT بھی نہیں کیا ہے۔ جو کچھ بھی انہوں نے اس کمترین کے لئے تحریر فرمایا ہے اس کے متعلق مضمون کے آخری حصہ میں تحریر کیا جائے گا۔ اور جو چند سطور انہوں نے محترم پرویز صاحب کے متعلق تحریر فرمائی ہیں مجھے ان سے صد فیصد اتفاق ہے۔ قرآن کریم کا کون طالب علم ان سے انکار کرسکتا ہے۔ محترم نسیم صاحب کا یہ خط ہے مضمون نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے جو کچھ پرویز صاحب کے متعلق تحریر فرمایا ہے ظاہر کہ وہ خط ہونے کیوجہ سے مختصر ہی تحریر فرما سکتے تھے۔ محترم پرویز صاحب کی قرآنی خدمات ان کی کتب ان کے مضامین ان کے درس پر تبصرہ تو کوئی عالم یا دانشور تحریر کرسکتا ہے البتہ میں چونکہ بالکل اپنی اوائل عمر اور ابتدائی زندگی سے یعنی آج سے 56 سال پیشتر سے اس تحریک سے منسلک چلا آرہا ہوں اس لئے میں صرف اپنے تاثرات ہی رقم کرسکتا ہوں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ پرویز صاحب نے جو کچھ قرآنی خدمات انجام دی ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ اِس وقت ان کی کتابوں پر تبصرہ کرنے سے نہیں ہوسکتا بلکہ اس کا صحیح اندازہ تو زمانۂ مستقبل میں ہوگا جب اس تحریک کو قبول عام حاصل ہوگا۔ قرآن کریم کی جو تشریح و تعبیر اس تحریک نے کی ہے اس کے علاوہ اور کوئی تعبیر و تشریح اب چل ہی نہیں سکتی اس لئے کہ

حق تو یہ ہے عصر حاضر عصر ہے پرویز کا

بطور جملہ معترضہ تحریر کیا جاتا ہے کہ پرویز صاحب نے اس دور میں قرآن کریم کو اس طرح MONOPOLIZE کیا ہے کہ پاکستان میں اور خصوصاً لاہور میں جہاں کہیں بھی قرآن کریم کے متعلق کوئی کانفرنس یا سیمنار ہوتا ہے تو لوگ ان میں شرکت کرنے سے پیشتر ہی کہہ دیتے ہیں کہ یہ جلسہ پرویزیوں نے منعقد کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ راقم السطور کا ذاتی تجربہ ہے کہ علمائے کرام کے طبقے کو چھوڑ کر کسی بھی دانشوروں، کالم نگاروں اور INTELLECTUALS نے پرویز صاحب کو پڑھا بھی نہیں ہوتا، آپ ان سے سوال کریں کہ آپ نے پرویز صاحب کو پڑھا ہے یا نہیں؟ تو باوجود اس کے کہ انہوں نے پرویز صاحب کی کوئی کتاب نہیں پڑی ہوگی فوراً اثبات میں جواب دیں گے کہ ہم نے پرویز کو پڑھا ہے۔ بعض حضرات کو میں نے سنا کہ فوراً کہہ دیں گے کہ ہاں میں نے مولانا پرویز کو پڑھا ہے۔ اس سے فوراً اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان کا پرویز کو مولانا کہنا خود ان کی غلط بیانی کی چغلی کھا رہا ہے۔ جہاں تک علماء کرام کا تعلق ہے وہ پرویز کا لٹریچر چھپ چھپ کر پڑھتے ہیں میری ساری عمر اس محکمہ میں گزری جس میں ہر وقت بڑے بڑے جغادری مولوی صاحبان موجود رہتے تھے اور علماء کرام کی ریل پیل تھی اور محکمہ کیوجہ سے ہی تقریباً تمام دارالعلوم میں جانے کا موقع ہوا۔ بڑے بڑے دارالعلوم میں طلوع اسلام کے سال بہ سال کے مجلد پرچے میں نے خود دیکھے ہیں۔ پاکستان میں دانشوروں پر پرویز صاحب کا اس طرح قبضہ ہے کہ اس زمانے میں کسی اور کا نہیں ہے۔ اردو اخبارات اور ٹی وی چینلو کے مذاکروں میں حصہ لینے والے اکثر حضرات خود طلوع اسلام ٹرسٹ سے کتابیں خرید کر لے جاتے ہیں اور ان کی تحریر سے پرویز صاحب کے خیالات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ ان

حضرات کے نام تحریر کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا ورنہ میں ان کے نام بھی تحریر کرسکتا ہوں۔

مسلمانوں کے زوال کے اس طویل عرصے کے دوران سینکڑوں کی تعداد میں علماء کرام اور نہایت نیک نیت اور مخلص ریفارمرز پیدا ہوئے امام ابن تیمیہ، امام غزالی اور قریبی دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے صاحبزادگان، جمال الدین افغانی، مصر میں محمد عبدہ علامہ طنطاوی ترکی میں سعد ذغلول لیبیا میں سینوسی تحریک عرب شریف میں عبدالوہاب نجدی اور اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد دوسرے حضرات کی۔ سب نے نہایت نیک نیتی سے قرآن کی خدمت کی۔ اس ایک ہزار سال کے دوران جس قدر علماء، دانشور اور ریفارمرز پیدا ہوئے ان سب نے اپنے اپنے دور میں علمی اور بعض حضرات نے عملی تحریکیں برپا کیں، بہت جم کر اور حوصلے سے کام کیا۔ ان حضرات کی جس قدر عزت کریں وہ اس کے مستحق ہیں۔ لیکن افسوس کہ اس ایک ہزار سال میں ہمارے ان تمام حضرات کی نگاہ بنوعباس کے دور پر جا کر رک جاتی ہے جو دور مذہب کا ترجمان تھا، ان میں سے کسی ایک کی بھی نگاہ دین تک نہیں پہنچی۔ یہ شرف برصغیر کو حاصل ہے کہ یہاں سب سے پہلے علامہ اقبالؒ نے مذہب اور دین کے فرق کو بھانپا اور اس فرق کو اپنے اشعار کا عنوان قرار دیا۔ علامہ اقبال یقیناً قرآن کریم کے گہرے مطالعے سے ہی اس اہم اور دوررس نتیجہ پر پہنچے ہوں گے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ فرمایا اس کو انہوں نے آیات قرآنی سے موید و مستند نہیں کیا اس کو صرف اشعار میں ہی بیان کیا۔ کوئی نثری تحریر یا جامع مضمون تحریر نہیں فرمایا اس کام کو بخوبی اور بہ کمال سرانجام دینے کا شرف پرویز کو ہے کہ انہوں نے اس نکتہ کو خوب خوب بیان فرمایا۔ تحریک طلوع اسلام یا خود پرویز صاحب کی تمام کتب و تحریروں کا نقطہ ماسکہ یہی ہے کہ چونکہ مسلمان اسلام کے دین کے معیار کو گرا کر مذہب کے معیار پر لے آئے ہیں اس لئے ان کو یہ زوال ہوا ہے اور مسلمان کی ترقی و عروج کا واحد حل یہ ہے کہ وہ اسلام کو بطور دین کے اختیار کریں اس عنوان کو انہوں نے سلیم کے نام کے چوبیسویں خط "اطاعت رسول" میں اس طرح واضح کیا ہے کہ کوئی شخص اس خط کو پڑھ کر اسلام کے دین ہونے میں شک نہیں کرسکتا۔ یہ خط اکتوبر ۱۹۵۶ء کا تحریر کردہ ہے۔ جبکہ پاکستان کا ماحول

اس نظریئے پر غور کرنے کے قابل ہو چکا تھا۔ لیکن اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ قبل از پاکستان جب کہ انگریز کی حکومت تھی اور اسلام کے دین ہونے کا عقیدہ دور دور تک کہیں نہیں دکھائی دیتا تھا اس وقت ایک مضمون "کانگرس سے خطاب" کے آخیر میں تحریر فرمایا کہ "مسلمانوں کا نصب العین ہندوستان میں اللہ کی حکومت کا قیام ہے" یہ مضمون ستمبر ۱۹۳۹ء کا تحریر کردہ ہے۔ "سوشلزم اور اسلام" تحریر کردہ جولائی ۱۹۳۹ء میں تحریر فرمایا کہ اسلام کے نزدیک آزادی وہ ہے جو آئین الٰہی کے سخت ترین اطاعت سے حاصل ہوتی ہے "جہان نو" تحریر کردہ ۱۹۴۰ء میں تحریر فرمایا "مسلمان کا مذہب اس کی حکومت ہے اور مذہبی آزادی سے مفہوم ایک آزاد حکومت کا قیام ہے" اس قسم کے بے شمار اقتباسات ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس دور میں جب کہ ان کی عمر چالیس سال سے بھی کم تھی ان کے سامنے دین کا تصور کس طرح واضح تھا۔ یہ بات بھی خیال شریف میں رہے کہ یہ وہ دور تھا کہ اس وقت تک پاکستان کا مطالبہ پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس تاریک دور میں وہ حکومت الٰہیہ کے قیام کی صدا بلند کر رہے تھے۔ علامہ اقبال نے بے شک دین کا تصور دیا لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے انہوں نے اس کی تائید و توکید قرآن کریم سے پیش نہیں کی، کیونکہ ہمارے ہاں جو ایک ہزار سال کی تفاسیر موجود ہیں ان میں تو دین کا کوئی تصور تک نہیں ہے۔ یہ ساری تفاسیر مذہب کی رو سے تحریر کی گئیں ہیں اور یہی ساری تفاسیر مسلمانوں کے زوال کا سبب بنی ہیں۔ پرویز صاحب نے اپنی ژرف نگاہی سے قرآن کریم کی ان تمام آیات کریمات کو نمایاں کر کے پیش کیا جن کا ہدف ہی دین کا قیام ہے۔

ان تمام سابقہ تفاسیر کے علی الرغم پرویز صاحب نے مفہوم القرآن تحریر فرمایا، مسلسل درس کا سلسلہ قائم کیا اور اس نظریہ کو کہ اسلام ایک دین ہے اور قرآن کریم ایک ضابطہ حیات اس قدر دلائل اور براہین سے پیش کیا کہ پاکستان کی فضا اور اس کا ماحول اس نظریہ سے گونجنے لگا، یہاں تک کہ اب ہمارے علمائے کرام بھی اسلام کو بجائے مذہب کے دین کہنے لگے ہیں۔ ہمارے ایک ہزار سال کی تاریخ میں علامہ حافظ محمد اسلم جیراجپوری صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے "اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہے" کا

عقیدہ پیش کیا۔لیکن انہوں نے اس موضوع پر صرف ایک مضمون قبل پاکستان غالباً ۱۹۴۸ء میں تحریر فرمایا تھا۔لیکن اس عنوان کو پرویز صاحب نے یا تحریک طلوع اسلام نے اپنا مطمع نگاہ بنالیا۔اوراس عنوان پر برابر چالیس سال تک مضامین تحریر کئے جاتے رہے۔پرویز صاحب یا تحریک طلوع اسلام کا یہ منفرد نظریہ ہے۔ساری ملت اسلامیہ میں یہ نظریہ اب بھی آپ کو کہیں بھی نظر نہیں آئے گا۔جس دن مسلمانوں نے اس نظریہ کو قبول کرلیا اس دن ان کی بگڑی سنور جائے گی۔شان نزول کے نظریئے نے اور روایات کیوجہ سے ہماری تفاسیر کا بیشتر حصہ نہ صرف غیر قرآنی ہے بلکہ خلاف قرآن نظریات پر مشتمل ہے۔ملوکیت اور پیشوائیت کے اثر سے ہر خلاف قرآن نظریہ کو قرآنی آیات کے تفسیر کے ذیل میں جگہ دی گئی اور ملوکیت کیوجہ سے ہی تقدیر کے عقیدہ کو پختہ کیا گیا۔ملوکیت کیونکہ دین کی سخت مخالف ہوتی ہے اس کا وجود ہی مذہب کے سہارے قائم رہتا ہے۔اس لئے ہمارے تفاسیر میں دین کا کوئی تصور نہیں ہے۔جس قدر خلاف قرآن عقیدے ہمارے تفاسیر میں درآئے ہیں ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت نہیں ہوتی، بلکہ ان کی اطاعت سے ان مفسرین کی اطاعت ہوتی ہے۔جنہوں نے وہ عقائد ہماری تفاسیر میں داخل کئے ہیں۔یہ تمام خلاف قرآن عقائد تفسیر القرآن بالروایات کیوجہ سے ہماری تفاسیر میں داخل ہوئے ہیں۔اس کا واحد حل یہی تھا کہ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے تاکہ خارج از قرآن نظریات داخل ہی نہ ہوسکیں۔تفسیر القرآن بالقرآن سے خارج از قرآن نظریات کی جڑ کٹ جاتی ہے۔تفسیر القرآن بالقرآن کی سب سے پہلے کوشش مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی مرحوم کی تھی، وہ دور قرآن کی مخالفت کا سخت ترین دور تھا۔مولوی محمد عبداللہ صاحب کے علاوہ اور اہل قرآن علماء نے بھی اس عنوان پر محنت کی اور خواجہ احمد الدین کی تفسیر "بیان للناس" طبع ہوئی لیکن ان دونوں تفاسیر میں سب سے بڑی خامی وکمزوری یہی ہے کہ ان میں اسلامی حکومت کا نظریہ نہیں ہے جو قرآن کریم کی اصل ہے۔

پرویز صاحب کی کاوش اور کوشش اس معاملہ میں بالکل نادرومنفرد ہے۔انہوں نے اپنے مفہوم القرآن میں خالص قرآنی نظریات پیش کئے۔ان کے مفہوم القرآن میں

ایک عقیدہ بھی خارج از قرآن نظر نہیں آتا۔ کیونکہ تفسیر القرآن کا اصول ہی اس درجہ پختہ اور مضبوط ہے کہ اس نہج پر تفسیر تحریر کرنے سے خارج از قرآن نظریہ داخل ہو ہی نہیں سکتا۔ تصریف آیات سے خارج از قرآن نظریات کی تائید ہو ہی نہیں سکتی۔ اس طرح کی کوشش پچھلے ایک ہزار سال میں کہیں اور دکھائی نہیں دیتی یہ عجیب بات ہے کہ ہمارے علماء ان سابقہ تفاسیر میں نقائص و معائب کے تو قائل ہیں اور یہ بات وہ خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہماری سابقہ تفاسیر میں خارج از قرآن نظریات بڑی تعداد میں در آئے ہیں، جنہیں وہ خود اسرائیلیات کا نام دیتے ہیں اور یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ سابقہ تفاسیر نہ تو موجودہ ذہن کو مطمئن کر سکتی ہیں اور نہ ہی موجودہ ضروریات کو پورا کر سکتی ہیں۔ اور سابقہ تفاسیر ہمارے آج کے مسائل بھی حل نہیں کر سکتیں۔ ان سب اعترافات کے باوجود ہمارے علماء کرام تفسیر نویسی کے اس طریقے اور اس نہج کو نہیں چھوڑتے ایک قدم "سلف صالحین" سے آگے نہیں بڑھاتے کیونکہ اس طرح انہیں اپنے خلاف قرآن عقائد کو ترک کرنا پڑتا ہے اور اس کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ قرآن فہمی کے سلسلہ میں یہ پرویز صاحب کی اتنی بڑی خدمت ہے کہ جس کی جس قدر تعریف کریں کم ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کس درجہ محنت فرمائی ہے یہ ان کی اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے فرمایا تھا کہ میں جب کسی آیت پر غور کرتا ہوں تو رات کو غور کرتا ہوا سو جاتا ہوں اور جب صبح کو میں بیدار ہوتا ہوں تو آنکھ کھولنے سے پیشتر وہ آیت میرے ذہن میں گھوم رہی ہوتی ہے۔ اس طرح مسلسل غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچتا ہوں۔ ان کے اس غور و تدبر کی عادت کیوجہ سے راقم سطور جب ان سے کوئی بات کرتا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید ان کے سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہے۔

اس مختصر مضمون میں پرویز صاحب کی کتابوں یا قرآنی خدمات پر تبصرہ کرنا مقصود نہیں ہے۔ تبصرہ خود ایک بہت بڑا علمی کام ہے جو صرف ایک بلند پایہ سکالر ہی کر سکتا ہے۔ اور یہ ایک پوری ضخیم کتاب کا متقاضی ہے۔ یہ مختصر سا مضمون نسیم صاحب کے خط کیوجہ سے تحریر کیا گیا ہے۔ البتہ اس مضمون میں پرویز صاحب کی چند ذاتی خوبیوں کا مختصراً تذکرہ

کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی قابل تعریف بات یہ ہے کہ انہوں نے ساری عمر خود اپنی محنت سے اپنا رزق کمایا۔ بہت چھوٹی عمر میں وہ سول سروس میں داخل ہو گئے تھے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ ہوم منسٹری میں اسسٹنٹ سکٹری تھے۔ حالانکہ اپنی تحریر وتصنیف کیوجہ سے ان کا ایک ایک منٹ بڑا قیمتی تھا۔ لیکن انہوں نے اس کے باوجود اپنی ملازمت کو جاری رکھا۔ انہوں نے ساری عمر اپنے لئے یا تحریک طلوع اسلام کے لئے ایک پیسہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ وہ اس معاملہ میں اس درجہ محتاط تھے کہ بزموں یا احباب سوسائٹی کی جو رقوم ہوتی تھیں وہ ان کو ہاتھ تک لگانا گوارا نہیں سمجھتے تھے۔ تحریک میں انہوں نے اپنے لئے کوئی منصب یا رتبہ مقرر نہیں کیا، کسی قسم کی روحانیت یا مقام کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور جو مومن تمہارے پیرو ہوئے ان سے بتواضع پیش آؤ۔ (۲۶/۲۱۵) قرآن کے ہر طالب علم سے وہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ انہیں خود پر اس درجہ ضبط وتحمل تھا کہ چاروں طرف سے شدید حملوں اور مخالفت کے باوجود وہ کبھی برافروختہ نہیں ہوتے تھے۔ ۱۹۶۴ء میں جب لاہور کے در و دیوار پر ان کے خلاف کفر کے فتوؤں کے بڑے بڑے پوسٹر لگائے گئے اس وقت بھی وہ بہت COMPOSED تھے انہوں نے نہایت ضبط وتحمل کا مظاہرہ کیا اور تحریک سے منسلک افراد کو بھی سخت تاکید کی کہ وہ کسی قسم کا نہ تو مظاہرہ کریں اور نہ ہی کوئی جذباتی بات کریں۔ انہوں نے طلوع اسلام کے اگلے ہی شمارے میں کفر سازی کا مضمون شائع کر دیا۔ جس سے ان پوسٹروں کا اثر عوام پر کم ہوا اور عوام کو اندازہ ہوا کہ علماء کرام ایک ہزار سال سے کفر کے فتوے جاری کرتے چلے آرہے ہیں۔

جناب محترم نسیم احمد خان کے اس اعتراض کے متعلق کہ کمترین راقم سطور اپنی تحریروں میں پرویز صاحب کا حوالہ نہیں دیتا، یا ان سے اکتساب علم کا اعتراف نہیں کرتا۔ اس کے متعلق مضمون کے شروع میں تحریر کیا گیا تھا کہ اس بات کے متعلق مضمون کے آخیر میں کچھ تحریر کیا جائے گا تو اس کے متعلق عرض ہے کہ میرا ایک مضمون "خالص قرآن فہمی کے دو سرچشمے" موقر رسالہ صوت الحق بابت اکتوبر ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا تھا جس مضمون میں میں نے مختصر طور پر فرقہ اہل قرآن اور تحریک طلوع اسلام کی ذہنی قربتوں اور فاصلوں کو TRACE

کیا تھا وہ مضمون قارئین نے بہت پسند فرمایا تھا اور سخت تقاضہ کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط بھی شائع کی جائے۔ میرا ارادہ اس کی دوسری قسط تحریر کرنے کا ہوا لیکن میں نے اس کی دوسری قسط اس وجہ سے تحریر نہیں کی کہ اس میں میرا اپنا نام چند مقامات پر ضروری تھا اور یہ بات مجھے پسند نہیں تھی۔ اس وجہ سے میں نے نہیں لکھا لیکن اس مضمون میں جناب نسیم احمد خان صاحب کے اعتراض کے دفاع میں مجبوراً چند سطور اپنے لئے تحریر کرنی پڑ رہی ہیں، جن کے لئے میں معذرت خواں ہوں۔ میں خود کو پرویز صاحب کا کفش بردار سمجھتا ہوں، اوران کے ایک ملازم خیال کرتا ہوں۔

۱۹۴۸ء میں طلوع اسلام پڑھنا شروع کیا، اس وقت تک تحریک کی کتابیں نہیں آئی تھیں۔ صرف معراج انسانیت یا شاید دو اور کتابیں شائع ہو چکی تھیں اس وقت صرف رسالہ پر گزارہ تھا۔ میں ۱۹۵۲ء میں لاہور سے کراچی حاضر ہو کر پرویز صاحب سے فالور لائنز میپر زبیر کس پر جا کر ان سے ملاقات کی، یہ ملاقات بہت مختصر تھی اس وقت تک بزمیں نہیں بنی تھیں البتہ بننے کے پروسس میں تھیں۔ مجھے پرویز صاحب نے فرمایا کہ میں لاہور میں عبدالطیف صاحب سے ملوں وہ لاہور میں بزم بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نظامی صاحب ریڈیو اسٹیشن میں ملازم تھے میں ان سے ملا چونکہ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں زیر تعلیم تھا اس لئے زیادہ وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ البتہ میرا طریقہ یہ تھا کہ میں اہل قرآن حضرات سے رابطہ رکھتا تھا اور" دارالقرآن" میں جاتا رہتا تھا۔ یہ دارالقرآن گیتا بھون لکشمی چوک پر تھا اور اب بھی ہے۔ کبھی کبھی پرویز صاحب لاہور تشریف لاتے اوران کی تقریر ہوتی تو میں حاضر ہوتا تھا۔ ایک تقریر دیال سنگھ کالج ہال میں رات کو ہوئی مشہور بیرسٹر عبدالحق صاحب نے صدارت کی وہ تحریک سے وابستہ تھے ایک تقریر پنجاب یونیورسٹی سینٹ ہال میں ہوئی "اسلام میں قانون سازی کا اصول" کے موضوع پر۔ چوہدری نذیر احمد صاحب وزیر صحت نے صدارت فرمائی وہ بھی طلوع اسلام سے وابستہ تھے۔ ایک تقریر حبیبہ ہال اسلامیہ کالج میں ہونی قرار پائی مگر ہال والوں نے عین وقت پر اجازت کینسل کر دی اس وجہ سے وہ تقریر نہ ہو سکی جو لوگ تقریر سننے آئے تھے وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔

ایک تقریر دارالقرآن میں بھی ہوئی بروز جمعہ قبل نماز سورۃ ماعون اس تقریر کا موضوع تھا۔تقریر کے بعد نماز ہوئی اور حافظ سردار احمد مشہور عالم اور مناظر نے خطبہ جمع دیا۔اسی دوران سالانہ کنونشن بھی ہوتی رہیں یہ چوہدری عبدالرحمن صاحب جو "بہترین سوپ" کے مالک تھے ان کی کوٹھی پر ہوتی تھیں یہ کوٹھی MINT کے قریب تھی اور میرا خیال ہے کہ اس کنونشن کے "باقیات الصالحات" میں صرف شمیم انور ہیں جو طلوع اسلام کے انگلش سیکشن کی انچارج ہیں۔برادر مکرم قدیر احمد خان سابق نمائندہ بزم کوئٹہ اور یہ راقم ستور ہی رہ گئے ہیں باقی سب لوگ مر گئے قدیر بھائی اس وقت قصور POSTED تھے۔اللہ تعالیٰ انہیں تا دیر سلامت رکھے۔

اپریل ۱۹۵۸ء میں پرویز صاحب لاہور تشریف لے آئے اور اکتوبر ۱۹۵۸ء سے ان کے درس کا سلسلہ شروع ہو گیا اپنے درس کی انہوں نے تفسیر سے ابتدا نہیں کی بلکہ مختلف موضوعات پر تقریر کر کے حاضرین کے تصورات درست کئے۔اللہ کا تصور، نبوت، مقام نبوت وغیرہ قسم کے موضوعات کا انتخاب کیا تھا قرآن کریم کے طلباء کے لئے یہ درس نہایت گراں بہا سرمایہ ہیں۔پرویز صاحب کے لاہور تشریف لانے اور ان کی وفات تک کمترین کا برابر رابطہ رہا، درس کے شرکا دیکھتے تھے کہ میں درس سے چند منٹ پیشتر حاضر ہوتا تھا۔لاہور میں انارکلی بازار کے اندر اتوار کے روز تقریباً بیس پچیس کتب فروش زمین پر کتابیں سلیقہ سے رکھ دیتے تھے اور کتابوں کے شائقین وہاں سے اپنی منشاء کے مطابق کتابیں خریدتے تھے ان کتب فروشوں اور مختلف لائبریریوں سے میں کتابیں جمع کر کے پرویز صاحب کو دیتا تھا اور اگلے اتوار کو واپس لیتا تھا۔میرا مفاد اتنا تھا کہ وہ ان کتابوں پر تبصرہ کر دے۔اگر وہ کسی کتاب پر COMMENT نہیں کرتے تھے تو میں پوچھ لیتا تھا کہ باباجی یہ کتاب ملاحظہ فرمائی تو وہ سمجھ جاتے تھے اور مہربانی فرما کر تبصرہ کر دیتے تھے۔کتابوں کے اس طرح دینے اور لینے میں جو واقعات پیش آئے وہ الگ ایک مضمون کے متقاضی ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔

جہاں تک اپنے مضامین میں پرویز صاحب کے نام کا حوالہ نہ دینے کا تعلق ہے

تو میں نے ہمیشہ طلوع اسلام کا حوالہ دیا اور طلوع اسلام کا حوالہ خود پرویز صاحب کا ہی حوالہ ہے۔ کیونکہ تحریک طلوع اسلام کا سارا علمی سرمایہ ان کا ہی مہیا کردہ ہے البتہ طلوع اسلام نے ایسا ذہن بنا دیا ہے جو شخصیت پرستی سے بالکل ابا کرتا ہے۔ ذاتی محنت اور شخصیت پرستی میں بڑا لطیف فرق ہے۔ بار بار ان کے نام کا حوالہ نہ دینے کی وجہ طلوع اسلام کا بنایا ہوا ذہن ہے جو شخصیت پرستی پر آمادہ نہیں ہاں جہاں تک ان سے اکتساب علم کا تعلق ہے تو اس کا تہہ دل سے اقرار ہے کہ جب کبھی چند سطور تحریر کی گئیں یہ ان کی کفش برداری کا نتیجہ ہے۔

ذاتی محبت مجھے ان سے بہت تھی، میں ان کے انتقال اور تجہیز و تکفین میں شامل تھا۔ ان کے انتقال کے بعد میں تقریباً ایک سال تک درس میں شرکت نہیں کر سکا کوٹھی میں داخل ہونے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اوائل عمر ہی سے بہت رقیق القلب ہوں کبھی ضروری کام سے دفتر طلوع اسلام جاتا بھی تو رونے لگ جاتا تھا۔ شیخ حمید مرحوم مجھے تسلی دیتے تھے۔ اس وقت بھی جب یہ سطور لکھ رہا ہوں خون کے آنسو میری آنکھوں سے رواں ہیں سینہ غم سے پھٹا جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے جیسے دل اندر سے کٹ رہا ہے۔

کیا کہیں کیسے مراسم تھے ہمارے اس سے   وہ جو ایک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اچھی تحریر ایک ذریعہ ہے جو آپ کے خیالات و جذبات کو آپ کے قارئین تک پہنچاتا ہے ایسا کرنے کے لئے الفاظ کے وسیع ذخیرہ کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ مشاہدے، تجربے، تخیل، جذبے، عقیدے اور مثالی جوش کی ہے۔

غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی حیثیت

محترم جناب مہتاب حسین شاہ صاحب نے کہروڑ پکا سے ایک گرامی نامہ ارسال کیا ہے جس میں انہوں نے چند سوالات درج کئے ہیں جن کا تعلق کمترین کے ان مضامین سے ہے جو راقم سطور نے اسلامی نظام کے سلسلے میں تحریر کئے ہیں۔ چونکہ سوالات اصولی نوعیت کے ہیں اس لئے ان کا جواب شائع کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے۔

(۱) ''اگر کوئی شخص گناہ مثلاً زنا، چوری وغیرہ کی استطاعت رکھتے ہوئے ان سے اجتناب کرے تو وہ اطاعت الٰہی یا عبادت (الٰہی احکامات کی محکومیت) نہیں ہوگی۔ کیونکہ قرآن کا نظام نافذ نہیں ہے۔ اور انفرادی عبادت و اطاعت کی قرآن اجازت نہیں دیتا پس جرائم کرنے میں کوئی حرج یا مضائقہ نہیں۔

(۲) ''ممنوع امور سے باز رہنا اور معروف کام بجا لانا تو ضروری ہو اور ایسا کرنا اطاعت الٰہی بھی نہ کہلاتا ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے یہ 'پابندیاں' کیا کہلائیں گی اور ہم کس کی اطاعت کر رہے ہوں گے''

سوالات واضح ہیں۔ محترم متفسر کا سوال یہ ہے کہ غیر خدائی نظام میں نیکی و بدی، اطاعت، معصیت، ثواب و گناہ کا کیا تصور ہے۔ کیا انفرادی نیکیاں و پابندیاں نتیجہ خیز ہوتی ہیں یا نہیں؟ اور غلط نظام میں انفرادی نیکیوں کی کیا حیثیت ہے۔

پہلے آپ اسلامی حکومت کی اطاعت کے اثرات اور غلط معاشرہ میں زندگی بسر کرنے کے نتائج کو پیش نظر رکھیں، پھر بات واضح ہونے میں آسانی ہوگی۔

قرآن کریم کے نزدیک موجودہ انسان سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی نہیں ہے بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس سے پیشتر صرف حیوانیت کا ارتقاء تھا۔ اب انسانیت کا ارتقاء شروع ہوگا۔ انسانیت سے مراد اس جسم انسانی میں صفات الٰہی کا موجود ہونا ہے۔ جس قدر

ان صفات خداوندی کی نمود ونشوونما ہوتی جائے گی۔ اسی قدر انسانیت مستحکم ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن انسانیت کے ارتقاء کا واحد طریقہ یہ ہے کہ زندگی کو وحی الٰہی کے مطابق بسر کیا جائے، اور زندگی کا ایک ایک لمحہ قوانین الٰہی کے ماتحت گذارا جائے۔ چونکہ آج ساری دنیا میں قوانین الٰہی صرف قرآن کریم میں ہیں۔ اس لئے حکومت الٰہی کا ضابطہ قوانین بھی صرف قرآن ہوگا۔ زندگی بالنفس یا انسانیت صفات الٰہی کی حامل ہوتی ہے جس طرح ہمارے جسم انسانی پر طبعی قوانین اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح ہماری انسانیت کو وحی کے قوانین GOVERN کرتے ہیں یہ وہ مقام ہے جہاں وحی کی ضرورت پڑتی ہے کیونکہ وحی کے قوانین پر عمل کئے بغیر انسانیت ترقی نہیں کرسکتی۔ صرف وحی پر عمل کرنے سے انسانیت کی ترقی ہوتی ہے۔ اور اس کی خلاف ورزی کرنے سے انسانیت یا خودی مضمحل یا کمزور پڑ جاتی ہے اسلامی حکومت چونکہ وہ قرآنی قوانین نافذ کرتی ہے، جو صفات الٰہی پر مشتمل ہوتے ہیں، اس لئے ان قوانین پر عمل کرنے سے انسان میں صفات الٰہی کی ازخود تکمیل ہوتی چلی جاتی ہے۔ جس درجہ صفات الٰہی کی نمود ہوتی جاتی ہے، اسی درجہ انسانیت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہ اطاعت خارجی طور پر IMPOSE نہیں ہوتی جس طرح پانی پینے سے ہماری پیاس دور ہوتی ہے، اور یہ کسی کی خارج سے اطاعت نہیں ہوتی، اسی طرح اسلامی حکومت کی اطاعت کرنے سے ہماری اپنی اندرونی URGE پوری ہوتی ہے۔ غیر الٰہی حکومت میں یہ صورت نہیں ہوسکتی۔ اس میں صفات الٰہی کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ اس کے قوانین پر عمل کرنے سے انسان میں صفات الٰہی کی نمود نہیں ہوتی۔ غلط معاشرہ جو سود کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، اس میں ایک ایک لقمہ کھانے سے صفات الٰہی بالنفس انسانی میں ضعف ہوتا ہے، کیونکہ قرآن کے مطابق یہ معاشرہ اللہ ورسول کی دشمنی پر قائم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی حکومت میں ہر دنیاوی معاملہ جس کا فیصلہ وحی الٰہی کے مطابق کردیا جائے، دینی بن جاتا ہے۔ اگر دو آدمیوں کے درمیان کسی زمین کا تنازعہ ہے، اور وہ مقدمہ اسلامی حکومت کی عدالت میں دائر ہے اسلامی حکومت کی عدالت جو فیصلہ دے گی وہ فیصلہ دینی ہوگا، اور اس فیصلہ کی اطاعت ان دو آدمیوں کے لئے اللہ ورسول کی اطاعت ہوگی، اس طرح اسلامی حکومت

کے تمام فیصلے، انسانی نفس یا انسانیت کی نشوونما کے ذریعے بن جاتے ہیں۔اسی طرح اگر ایک شخص غیر اسلامی حکومت میں اپنے دفتر صحیح وقت پر جاتا ہے تو اس کو دنیاوی طور پر تو فائدہ ہوگا کہ اس کے افسران اس سے خوش ہوں گے،لیکن اس کی اس پابندی سے اس کو کوئی دینی فائدہ نہیں ہوگا۔البتہ اگر یہ اسلامی حکومت ہے۔تو اس شخص کا وقت پر دفتر جانا، اسلامی حکومت کے حکم کی اطاعت ہوگا،اور اس کی نفس یا انسانیت کی پرورش کا باعث ہوگا۔اور اس طرح یہ خالص دنیاوی معاملہ دینی بن جاتا ہے۔اسی طرح جرائم کی پوزیشن ہے۔اگر ایک شخص چوری کرتا ہے۔عدالت نے اس کو دو سال کی سزا دی ہے۔وہ دو سال کی سزا پوری کر کے،حکومت کے قائدے کے مطابق آزاد ہو گیا،اب اس پر حکومت کی طرف سے کوئی باز پرس نہیں ہے۔لیکن اس کے نفس یا اس کی انسانیت پر جو بُرے اثرات مرتب ہوئے ہیں،وہ زائل نہیں ہوتے اور اس سے انسانیت مجروح ہوتی ہے۔لیکن اگر یہ اسلامی حکومت ہے اور اسلامی حکومت نے اس کو دو سال کی سزا دی ہے،وہ اس سزا کے پوری ہونے کے بعد جس طرح دنیاوی حکومت کے نزدیک قابل مواخذہ نہیں رہتا،اسی طرح اس کے نفس پر جو بُرے اثرات مرتب ہوئے تھے،وہ بھی زائل ہو جاتے ہیں کیونکہ اس نے دو سال اسلامی حکومت کی سزا برداشت کی،اس طرح اس کا اسلامی حکومت کی اطاعت کرنا، اس کے بُرے اثرات کو زائل کر دے گا،اور اس طریقہ سے یہ خالص دنیاوی کام دینی معاملہ بن جاتا ہے۔

یہاں تک جو تحریر کیا گیا ہے،اس سے آپ کے ذہن میں اسلامی حکومت کی لابدّیت اور اہمیت و ضرورت واضح ہو گئی ہوگی۔کہ اس میں زندگی بسر کرنے،نفس،خوری،یا انسانیت،از خود ترقی کرتی ہے۔جبکہ غیر اسلامی حکومت کا معاملہ اس کے بالکل برعکس واقع ہوا ہے کہ اس کی اطاعت کرنے سے،ہر ہر منٹ،نفس انسانی از خود مضمحل اور کمزور ہوتا چلا جاتا ہے،اور اس میں انسانیت کی نشوونما بالکل رک جاتی ہے،اس تمہید کے بعد اب اصل سوال کی طرف آتے ہیں۔

جہاں تک نفس انسانی پر اثرات مرتب ہونے کا سوال ہے،وہ تو اسلامی حکومت یا

غیر اسلامی حکومت دونوں میں مرتب ہوتے ہیں۔ جو شخص چوری کرے گا اس کا اثر یقیناً اس کے نفس پر مرتب ہوگا اور اگر اس نے اجتناب کیا تو اس کا اثر بھی اس کے نفس پر مرتب ہوگا۔ لیکن جیسا کہ واضح کیا گیا ہے اگر وہ اسلامی حکومت میں سزا بھگت لے گا تو اس کے نفس کے اثرات بھی زائل ہو جائیں گے۔ لیکن دنیاوی حکومتوں میں اس کو یہ فائدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

قرآن کریم کے نزدیک انسانیت پر ظلم کرنے والے نظام کے اندر انفرادی نیکیاں ثواب کا باعث نہیں بن سکتیں۔ اگر وہ نظام ہی باطل بنیادوں پر تعمیر کیا گیا ہے، تو افراد کی ذاتی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت پر ظلم کرنے کو جائز سمجھتا ہے قرآن کریم نے اس مسئلہ کو خوب واضح کرنے کے لئے دو مثالیں پیش کی ہیں۔

پہلی مثال کہ یہودی اپنی قوم کے ایک طبقہ کو مفلس، غریب بنا کر، انہیں ان کے گھر سے باہر نکال دیتے تھے۔ ان غریب لوگوں کو دوسرے قبائل اپنا غلام بنا لیتے تھے۔ پھر ان یہودیوں کے علماء قیدیوں کو رہا کرانے کے ثواب بتاتے تھے چنانچہ وہ یہودی ان علماء کے مواعظ سے متاثر ہو کر، ثواب کمانے کی خاطر ان قیدیوں کا فدیہ ادا کر کے، انہیں قید سے چھڑاتے تھے۔ ان سے کہا گیا کہ ایسا کرنے سے تم اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہو، قیدیوں کو آزاد کرانے کا ثواب کماتے ہو لیکن یہ بات کبھی نہیں سوچتے کہ ان لوگوں کو اس حالت پر تم نے ہی پہنچایا ہے۔ تم ان لوگوں کو اس حالت تک پہنچا دیتے ہو، اور اس کے بعد انہیں قید سے چھڑانے کی "نیکیاں" حاصل کرتے ہو، قرآن کریم اس واقعہ کو بیان کرنے سے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ خود دوسروں کو اس حالت پر پہنچا دینا، کہ وہ دوسروں کی مدد کے محتاج ہو جائیں خود ایک جرم عظیم ہے اور پھر مدد کر کے، اپنے آپ کو اطمینان دلانا کہ ہم نے اتنا بڑا ثواب کمایا ہے، خود کو دھوکہ دینا ہے۔

دوسری مثال بیان کرنے میں قرآن کریم قریش مکہ کی کج ذہنی کو پیش کرتا ہے فرمایا اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَ عِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (9/19) کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کے لئے پانی کی سبیلیں لگا دینے اور خانہ کعبہ کی آبادکاری کے مختلف کام سر

انجام سے انسان اس شخص کے برابر ہو جاتا ہے جو قوانین الٰہی اور حیات آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور نظام الٰہی کے قیام وبقا کے لئے مسلسل جدوجہد کرتا ہے۔ (یاد رکھو) معیار الٰہی کے مطابق یہ کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اللہ کا قانون مشیت کبھی ایسے لوگوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا جو ظلم سے باز نہ آئیں (اس قسم کی ذاتی اور انفرادی نیکیوں سے اپنے کو دھوکہ نہ دو کہ ہم نے بہت ثواب کما لیا ہے۔ اصل عمل اور اصل ثواب تو اس نظام کا قیام ہے جس سے دنیا میں ظلم وجور از خود ختم ہو جاتا ہے۔

ان دو مثالوں کے ذریعے قرآن کریم نے واضح فرمایا کہ ذاتی نیکیاں قرآنی نظام کو قائم کرنے کی مسلسل جدوجہد کے برابر نہیں ہو سکتیں۔ انفرادی نیکیاں یقیناً ضروری ہیں لیکن یہ نیکیاں غلط معاشرہ میں صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہ نیکیاں صحیح نتائج اسی وقت پیدا کرتی ہیں، جب یہ قرآنی نظام کے اندر کی جائیں۔ ہمارے آج کے موجودہ دور میں زندگی گزارنے کا بہتر طریقہ یہ ہو سکتا ہے، کہ حتی الامکان قرآنی منکرات سے اجتناب کیا جائے۔ لیکن جن منکرات سے اجتناب بھی نہ کیا جا سکے، انہیں مجبوراً برداشت کیا جائے جیسے کہ آج کل سارا نظام سودی ہے، آپ اس سے بچ نہیں سکتے۔ اس جرم کا ازالہ اس بات سے کریں کہ اسلامی نظام کے قیام کی حد درجہ، سر توڑ کوشش کریں۔ کیونکہ اسلامی نظام کے قیام کی کوشش سب سے بڑی عبادت ہے۔

سوالات کا جواب یہاں ختم ہوتا ہے۔ لیکن آخر میں ایک اعتراف کرنا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ''اسلامی حکومت کی اطاعت ہی، اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے'' یہ عنوان، دیگر رسائل کے علاوہ ''صوت الحق'' کا منفرد نظریہ ہے۔ امت مسلمہ اہل الذکر والقرآن کے اولین کے علماء، مولوی محمد عبداللہ صاحب مرحوم چکڑالوی ''بیان اللناس'' کے مصنف خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری، رسالہ ''اشاعت القرآن'' کے ایڈیٹر مولوی حشمت علی صاحب، اس نظریہ کے داعی نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہزار رحمتیں ہوں، اس کے اول داعی حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم تھے۔ البتہ جب بلاغ القرآن 1960ء میں جاری ہوا، تو اس وقت کے اہل قرآن علماء، میاں اسماعیل مرحوم، ماسٹر محمد علی رسولنگری، وغیرہ بھی

اس نظریہ کے داعی ہو گئے تھے۔ان دو تحاریک کے علاوہ ہماری پوری تاریخ میں، جب سے اسلامی لٹریچر تحریر کیا جانا شروع ہوا ہے، کسی جگہ اس نظریہ کا سراغ نہیں ملتا۔اسی وجہ سے اس سے موضوع پر نہ کہیں کوئی لٹریچر ملتا ہے، اور نہ ہی کہیں سے کوئی راہ نمائی۔ان دو تحریکوں میں بھی اس موضوع پر بہت کم مواد موجود ہے۔ مجھ کمترین نے اس موضوع پر مسلسل سات (7) مضامین تحریر کئے جن میں سے بیشتر موقر رسالہ 'صوت الحق' ہی میں شائع ہوئے، کیونکہ یہی واحد رسالہ خالص قرآنی نظریات کا داعی ہے۔ان مضامین کے شائع ہونے کے بعد مجھے برابر استفسارات واعتراضات موصول ہوتے رہے، اور میں حتی الامکان ان کے جواب ارسال کرتا رہا ہوں۔لیکن میری یہ بڑی مجبوری اور کمزوری ہے کہ مجھے اس موضوع پر کہیں سے کوئی راہ نمائی نہیں ہو رہی ہے، جس سے مزید استفادہ کیا جا سکے

قرآنی نظریات کی نکارت واجنبیت کا اندازہ آپ اس بات سے لگائیں کہ میں نے "وحی صرف قرآن میں ہے" کے موضوع پر سب سے پہلا مقالہ دسمبر 1982ء میں شائع کیا تھا اور اسی موضوع پر دوسرے مقالے بعد میں بھی شائع ہوئے جب میں نے پہلا مقالہ طبع کرا کر، بڑی کثیر تعداد میں تقسیم کرایا، تو تحریک طلوع اسلام کے حلقہ کے لوگوں کو اس موضوع پر تعجب ہوا، اور چند ایسے احباب نے، جو عرصہ دراز سے اس فکر سے منسلک تھے، اس موضوع پر تردد کا اظہار کیا۔حالانکہ تحریک طلوع اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہے۔اور اس پر اس تحریک نے بہت کام بھی کیا ہے۔ میں نے اس بات کا ذکر محترم المقام جناب پرویز صاحب سے بھی کیا۔انہوں نے یہی فرمایا کہ غیر قرآنی نظریات ہماری زندگی میں اس درجہ سرایت کر گئے ہیں، کہ قرآنی نظریات پھیلنے میں کافی عرصہ درکار ہوگا۔ یہ چند سطور بطور اعتراف تحریر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ خالص قرآنی نظریہ ہے۔اور نہایت درجہ غور وفکر کا متقاضی ہے۔اس لئے قارئین سے درخواست ہے کہ اس پر غور وفکر فرمائیں اور جو حضرات اس موضوع پر کچھ تحریر فرماسکیں وہ ضرور تحریر کر کے، اس رسالہ کو ارسال فرمادیں، کیونکہ خالص قرآنی نظریات کے مضامین صرف اس رسالہ صوت الحق میں ہی طبع ہو سکتے ہیں، باقی تو ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔

اللہ ورسول کی اطاعت کی عملی شکل
اسلامی حکومت کی اطاعت ہے

اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ضابطہ حیات اور انسانی عقل کا خود ساختہ نظام زندگی برابر نہیں ہوسکتے۔ هَلۡ تَسۡتَوِی الظُّلُمٰتُ وَ النُّوۡرُ (13/16) تاریکیاں اور روشنی برابر نہیں ہوسکتیں۔ اسلامی حکومت اپنے وجود میں بالکل منفرد حکومت ہوتی ہے۔ جس کو عقل انسانی وحی الٰہی کی روشنی سے مستفید ہوئے بغیر قائم نہیں کرسکتی۔ اس طرز حکومت کو انسانی وضع کردہ حکومتوں، جمہوریت، اشتراکیت، فاشیت، نازیت وغیرہ سے کوئی مشابہت ومماثلت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ انسانی ذہن کی مرہون منت نہیں ہوتی۔ اسلامی حکومت قرآن کریم کے احکامات کو قوت کے ذریعہ نافذ کرتی ہے۔ چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے قوانین یا احکامات نافذ کرتی ہے، اس لئے اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو بھی حکومت اسلامی قوانین نافذ نہ کرے، بلکہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کا اجراء کرے وہ اسلامی حکومت ہرگز نہیں ہوسکتی خواہ اس حکومت کو چلانے والے سب مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر قانون اور حکومت کا ایک فطری اور لازمی تعلق ہوتا ہے۔ قانون اور حکومت دونوں آپس میں لازم وملزوم ہوتے ہیں۔ ہر قانون کا اپنی نمود وساخت میں یہ تقاضہ وخاصہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت کو پیدا کرے جو اس قانون کو عملاً جاری کرے۔ قرآن کریم چونکہ پوری انسانیت کی ملکیت ہے اور پوری انسانیت کو نفع وفائدہ پہنچانے کے لئے نازل کیا گیا تھا اس لئے اس کا خصوصی مقتضی ومنطقی نتیجہ تھا کہ اس کے قوانین واحکامات کو جاری کیا جائے تاکہ انسانیت اس کے فوائد سے محروم نہ رہے۔ اسی وجہ سے جمہور مسلمانوں کا اس بارے میں ہمیشہ یہ متفقہ عقیدہ رہا ہے کہ خلیفہ کا نصب کرنا یعنی اسلامی حکومت کو قائم کرنا،

مسلمانوں پر فرض ہے۔ سورہ نساء کی مشہور آیۂ کریمہ میں جہاں اولی الامر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، یہ خود اس امر کا مقتضی ہے کہ جب تک کسی اولی الامر کا وجود نصب نہ ہو اسے وجود میں لانا یا اس کا نصب کرنا مسلمانوں پر لازم ہے۔ کیونکہ اطاعت اولٰی الامر جو کہ فرض قرار دی گئی ہے بنصب اولٰی الامر کے بغیر ناممکن ہے۔

سورہ توبہ میں ارشاد عالی ہے قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ (9/29) ان اہل کتاب سے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہیں جانتے قتال کرو یہاں تک کہ وہ ماتحت ہو کر جزیہ دیں۔ اس آیہ کریمہ میں کفار کا جزیہ دینا اور ان کا 'صغار' یعنی ماتحت ہونا لازم قرار دیا گیا ہے۔ یہ دونوں چیزیں کسی با قاعدہ مضبوط ملک اور اس کی حکومت کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتی نیز ارشاد ہوتا ہے وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَ عَدُوَّكُمْ (8/60) اور کفار سے مقابلہ کرنے کے لئے تم میں جس قدر استطاعت ہو قوت مثلاً گھوڑے وغیرہ تیار رکھو جس سے تم اپنے اور اللہ کے دشمن کو ڈراتے رہو، یہاں قوۃ کا لفظ بطور نکرہ کے استعمال کیا گیا ہے تا کہ اس میں ہر طرح کی قوت شامل ہو سکے، اس میں اسلحہ کے علاوہ معاشی، سیاسی، افرادی، ہر طرح کی قوت شامل ہو سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ حکومت کے قیام کے بغیر ان قوتوں کا جمع کرنا ممکن نہیں ہے کہ جن کے ذریعے اللہ کے دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ (49/9) اگر کبھی ایسا ہو کہ مومنین کے دو فریق آپس میں لڑ پڑیں، تو ان میں فوراً صلح کرا دو۔ اگر اس کے بعد ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو تم سب مل کر اس زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف

اٹھ کھڑے ہو، تا آنکہ وہ اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئے جو قانون خداوندی کی رو سے کیا گیا تھا۔ سو اگر وہ لوگ، اس فیصلہ کی طرف پلٹ آئیں تو ان میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرادو اور ہمیشہ انصاف پیش نظر رکھو یہ چیز قانون خداوندی کی رُو سے بڑی مستحسن ہے۔ دو جماعتوں میں صلح کرانا، پھر ان دونوں جماعتوں کو صلح کا پابند کرانا، زیادتی کرنے والی قوم کو سزا دینا، یہ تمام امور بغیر غلبہ و حکومت کے کس طرح سرانجام دیئے جاسکتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی ضرورت اور اہمیت کے بارے میں بیسیوں آیات کریمات پیش خدمت کی جاسکتی ہیں۔ مضمون کے اختصار کے پیش نظر صرف ان ہی آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے حکومت کو نعمتوں میں سے ایک نعمت بھی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے **اَمۡ یَحۡسُدُوۡنَ النَّاسَ عَلٰی مَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۚ فَقَدۡ اٰتَیۡنَاۤ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ وَ اٰتَیۡنٰہُمۡ مُّلۡکًا عَظِیۡمًا** (4/54) کیا دوسرے لوگوں سے اسی چیز پر جلتے ہیں جو ان کو اللہ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔ تو ہم نے خاندان ابراہیم کو کتاب، حکمت اور بہت بڑی سلطنت عطا فرمائی۔ اسی طرح تمام انبیاء کرام نے حکومت الٰہیہ کے قیام کے لئے کوششیں کی۔ **وَ اِذۡ قَالَ مُوۡسٰی لِقَوۡمِہٖ یٰقَوۡمِ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَۃَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ اِذۡ جَعَلَ فِیۡکُمۡ اَنۡۢبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمۡ مُّلُوۡکًا ٭ۖ وَّ اٰتٰىکُمۡ مَّا لَمۡ یُؤۡتِ اَحَدًا مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ** (5/20) جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ کے احکامات جو تم پر ہو رہے ہیں یاد کرو جبکہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بہت سے پیغمبر بنائے اور تم کو صاحب ملک بنایا تمہیں وہ چیزیں دیں جو دنیا میں کسی کو نہیں دیں۔

آیات قرآنیہ کے علاوہ احادیث نبویہ میں بھی حکومت کے قیام کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ **ومن مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتة الجاهلیة**، جو شخص ایسی حالت میں مر جائے کہ اس کی گردن میں کسی امیر کی بیعت نہ ہو تو وہ جاہلیت کی موت مرا (صحیح مسلم، کتاب لامارۃ، باب لزوم الجماعۃ) اسی طرح ارشاد ہوتا ہے **وانما الامام جنة یقاتل من ورائه ویتقی به فلن امر یتقوی الله وعدل فلن له بذلك اجراً وان قال بغیره فلن علیه منه** مشکوٰۃ، کتاب الامارہ والقضاء) بے شک

امام وہ سپر ہے جس کے پیچھے ہو کر جنگ کی جاتی ہے اور اس کے ذریعے سے حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔ پس اگر وہ تقویٰ کا حکم دے اور انصاف کرے تو ثواب ملے گا اور اگر کسی کے خلاف کرے تو گناہ گار ہوگا۔ ہمارے علماء و متکلمین بھی اسلامی حکومت کے قیام کو فرض سمجھتے تھے۔ شرح مواقف جو علم کلام کی مشہور ترین کتاب ہے اور درس میں شامل ہے اس میں درج ہے کہ **نصب الامام واجب عند نا سمعاً** امام کا تقرر ہمارے اور دلیل نقلی کی بناء پر واجب ہے۔ نیز اسی طرح درمختار میں ہے کہ **ونصبه اهم الواجبات** امیر کو مقرر کرنا، واجبات میں سب سے اہم واجب ہے۔ اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی **ازالۃ الخفا** میں تحریر فرماتے ہیں۔ مسئلہ واجب با کفایہ است بر مسلمین۔ **الی یوم القیامۃ نصب خلیفہ مستجمع شروط**، مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے۔ یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے۔ یہاں تک جو پیش خدمت عالی کیا گیا ہے اس سے قارئین کرام نے اندازہ فرمایا ہوگا کہ اسلامی حکومت کا قیام اب بھی مسلمانوں پر اسی طرح فرض ہے جس طرح حضورؐ نے اپنے دور سعید میں اس کو قائم فرمایا تھا۔ ان تحریر کردہ آیات قرآنیہ، احادیث نبویہ اور اقوال و آثار علماء کے بعد کوئی راہ فرار باقی نہیں رہتی

نزول قرآن کے دوران مختلف امور کے متعلق مسلسل قوانین و احکامات دیئے جارہے تھے۔ ان کی عملی شکل یہ ہوتی تھی کہ مومنین ان پر اجتماعی طور پر ایک نظام کی وساطت سے عمل کرتے تھے۔ زکوٰۃ، خمس، صدقات کے احکامات نازل ہوئے تو لوگوں نے فرداً فرداً زکوٰۃ ادا نہیں کی کہ جس کا دل چاہا اپنی مرضی سے کسی کو زکوٰۃ دے دی بلکہ اس کی عملی شکل یہ تھی کہ یہ رقم حضورؐ کے پاس پیش کی جاتی اور حضورؐ اس کو سربراہ مملکت کی حیثیت سے بیت المال میں جمع کر دیتے تھے اور حسب موقع اس کو خرچ کیا گیا اسی طرح جب احکام تعزیرات نازل ہوئے کہ زانی کے سو کوڑے مار دیا چور کے ہاتھ کاٹ دو تو لوگوں نے از خود ان احکامات پر عمل نہیں کیا تھا کہ کسی کے گھر چوری ہوئی تو اس نے چور کو پکڑ کر اور محلہ کے لوگوں کو جمع کر کے، اس چور کے ہاتھ کاٹ دیئے بلکہ صورت حال یہ ہوتی تھی کہ چوری یا زنا کے جرم کی اطلاع حضورؐ کو یا حضورؐ کے مقرر کردہ اسلامی حکومت کے افسران یعنی اولی الامر کو دی

جاتی تھی، وہ اس جرم کی تحقیق وتفتیش کر کے اس کے مطابق اُس مجرم کو سزا دیتے تھے یا اسے بری کر دیتے تھے۔ اسی طرح نکاح طلاق کے معلامات بھی حضورؐ کی معرفت طے پاتے تھے قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت اس مرکز کی وساطت سے، اجتماعی طور پر کی جاتی تھی۔ انفرادی طور پر ان کی اطاعت الگ الگ از خود نہیں کی جاتی تھی اس مرکز کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی تھی۔ چونکہ وہ احکام اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے اور ان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جاری فرمارہے تھے، اس لئے اس نظام (مرکز) کی اطاعت سے اللہ ورسول دونوں کی اطاعت ہوجاتی تھی۔ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم یا اولی الامر خود حاکم نہیں ہوتے تھے بلکہ وہ خود ان احکامات کی اطاعت کرتے تھے اور دوسروں سے ان کی اطاعت اجتماعی طور پر کراتے تھے۔ اسلامی حکومت میں تو درحقیقت نہ کوئی حاکم ہوتا ہے اور نہ کوئی محکوم۔ بلکہ ہر شخص اپنی جگہ پر اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ جو اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں، اس طرح حاکم صرف قانون الٰہی ہوتا ہے۔ اور وہی طاقت کا منبع ومحور ہوتا ہے۔ یہ حکومت بجا طور پر خالص قانونی حکومت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ اس حکومت کے قیام اور اس کی بقا کا راز اور سبب یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ اس حکومت کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہورہی ہے۔ اس نظام میں حکومت کی چار نمایاں خصوصیات ہیں جو پیش خدمت کی جارہی ہیں۔ یہ امتیازی خصوصیات اتنی واضح ہیں کہ ہر شخص از خود اندازہ کرسکتا ہے کہ کون سی حکومت اسلامی ہے اور کون سی غیر اسلامی ہے۔

(۱) اس مملکت کی پہلی پہچان یہ ہے کہ اس میں اللہ ورسول کی اطاعت ایک اطاعت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے ہر جگہ ان دو مطاعوں کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ یہ آیات راقم سطور کے سابقہ مضامین میں کئی بار تحریر کی گئی ہیں۔ بار بار تحریر کرنے سے قارئین کرام کے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے حوالے تحریر کئے جاتے ہیں۔ آپ ان کو معہ ترجمہ اپنے نسخوں میں ملاحظہ فرمالیں۔ بعض نسخوں میں ایک یا دو آیات کا فرق ہوتا ہے، اس لئے اس بات کو پیش نظر رکھیں۔ آیات یہ ہیں۔

(8/20، 9/74، 9/62، 9/24، 24/54، 58/21، 59/8، 33/36، 8/13، 9/107، 8/46، 59/4-1، 24/63)

(۲) اس حکومت کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ بغیر اس نظام کے قیام کے اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا اور کوئی ذریعہ یا واسطہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق صرف اس نظام کی وساطت سے قائم ہوتا ہے اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو ہم اللہ و رسول کی اطاعت سے بالکل محروم ہیں۔ کیونکہ مومن تو وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل اور آخری ضابطہ حیات تسلیم کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام خداوندی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہاں سے ہی اس جدوجہد کا آغاز کردے۔ کیونکہ نظام خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ و بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی سرزمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کردے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں اُن کے لئے از بس ضروری ہے کہ قرآن کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے باغی، مجرم، نافرمان ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزے کے پابند ہوں۔ غیر خدائی نظام (طاغوت) میں جس قدر رزق جائز ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے، وہ بھی قرآن کی رُو سے حرام ہوتا ہے۔

(۳) اس نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو وعدے قرآن کریم میں کئے ہیں۔ وہ اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ اگر وہ نظام وہ وعدے پورے کر رہا ہے تو بے شک وہ اسلامی نظام ہے ورنہ وہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک ایسا عملی Test ہے جس پر ہر شخص اس حکومت کو پرکھ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں بہت واضح طور پر وعدہ فرماتا ہے کہ **وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا** (11/6)، زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں ہے جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہیں ہے نیز ارشاد ہوتا ہے **نحن نرزقهم وایاکم** (17/31) ہم تمہارے رزق کے ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد

کے بھی۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کس واضح انداز میں اللہ تعالیٰ سب کے رزق کی ذمہ داری اپنے سر لے رہا ہے اور ظاہر ہے کہ جب ان سب کے رزق کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے تو ان میں سے کسی کو بھی بھوکا نہیں رہنا چاہئے تھا۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس دنیا میں کروڑوں لوگ دو وقت کی روٹی سے محروم ہیں اور بھوکے مر جاتے ہیں۔ بظاہر ان واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہ وعدے جھوٹے ہیں، لیکن ان آیات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ ان ذمہ داریوں کو براہ راست پورا کرتا ہے۔ یہ ذمہ داریاں اس نظام کی وساطت سے پوری ہوتی ہیں جو اس کے نام پر قائم ہوتا ہے۔ اگر نظام معاشرہ خدا کے قانون کے مطابق قائم ہے تو اللہ کی تمام ذمہ داریاں پوری ہوتی جاتی ہیں۔ وہ نظام جو خدا کے نام سے قائم ہوتا ہے وہ ان ذمہ داریوں کو اپنے سر لیتا ہے جو اللہ کی طرف منسوب ہیں اور اس کے بدلے میں اس نظام کے افراد بھی وہ تمام واجبات و فرائض ادا کرتے رہتے ہیں جن کا عہد انہوں نے اپنے خدا سے کیا ہوتا ہے۔ اس مملکت کے لوگ اس حکومت کی اطاعت کرنے کے اس وقت تک پابند ہیں جب تک وہ حکومت ان ذمہ داریوں اور وعدوں کو پورا کرتی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جس قریہ میں ایک شخص نے بھی رات بھوک میں گذار دی، اس قریہ سے اس حکومت کی اطاعت مرفوع ہو جاتی ہے یعنی اُٹھ جاتی ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں متعدد مقامات پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں سے غلبہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے فرمایا۔ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3/139) اور مسلمانوں کاہلی نہ کرو اور غم نہ کرو کیونکہ اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے۔ وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4/141) خدا کافروں کو مومنین پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں دے گا۔ وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (63/8)، حالانکہ غلبہ تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے، مگر منافقین نہیں جانتے، نیز فرمایا۔ كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ (58/21) خدا نے حکم دے دیا ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں

گے فرمایا۔ هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ (9/33، 48/28، 61/9)، وہی تو خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ یہ اور اسی قبیل کی متعدد دیگر آیات بینات، سب اسی نظام کے قیام سے وابستہ ومربوط ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے یہ تمام وعدے، صرف اور صرف اس وقت پورے ہوسکیں گے، جب وہ نظام برپا ہوگا۔ کیونکہ اللہ کے وعدے اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں۔ یہ وہ عملی Test ہے جس سے اسلامی حکومت کی پہچان ہوسکتی ہے۔ صدر اول میں یہ وعدے اسی نظام کی وساطت سے پورے ہوئے جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ شہنشاہ ایران کے محل میں داخل ہوئے تو ان کی زبان پر بے ساختہ قرآن کریم کی یہ آیات جاری تھیں۔ کَمۡ تَرَکُوۡا مِنۡ جَنّٰتٍ وَّعُیُوۡنٍ ۝ وَّزُرُوۡعٍ وَّمَقَامٍ کَرِیۡمٍ ۝ وَّنَعۡمَةٍ کَانُوۡا فِیۡهَا فٰکِهِیۡنَ ۝ کَذٰلِکَ وَاَوۡرَثۡنٰهَا قَوۡمًا اٰخَرِیۡنَ (44-25)، انہوں نے کس قدر سرسبز وشاداب باغات، خنک وشیریں چشمے، لہلہاتی کھیتیاں اور بلند وبالا مقامات عز وشرف اپنے پیچھے چھوڑ دیئے۔ یعنی وہ تمام سامان آرائش وزیبائش جو اُن کی خوش حالیوں کا آئینہ دار تھا وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے اور ہم نے ایک اور قوم کو اس کا وارث بنادیا۔

ایرانی قوم عربوں کے مقابلہ میں زیادہ مہذب شمار کی جاتی تھی۔ ان کی روزمرہ کی معاشرت عربوں کے مقابلہ میں زیادہ Sophiscated تھی اور ان کے ہاں آرام وآسائش، اور زیبائش کے زیادہ سامان موجود تھے۔ عرب ہمیشہ ان کے حاصل ہونے کی Wishful thinking کرتے تھے، اسی وجہ سے قرآن کریم نے عربوں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ ایمان لائیں گے تو ان کو وہ اشیاء مل جائیں گی۔ اللہ نے ریشمی ملبوسات، جواہرات اطلس وکمخواب، مرصع ہار موتیوں کے کنگن، قصور ومحلات، باغات وغیرہ کا وعدہ قرآن کریم میں فرمایا تھا۔ فتح ایران کے بعد حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے جب مال غنیمت حضرت عمرؓ کو ارسال کیا تو اس سامان کے ساتھ ایک مکمل فہرست بھی سامان کی ارسال فرمائی۔ اس سامان میں وہ تمام اشیاء شامل تھیں جن کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا تھا اور اس

طرح اللہ کے وہ وعدے نظام کی وساطت سے پورے ہو گئے۔ سورہ حج میں ارشاد ہوتا ہے

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الۡاُمُوۡرِ (22/4)، اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی، انہیں اقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظام صلوٰۃ قائم کریں گے، یعنی ایسا معاشرہ قائم کریں گے کہ جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کے پیچھے پیچھے چلتے جائیں گے۔ یہ تمام نوع انسانی کو سامان نشو ونما مہیا کریں گے ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قرآن کریم درست قرار دیتا ہے اوران تمام امور سے باز رکھیں گے جنہیں وہ ناجائز قرار دیتا ہے۔ یہ تمام معاملات کا فیصلہ قانون خداوندی کے مطابق کریں گے۔ اسی طرح سورہ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسۡتَخۡلِفَنَّہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کَمَا اسۡتَخۡلَفَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ ۪ وَ لَیُمَکِّنَنَّ لَہُمۡ دِیۡنَہُمُ الَّذِی ارۡتَضٰی لَہُمۡ وَ لَیُبَدِّلَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ خَوۡفِہِمۡ اَمۡنًا ؕ یَعۡبُدُوۡنَنِیۡ لَا یُشۡرِکُوۡنَ بِیۡ شَیۡئًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ بَعۡدَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ (24/55)——— (باقی رہا یہ کہ ان قوانین کی اطاعت سے ملے گا کیا؟) تو ہم نے ان لوگوں سے جو ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھیں اور ہمارے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ ہم انہیں زمین میں حکومت عطا کریں گے (33/27) اور ان کی حکومت اس خطہ ارض کو جنت میں تبدیل کر دے گی (39/74)، یہ ہمارا ابدی قانون ہے جس کے مطابق ہم نے اقوام سابقہ کو بھی اسی قسم کی حکومت (تمکن فی الارض) عطا کی تھی (28/6) اسی قانون کے مطابق ہم ان کے ایمان اور اعمال کے نتیجے میں انہیں حکومت عطا کر دیں گے۔ ان کے اس نظام زندگی کو مستحکم کر دیں گے جسے ہم نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا تاکہ وہ نہایت اطمینان سے ہمارے اور صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں اور ان پر کسی قسم کا جبر یا دباؤ نہ ہو، کہ وہ اس کے ساتھ کسی اور کی بھی اطاعت کریں اور اس طرح شرک کے مرتکب ہوں (دنیا کی کوئی طاقت انہیں مجبور نہ کر سکے) کہ

وہ قوانین الٰہی کے ساتھ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کریں (لیکن یہ اچھی طرح سن لو کہ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک یہ قوم ہمارے قوانین پر عمل پیرا رہے گی) جو لوگ ایسا نظام قائم ہو جانے کے بعد، اس سے عملاً انکار کر دیں (اور احکام خداوندی کی بجائے، اپنے احکام نافذ کرنے لگ جائیں) تو یہ لوگ اس شاہراہ حیات کو چھوڑ کر جو انہیں صحیح منزل کی طرف لئے جا رہی تھی اور راہوں کی طرف نکل جائیں گے (مقتبس از مفہوم القرآن)

یہ وہ وعدے ہیں جو اسلامی نظام پورے کرتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے لئے مکمل اقتدار اور غلبہ، اس میں دین کا تمکن معاشرہ میں امن و اطمینان، اور قانون خداوندی کا پورا پورا اجراء و نفاذ۔ اسلامی مملکت کی چوتھی اور سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے ایک زندہ، جیتی جاگتی، شخصیت کا ہونا لازمی ہے۔ اسلام دین ہے، مذہب نہیں ہے اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں ہے، اس کتاب کے مطابق اطاعت خداوندی کرانے والا بھی ضروری ہے یہ مرکزی، شخصیت رسول کی ہوتی ہے اور چونکہ اسلام کا نظام ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے اس لئے رسول کے بعد یہ مرکزی شخصیت ان کے نائب، ان کے خلیفہ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ **علیکم بسنّتی وسنة الخلفاء الراشدين المهديين** (مشکوٰۃ شریف) تم پر میرے اور میرے خلفاء راشدین مہدیین کے طریقے کی پیروی لازمی ہے۔ جب تک وہ نظام قائم رہا، اس کے سربراہ کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت گردانی جاتی تھی۔

صدر اول میں یہی نظریہ معروف و متداول تھا۔ ہم مسلمانوں کی بدقسمتی کہ ہمارے ہاں ملوکیت در آئی۔ ظاہر ہے کہ ملوکیت کے قیام کے بعد بادشاہوں کی اطاعت، اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ وہ بادشاہ بدچلن، بدکردار، آوارہ اور عیاش تھے۔ وہ تو محض قوت کے زور پر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار ہو گئے تھے، ایک ایک بادشاہ کے حرم میں کئی کئی سو لونڈیاں ہوتی تھیں۔ اپنی بدکرداری اور بدچلنی کے باعث وہ خود بھی اپنی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دینے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔ اگرچہ اپنے

مفادات اور Vested Interets کی خاطر انہوں نے اپنے اپنے دور کے علماء وفقہاء کرام سے فتاویٰ حاصل کر لئے تھے۔ لیکن وہ اس بات کی جرات نہیں کر سکتے تھے کہ اپنی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیں۔ فلہٰذا ایسی صورت میں اللہ کی اطاعت تو قرآن کی اطاعت سے کی جانے لگی لیکن رسول کی اطاعت کی کوئی راہ نہیں نکلتی تھی۔ اگر انسانیت اور مسلمانوں کی خوش بختی ان کی یاوری کرتی تو وہ پھر وہی نظام قائم کرنے کی کوشش کرتے، لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور ملوکیت نے اپنے دور کے علماء کے تعاون سے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حدیث رسول کی اطاعت سے رسول اللہ کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ اس عقیدہ کے وضع کرنے کے بعد روایات کے ذخیرے مرتب ہونے لگے اور ان کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ جس کسی نے دس فقرے لکھ کر، حضور کی طرف منسوب کر دیئے، ان دس فقروں کی اطاعت کو حضورؐ کی اطاعت قرار دیا جانے لگا۔ اس طرح ایک زندہ، جیتی جاگتی شخصیت کا موجود ہونا، اطاعت رسول کے لئے ضروری نہ رہا۔ اس طرح یہ اطاعتیں بھی دو اطاعتیں ہوگئیں۔ حالانکہ قرآن نے ان دو اطاعتوں کو ایک اطاعت قرار دیا تھا، اس کے لئے آیات اوپر درج کی جا چکی ہیں۔ مزید یہ کہ قرآن نے اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے 'سماعت' شرط قرار دی ہے۔ جس کے لئے مندرجہ ذیل آیات پیش خدمت ہیں۔ لیکن زندہ اتھارٹی کے موجود نہ ہونے سے سماعت کی شرط پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ روایات کی اطاعت کرنے میں سماعت کا ہونا ضروری نہیں ہوتا، اور یہی بات قرآن کے خلاف ہے۔

(۱) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2/285) اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم نے تیرا ارشاد سنا اور مان لیا۔ پروردگار ہمیں تیری ہی مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(۲) یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اے ایمان والو! خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو۔

(۳) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ

بَیْنَھُمْ اَنْ یَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24/51) ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو خدا اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کر دیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ (64/16) تو جہاں تک تم سے ہو سکے خدا سے ڈرتے رہو، اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اپنی بھلائی کے لئے ۔اب ہمارے موجودہ دور میں یہ صورت حال ہے کہ مسلمان خود اپنے نظریات وقوانین سے مطمئن نہیں ہیں ۔کیونکہ یہ بیشتر نظریات وقوانین ملوکیت کے دور کے وضع کردہ ہیں ۔نیز یہ کہ دنیا کے مصائب ونوائب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ساری دنیا اور خود مسلمان عقل انسانی کے بنائے ہوئے نظامہائے حیات سے تنگ آ گئے ہیں اور اسلامی نظام کے قیام کی کوششیں جگہ بہ جگہ جاری ہیں ۔لیکن اس نظام کے قیام میں مسلمانوں کے غلط نظریات رکاوٹ بن کر کھڑے ہو رہے ہیں ۔قرآن کریم کے نظریات کے مطابق ،کہیں بھی اور کبھی بھی ،اسلامی نظام قائم ہوگا ،اس کے سربراہ کو جانشین رسول کا درجہ حاصل ہوگا اور اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوگی ۔وہ ایک زندہ ،مرکزی اتھارٹی ہوگا ،اس کے احکام کی سماعت ہوگی اور اس کے بعد اس کی اطاعت ہوگی ۔لیکن وائے برحال ما کہ ہمارے علماء کرام کا نظریہ اس کے بالکل برعکس ہے اور ملوکیت کا ہی وضع کردہ نظریہ متداول ہے کہ روایات سے رسول اللہ کی اطاعت ہوتی ہے یہی خلاف قرآن نظریہ ،اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ بنتا ہے ۔کیونکہ قرآن وحدیث سے اللہ و رسول کی اطاعت کرنے کا عقیدہ خود ملوکیت کے دور کا وضع کردہ ہے ۔اس میں اسلام دین کی سطح سے گر کر پھر مذہب کی سطح پر آ جاتا ہے اور اس میں اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے نظام کی ضرورت باقی نہیں رہتی ،کیونکہ اس طرح تو آپ کسی ملک میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کر سکتے ہیں ۔اس طریقہ کے مطابق تو ہندوستان کے مسلمان بھی اللہ و رسول کی اطاعت کر سکتے ہیں ۔پھر نہ تو دین کے قیام کی ضرورت باقی رہتی ہے ،نہ ہی کسی

مرکزی اتھارٹی کی، اور نہ ہی مسلمانوں کے لئے اقتدار اور غلبہ کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ ہی اللہ کے وعدے پورے ہوسکتے ہیں، اور مسلمان پھر اسی گرداب میں ہمیشہ پھنسے رہیں گے۔

مسلمانوں کے مصائب ونوائب، پستی زبوں حالی، بدبختی وبدنصیبی، غربت وافلاس، کا واحد علاج ان کے دین کا قیام ہے۔ لیکن دین کا قیام اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک مسلمان اپنا عقیدہ قرآن کریم کے مطابق نہیں کرتے اور روایات کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت کے عقیدے کو نہیں چھوڑتے۔ یاد رکھئے کہ حدیث کا یہ مقام مذہب میں ہے۔ دین میں تو صرف قرآن کریم ضابطہ حیات قرار دیا جاتا ہے اور اسلامی قانون کا ماخذ (Source of Law) بھی صرف قرآن کریم ہوتا ہے۔ حدیث کا مقام صرف دین کی تاریخ ہے اور بس۔

مضمون آپ نے ملاحظہ فرمالیا۔ اس سلسلہ میں یہ تحریر کرنا ضروری ہے کہ مضمون سید قیصر علی صاحب کی مشہور کتاب "سب سے پہلے پاکستان، کیوں، کیسے، کاش" کے سلسلہ میں تحریر کیا گیا ہے۔ سید قیصر علی صاحب ملک کے معروف دانشمند اور مصنف ہیں۔ ان کی اس پُر مغز کتاب پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔ اس تقریب میں چند حضرات نے حصہ لیا اور اپنا اپنا موقف بیان فرمایا۔ محترم جناب سید قیصر علی صاحب نے اپنی اس کتاب میں سب سے زیادہ زور دین کے قیام پر ہی دیا ہے۔ لیکن دین کے قیام کے سلسلہ میں نہ تو انہوں نے اپنی کتاب میں کوئی وضاحت فرمائی اور نہ ہی احباب کی Discussion میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین کے قیام سے کیا مراد ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں اس کی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اسی تقریب میں گفتگو کے دوران متقی کی تعریف (Definition) بھی زیر بحث آئی میرے برادر محترم جناب حسین امیر فرہاد نے اس کی برموقع وضاحت فرمادی۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ ہمارے سامنے متقی کا تصور یہ آتا ہے کہ وہ تہجد گذار ہو، رورو کر نعتیں پڑھتا ہو، کئی حج وعمرے کرنے کے باوجود مزید حج وعمرہ کی سعادت سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہو۔ چہرہ

سے تقشت وتورع، تخشع وخضوع کا نہایت واضح اظہار ہورہا ہو، لیکن دین میں متقی وہ ہوتا ہے جو اسلامی حکومت کا مطیع وفرمانبردار ہو جو شخص جس وجہ اسلامی حکومت کا فرمانبردار ہوگا اسی وجہ وہ متقی ہوگا۔ اسلامی حکومت کی اطاعت ہی عبادت اور تقویٰ ہے۔

میرے محترم جناب سید قیصر علی صاحب نے حقوق العباد و حقوق اللہ کے بارے میں جو تحریر فرمایا ہے وہ بھی 'حدیث بے خبراں' ہے۔ قرآن کریم نے حقوق اللہ و حقوق العباد کی کوئی تقسیم نہیں کی ہے۔ البتہ ہمارے علماء کرام عیسائیت کی ثنویت سے متاثر ہو کر اس کے قائل ہو گئے ہیں۔ عیسائیت میں یہ نظریہ ہے کہ خدا کا حصہ خدا کو دو اور قیصر کا حصہ قیصر کو۔ لیکن اسلام میں اس کی کوئی تفریق نہیں ہے (70/24، 17/26) اور دیگر چند آیات کریمات میں حقوق العباد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں حقوق اللہ کا ذکر نہیں آیا ہے۔ البتہ صرف ایک جگہ **وآتوا حقه يوم حصاده** (6/142) آیا ہے۔ فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو یہ حق جسے خدا کا حق کہا گیا ہے وہ وہی ہے جو محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق ہے۔ جو اسلامی نظام کی معرفت ہی انہیں دیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں جہاں خدا کو قرض دینے کے لئے کہا گیا ہے وہ اسلامی نظام کو قرض دینا مراد ہے اسی طرح جہاں خدا کی مدد کرنا آتا ہے **إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ** (47/7) اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اس سے بھی اسلامی نظام کی مدد کرنا مراد ہے۔ اللہ کے حقوق وہی ہیں جو اسلامی نظام میں عوام کے حقوق ہیں۔ اور وہ ظاہر ہے کہ انسانوں کے باہمی حقوق ہیں۔ کیونکہ انسانوں کے باہمی حقوق کا ادا کرنا ہی دین ہے اور یہ حقوق وحی کے ذریعے مقرر ہوتے ہیں عقل انسانی، وحی کی ہدایت کے بغیر انسانی حقوق کا تعین نہیں کر سکتی۔ جہاں تک ارکان عبادت کا تعلق ہے۔ اسے عموماً حقوق اللہ شمار کیا جاتا ہے تو یہ ارکان عبادت بھی مقصود بالذات نہیں ہوتے۔ ان کا مقصد بھی اسلامی نظام کا قیام ہوتا ہے۔ یہ اس نظام کے ارکان ہوتے ہیں حدیث شریف میں آیا ہے **الصلوٰة عماد الدين** نماز دین کا ستون ہے۔ مقصود بالذات دین ہے، ستون نہیں ہے۔ جہاد صوم، زکوٰۃ، صلوٰۃ، ان سب ارکان کا مقصد قرآن کریم نے الگ الگ واضح طور پر قیام دین بتایا ہے۔ ارکان عبادت سے مقصود

دین کا قیام اور اس کے ذریعے انسانی حقوق کی ادائیگی ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی غیر ضروری نہیں ہوگا کہ سب سے پہلے پاکستان کا نظریہ و نعرہ نہایت ضروری ہے۔ ہمیں بھی پاکستان دل و جان سے عزیز ہے۔ لیکن قرآن کریم کے نزدیک وطن سے زیادہ عزیز دین کا قیام ہے۔ پاکستان ہمیں بے شک عزیز ہے، اور اس فعل سے اور بھی زیادہ عزیز ہو جاتا ہے کہ یہاں دین کے تمکن کا امکان ہے۔ لیکن اگر پاکستان میں دین کے تمکن کا امکان بالکل ختم ہو جائے، اور کسی اور جگہ دین کا نظام قائم ہو جائے، تو قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہمارے لئے وہ مقام زیادہ اہم و عزیز ہوگا۔ اور اس کی طرف ہجرت کرنا ضروری ہوگا۔ قیام پاکستان کی تحریک کے دوران اسی نظریہ کا نام ''معرکہ دین و وطن'' تھا۔ اور اسی نظریہ کے ماتحت انبیاء کرام ہجرت فرمایا کرتے تھے، اور اسی نظریہ کے مطابق حضورؐ نے ہجرت فرمائی تھی۔

=========☆☆☆=========

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک دن کنفیوشس اپنے چند شاگردوں کے ساتھ ایک کوہستانی علاقے میں سفر کرر ہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک قبر دیکھی جس کے ساتھ ایک عورت لپٹی آنسو بہا رہی تھی۔ کنفیوشس نے اس کے غم واندوہ کا سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کے بیٹے کو ایک شیر نے مار دیا تھا۔ عورت نے سسکیاں لیتے بتایا کہ اس سے قبل اس کا خاوند اور باپ بھی اسی شیر کی خونخواری کا شکار ہو چکے تھے۔ کنفیوشس نے حیران ہو کر پوچھا: تم نے ایسی خطرناک جگہ کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ عورت نے جواب دیا۔ کیونکہ یہاں کسی ظالم کی حکومت نہیں ہے۔ کنفیوشس اپنے شاگردوں سے مخاطب ہوا۔ دیکھو بچو! جابرانہ حکومت شیروں سے بھی زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

لندن سے جناب ناظر علی صاحب کے سوالات

اگرچہ ہمارا موجودہ دور مجموعی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے بڑی آزمائش وزبوں حالی کا دور ہے۔ لیکن بڑی ہی خوش آئند بات یہ ہے کہ صدرِ اول کے بعد پہلی مرتبہ قرآنِ خالص کی آواز بلند ہونی شروع ہوئی ہے۔ چونکہ یہ آواز مذہبی مسلمانوں کے نظریات کے خلاف ہے اور ان کے مخالف قرآن نظریات کی تردید کرتی ہے، اس لئے اس کی مخالفت ہونا بھی ضروری بات تھی۔ گذشتہ صدی میں مولوی عبداللہ صاحب کی نگرانی میں ایک رسالہ اشاعت القرآن، مسجد سریانوالہ، بازار، لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ جس کی ادارت مولوی حشمت علی صاحب دہلوی کرتے تھے۔ اور مالی تعاون شیخ محمد چٹو صاحب فرماتے تھے۔ یہ رسالہ اپنے وقت میں اہل قرآن حضرات میں بہت مقبول تھا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ یہ رسالہ علامہ اقبالؒ کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ اور ان کے مطبوعہ خطوط میں اس رسالہ کا ذکر موجود ہے۔ میں نے پنجاب پبلک لائبریری، لاہور سے اس رسالہ کی 1902ء، 1903ء کی نقول بہت مشکل سے حاصل کیں، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور اہل قرآن پر بڑی پریشانی کا دور تھا۔ اب الحمدللہ کہ وہ صورت نہیں رہی۔ اب پاکستان میں بڑی تعداد قرآنی حضرات کی ہے۔ اور رسالہ، صوت الحق، بلاغ القرآن، طلوعِ اسلام قرآنی قندیل کو روشن کیے ہوئے ہیں۔ اس سے زیادہ خوشی کی یہ بات ہے کہ پاکستان کے علاوہ بھی قرآنی نظریات دیگر ممالک میں خوب پھیل رہے ہیں۔ جس ملک میں بھی قرآنی احباب موجود ہیں وہ اس نور کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خصوصاً لندن میں بہت سے حضرات، اس نور کو پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ لندن میں بزم طلوعِ اسلام کے درس کا سلسلہ کیانی صاحب مرحوم کے گھر میں 1970ء میں ہی شروع ہوگیا تھا۔ اس کے بعد عرصہ دراز سے برادر محترم جناب فرحت مقبول صاحب لندن بزم کے نمائندے ہیں۔ لندن کے نارتھ میں محترم النقام جناب سید شاہد علی صاحب میرٹھی کے ہاں، ہر بدھ کے روز یہ شمع نورانی فروزاں ہوتی ہے۔

سید شاہد علی صاحب، مشہور شاعر اسماعیل میرٹھی کے عزیز ہیں، اور خود عالم دین ہیں۔ ان کے مضامین موقر رسالہ بلاغ القرآن میں طبع ہوتے رہتے ہیں جو بہت پسند کئے جاتے ہیں اور ان سے شاہد علی صاحب کی بالغ نظری ظاہر ہوتی ہے یہ وہ گھر ہیں جن کے متعلق قرآن کریم نے فرمایا ہے۔ فِیۡ بُیُوۡتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنۡ تُرۡفَعَ وَ یُذۡکَرَ فِیۡہَا اسۡمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیۡہَا بِالۡغُدُوِّ وَ الۡاٰصَالِ (24/36)۔ اس آیت کریمہ کا مفاد مفہوم القرآن میں اس طرح درج ہے "وحی خداوندی کا یہ چراغ (جماعت مومنین کے ان) گھروں میں روشن رہتا ہے جن میں خدا کی گوناگوں صفات (واحکام) کا چرچا رہتا ہے۔ اور جو اس طرح (قوانین خداوندی کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھنے سے) دنیا میں بلند مقام حاصل کر لیتے ہیں۔ ان گھروں کے رہنے والے صبح و شام (ہر وقت) نظام الٰہی کے قیام و بقاء کے لئے سرگرم عمل رہتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ ان گھروں اور ان گھروں کے مکینوں کی خوش قسمتی پر جس قدر بھی فخر و رشک کیا جائے کم ہے۔ انہی گھروں میں سے ایک گھر سید ناظر علی صاحب کا ہے، جنہوں نے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرمایا ہے کہ "ہم نے قرآن کریم کے مطالعہ کے لئے اعلیٰ پڑھے لکھے افراد کا ایک حلقہ بنایا ہے۔" قرآن فہمی کے سلسلہ میں ہی جناب ممدوح نے مندرجہ ذیل چار سوالات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ سوالات سورۃ بقرہ کی ان آیات سے متعلق ہیں۔ فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ ؕ فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَہُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ ؕ وَ اَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ (2/184) پھر جو کوئی تم میں سے بیمار ہو یا مسافر تو اس پر ان کی گنتی ہے اور دنوں سے اور جن کو طاقت ہے روزہ کی ان کے ذمہ بدلا ہے ایک فقیر کا کھانا پھر جو کوئی خوشی سے کرے نیکی تو اچھا ہے اس کے لئے اور روزہ رکھو تو بہتر ہے تمہارے لئے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہند)

عزیز مکرم جناب سید ناظر علی صاحب نے یہ سوالات تحریر فرمائے ہیں۔

(1) کیا مسافر اور عارضی مریض کو یہ سہولت ہے کہ وہ قضا روزوں کے بدلے فدیہ ایک مسکین کو کھانا دے یا روزے بھی بعد میں مکمل کرے۔ (2) **یطیقونہ** کن افراد کے لئے آیا ہے وہ جو طاقت رکھتے ہیں مگر روزے نہیں رکھتے یا مریض کو شفایاب ہونے کے بعد اور مسافر کو سفر سے فرصت پانے کے بعد جو طاقت آتی ہے۔

(3) کئی مفسرین نے آیت کے اس حصے عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ کو منسوخ قرار دیا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ وہ کونسی آیت ہے جس سے آیت کا حصہ منسوخ ہوا ہے۔

(4) آخری سوال یہ ہے کہ ایک تندرست لیکن سخت محنت کا کام کرنے والا جس آمدنی سے اپنے گھر والوں کی روٹی بھی پوری نہیں کرسکتا وہ رمضان کے فرض روزے کس طرح پورے کرے گا؟۔

جوابات پیش خدمت عالی کیئے جاتے ہیں۔

(1) عزیز محترم کا پہلا سوال واضح ہے۔ آیت کے الفاظ اس درجہ واضح ہیں کہ کسی تفسیر یا تاویل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اگر کوئی شخص بیمار ہے یا حالت سفر میں ہے تو وہ صحت یاب ہونے یا سفر سے واپس آنے کے بعد، یہ مدت پوری کرے۔ ان دونوں صورتوں میں فدیہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) دوسرے سوال کے متعلق ہمارے مفسرین کرام نے بہت طویل و عریض بحث لکھی ہے۔ میرے پاس اس وقت بیضاوی شریف نہیں ہے لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ قاضی صاحب نے بیضاوی شریف میں **یطیقونہ** سے پیشتر لا محذوف مانا ہے اور مفہوم یہ کیا ہے کہ جو طاقت نہ رکھتے ہوں وہ فدیہ دے دیں۔ لیکن یہ دور از کار تاویل ہے کیونکہ یہاں کوئی قرینہ لا محذوف ماننے کا نہیں ہے اور اس طرح لا محذوف ماننے سے قرآن کی عبارت میں اضافہ ہوتا ہے جو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ کچھ مفسرین کرام نے **یطیقونہ** کی ضمیر مفعول کا مرجع صوم کے بجائے طعام کو قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی یہی تاویل کی ہے اور اس ضمیر کو ضمیر شان قرار دیا ہے جس سے اصل عبارت یوں بنتی ہے عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ اور جو لوگ مسکین کو کھانا کھلا سکتے ہوں تو ان کے لئے بطور فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔ لیکن یہ بھی مفسرین کی ایک تاویل ہے اور اس سے اضمار قبل الذکر ماننا پڑتا ہے جو کلام کا ایک ایسا عیب ہے جو قرآن میں نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ آیت کا یہ حصہ جملہ مستانفہ ہے۔ اس حصہ کا آیت کے سابقہ حصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں ایک نئی صورت حال کا بیان ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص نہ تو بیمار ہے اور نہ ہی مسافر ہے۔ لیکن وہ یا تو جسمانی طور پر بہت کمزور ہے یا اس کی ڈیوٹی اس

درجہ محنت طلب ہے کہ وہ بھوکا پیاسا اپنی ڈیوٹی ادا نہیں کرسکتا۔ یا کوئی حاملہ عورت ہے۔ یا وہ شخص بہت بوڑھا ہے اور روزہ کی صعوبت برداشت نہیں کرسکتا تو ایسے حضرات کے لئے ایک رخصت ہے کہ وہ روزوں کا فدیہ ادا کردیں۔ انہیں پھر روزے رکھنے نہیں ہوں گے۔ کیونکہ انہیں روزوں کی قوت نہیں ہوسکتی۔ لیکن یہ حالت ہر ایک کی الگ الگ ہوتی ہے اور انسان خود ہی اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کس حالت میں ہے۔ اگر ان مذکورہ بالا کمزوریوں کے باوجود وہ ہمت کرکے روزہ رکھ لیں تو ان کے لئے ارشاد ہوا کہ **فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ**۔ اگر وہ خیر کریں تو یہ خیر ان کے لئے ہے اور بہر حال فدیہ روزہ کا بدل نہیں ہوسکتا اس لئے کہ **وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ**۔

(3) نسخ کا عقیدہ قرآن کے خلاف ہے۔ مندرجہ بالا آیات کریمات کا جو مفہوم عرض کیا گیا ہے اس میں نسخ کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ہمارے مفسرین نے روایات کے زیر اثر آیات کا غلط مفہوم اخذ کیا، اس لئے انہیں مجبوراً نسخ کا سہارا لینا پڑا۔ جو بحث انہوں نے یہاں نسخ کی کی ہے وہ طویل بھی ہے اور ژولیدہ بھی، اس لئے اس کو یہاں نقل نہیں کیا جاتا۔

(4) اگر کوئی شخص کمزوری کی وجہ سے روزہ نہیں رکھ سکتا، اس کا مسئلہ تو تحریر کردیا گیا ہے اور افلاس کی وجہ سے فدیہ نہیں دے سکتا تو ظاہر ہے بوجہ عدم استطاعت تو دونوں کاموں سے محروم ہے۔ اس لئے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

سرخیل علماء اہل قرآن، سرتاج مفسرین، محترم جناب خواجہ احمد الدین صاحب امرتسری مرحوم نے اپنی مشہور زمانہ تفسیر "بیان للناس" میں روزہ کے سلسلہ میں دو فارسی اشعار نقل فرمائے ہیں۔ ہمارے سابقہ علماء جب بھی عربی و فارسی کے اشعار درج کرتے تھے تو وہ ان کا ترجمہ نہیں لکھتے تھے، اس دور میں عموماً لوگ تھوڑی بہت فارسی جانتے تھے، اس لئے وہ علماء یہ PRESUME کرتے تھے کہ ان کا ہر قاری یہ اشعار سمجھ لے گا۔ آپ "غبار خاطر" مطالعہ فرمائیں۔ اس میں بڑی کثرت سے عربی و فارسی کے اعلیٰ اشعار دیئے گئے ہیں۔ لیکن ترجمہ ایک کا بھی نہیں ہے، اسی روش کے مطابق خواجہ صاحب نے بھی ترجمہ نہیں لکھا ہے۔ چونکہ لندن والے سب ہی فارسی نہیں جانتے ہوں گے اس لئے ان کا ترجمہ پیش خدمتِ عالی ہے۔

چوں کم خوردن طبیعت شد کسے را | چو سختی پیشش آید سہل گیرد
وگر تن پرور است اندر فراخی | چوں تنگی بیند از سختی بمیرد

(ترجمہ)، اگر کسی شخص کو کم کھانے کی عادت ہوجائے تو وہ سختی کو بآسانی برداشت کرلیتا ہے۔ لیکن جو شخص آسان زندگی میں بھی تن پرور ہے تو وہ سختی، جب وہ مصیبت سے دوچار ہوتا ہے اس سختی کی وجہ سے مرجاتا ہے۔ روزہ، روزہ دار کی طبیعت میں صلابت، اور برداشت کا مادہ پیدا کرتا ہے۔ قرآن کریم نے روزے کے جو نتائج بیان فرمائے ہیں وہ الگ موضوع ہے اور وہ نتائج اس وقت برآمد نہیں ہورہے ہیں۔ وہ نتائج تو اسلامی حکومت میں ہی برآمد ہوتے ہیں۔

$$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $$ $$$ $

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

زندگی کا وقوعہ ختم ہوچکا ہے، ایک اکتا دینے والی یکسانیت ہمارے حواس میں سرایت کرگئی ہے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روحانی زندگی کا رتق ہمارے وجود سے رخصت ہوگیا ہے، ایسا لگتا ہے گویا ہر لحہ ہمارے اندرون میں ایک اجنبی وحشی پروان چڑھ رہا ہو۔ مغرب میں خدا کی موت کا اعلان بالآخر انسان کی اپنی موت پر منتج ہوا۔ انسان کے اندرون میں انسان نے دم توڑ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں جمہوریت اور فسطائیت ایک ہی چیز کے دو نام سمجھے جاتے ہیں۔ جمہوریت نے اپنے طویل سفر میں سرمایہ داروں کی بھرپور معاونت کی۔ اسی کے سہارے مختلف جمہوریتوں میں موروثی خاندانی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ کبھی اس نے فوجی آمروں کو جواز فراہم کیا تو کبھی کھلی فسطائیت جمہوری تماشے کا حصہ سمجھی گئی۔ یہ تمام نظریئے بنیادی طور پر انسان کی تقدیس سے عبارت تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلامی اصول فقہ پر ایک نظر

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ آج کل حدود آرڈیننس کے بارے میں ملک میں ایک عام بحث چل رہی ہے۔ اس بحث کی ابتداء ٹی وی کے مشہور چینل "جیو" نے کی ہے۔ یہ چینل اس لحاظ سے قابل مبارکباد ہے کہ اس نے ہماری جیسی مردہ قوم میں اس مسئلہ پر غور وفکر کرنے کی دعوت دی ہے اور مورخہ 11 جون کو اس چینل پر ایک LIVE مباحثہ بھی پیش کیا گیا جس میں ملک کے مشہور علماء نے حصہ لیا، چند امور پر ان علماء کرام کا اتفاق رائے بھی ہوا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ اس ساری بحث میں رجم اور زنا کے بارے میں چار گواہوں کی شہادت کو برقرار کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہ دونوں امور قرآن کریم کے خلاف ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلامی قانون سازی کے بارے میں دو باتیں بہت غور طلب ہیں۔ جن کے واضح نہ ہونے کی وجہ سے ہی حدود آرڈیننس میں اسقام وخامیاں واقع ہوئی ہیں اور جب تک یہ دونوں امور واضح نہیں ہوں گے، آئندہ بھی اس بات کا یقین ہے کہ قانون سازی کسی طور پر بھی درست نہیں ہو سکتی۔

(1) پہلی اور بنیادی بات تو یہ ہے کہ کیا قانون سازی کے ماخذ SOURCE OF LAW صرف قرآن کریم ہے، یا حدیث شریف بھی قانون کا ماخذ ہے۔

(2) دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث شریف بھی قانون سازی کا ماخذ ہے تو ایسے قوانین جو قرآن کے خلاف اور حدیث کے مطابق ہیں، ان میں حکومت کیا موقف اختیار کرے گی۔ یعنی اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کے دونوں ماخذوں میں باہم تضاد وتخالف ہو تو حکومت کس ماخذ کو اختیار کرے گی؟۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صرف قرآن اسلامی قانون کا ماخذ ہے اور

حدیث اسلامی قانون کا ماخذ نہیں ہو سکتی تو اس بارے میں تو قرآن کا حکم ایسا واضح ہے کہ اس میں دو آراء نہیں ہو سکتیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے اِوَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5/44) اور جو کوئی بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے اسی مضمون کو قرآن کریم بار بار دُہراتا ہے کہ جو کوئی بھی منزل من اللہ کے مطابق فیصلہ نہ کرے تو وہ کافر ہے۔ یا اگر کوئی شخص منزل من اللہ میں کوئی اضافہ یا تخفیف کردے اور اس کے مطابق فیصلہ کرے تو وہ کافر و مشرک ہے۔ فیصلہ تو صرف ما انزل اللہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ صرف اور صرف ما انزل اللہ ہی قانون کا ماخذ ہے۔ چونکہ اس موضوع کی آیات اس قدر واضح اور کثرت سے ہیں، اس لئے ہمارے علماء کرام بھی اس سے تو انکار نہیں کر سکتے کہ قانون کا ماخذ صرف ما انزل اللہ ہے۔ اس معاملہ میں ہمارا اور ان کا صد فیصد اتفاق ہے۔ لیکن وہ ما انزل اللہ میں قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث شریف کو بھی شامل کر لیتے ہیں اور اس طرح اس ترکیب سے وہ حدیث کو ماخذ قانون قرار دے لیتے ہیں۔ اب ثابت یہ کرنا ہے کہ ما انزل اللہ صرف قرآن ہے اور حدیث شریف اس میں شامل نہیں ہے۔ اس کی تائید و وضاحت کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ وَ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ مِنَ الْکِتٰبِ وَ مُھَیْمِنًا عَلَیْہِ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ (5/48) اور ہم نے تیری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری جو گذشتہ کتابوں کی مصدق ہے اور سب پر شامل ہے، پس تو ان میں حکم کر اس کے مطابق جو کچھ اتارا اللہ نے۔ اس آیہ کریمہ نے خود ما انزل اللہ کی وضاحت کتاب سے کردی ہے کہ ما انزل اللہ صرف کتاب ہے جس کے مطابق حکم کرنا لازمی ہے اور اس کے علاوہ ما انزل اللہ میں کوئی اور چیز شامل نہیں ہے۔ نیز سورہ رعد میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ (13/36)، اور جن کو ہم نے کتاب دی ہے خوش ہوتے ہیں اس سے جو اترا تیری طرف (موضح القرآن) اس آیہ کریمہ نے تو بات ہی بالکل واضح فرمادی کہ انزل الیک کی وضاحت کتاب سے کردی۔ یہاں کتاب اور انزل الیک ایک دوسرے کا بدل اور مبدل منہ واقع ہوئے

ہیں۔یعنی جو کتاب ہے وہی انزل الیک ہے اور جو کچھ بھی انزل الیک ہے وہ صرف کتاب ہے اور کوئی چیز اس میں شامل نہیں ہے۔ اس موضوع پر کہ ما انزل اللہ صرف قرآن ہے اور حدیث شریف اس میں شامل نہیں ہے۔ اس لئے ان ہی دو آیات پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس بارے میں رسالہ 'صوت الحق' میں اس قدر مواد فراہم کیا گیا ہے کہ اس کو یہاں دوبارہ تحریر کرنا، اسی مواد کو دوبارہ دُہرانا ہے اور قارئین کا وقت ضائع کرنا ہے۔

صرف قرآن کو ہی منزل من اللہ ثابت کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قانون کا ماخذ صرف قرآن ہے اور حدیث قرآن کا ماخذ نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک دوسری بات کا تعلق ہے کہ وہ امور جو قرآن کے خلاف ہیں اور حدیث کے مطابق ہیں، اور جن امور کے متعلق خود ان دونوں ماخذ میں تضاد و تخالف ہے، ان میں حکومت یا ہمارے علماء کرام کیا موقف اختیار کرتے ہیں؟ اس بارے میں صرف چند موضوعات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔

(1) رجم (2) قتل مرتد (3) محجوب الارث (4) وصیت و وراثت (5) فرقہ بندی۔ ان میں سے ہر مسئلہ قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور حدیث شریف کے مطابق ہے اور ان سب مسائل کی اساس صرف احادیث پر ہے۔ جہاں تک پہلے دو موضوعات یعنی رجم اور قتل مرتد کا تعلق ہے، ان دونوں موضوعات پر راقم سطور کے مضامین موقر ماہنامہ 'صوت الحق' بابت اگست 06 میں اور طلوع اسلام اگست (06) میں علی الترتیب طبع ہو چکے ہیں۔ جن حضرات کی نظر سے یہ دونوں رسالے گذرتے ہیں انہوں نے یہ دونوں مضامین ان رسالوں میں ملاحظہ فرمالئے ہوں گے ان دونوں موضوعات پر دوبارہ تحریر کرنا قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ ان دونوں مضامین میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ دونوں مسئلے قرآن کریم کے خلاف اور احادیث کے مطابق ہیں۔ ان دونوں مسائل میں ہمارے علماء کرام نے واضح مسلک قرآن کے خلاف اور حدیث کے مطابق اختیار کیا ہے۔

تاہم ان دونوں مسائل، یعنی رجم اور قتل مرتد کے بارے میں ایک اقتباس اپنے مضمون ارتداد سے پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے، جس سے ان دونوں نظریات کی تردید ہو جاتی ہے کہ ان پر مزید کچھ تحریر کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

وھو ھٰذ.......... "ارشاد ہوتا ہے" مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا" (5/32) "تفسیر شہیر" تدبر قرآن" میں اس کا ترجمہ تحریر ہے "جس کسی نے قتل کیا بغیر اس کے کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو یا ملک میں فساد برپا کیا ہو تو گویا اس نے سب کو قتل کر دیا"۔ حضرت اقدس جناب شیخ الہند نے ترجمہ فرمایا "جو کوئی قتل کرے ایک جان کو بلا عوض ایک جان کے یا بغیر فساد کرنے کے ملک میں، تو گویا قتل کر ڈالا اس نے سب لوگوں کو"۔ تمام تراجم اسی طرح ہیں، اور واضح ہیں کوئی ابہام نہیں ہے۔ میں اس کا ترجمہ مزید آسان اور واضح عرض کرتا ہوں "جو کسی ایسے شخص کو قتل کرے گا جس نے نہ تو کسی کو قتل کیا ہو، اور نہ ہی زمین میں کوئی فساد پھیلایا ہو، تو گویا اس نے سب لوگوں کو قتل کر ڈالا"۔ یہ آیہ مبارکہ بطور ایک واضح اصول کے نہایت روشن و درخشندہ ہے۔ اس آیہ کریمہ میں کسی ایک فرد کو قتل کرنے کو ساری انسانیت کے قتل کے مرادف بیان کیا گیا ہے اور قتل کی حد درجہ مذمت کر دی ہے اس سے زیادہ پُر زور FORCEFUL انداز شاید ہی کوئی دوسرا ہو سکے۔ لیکن کسی کو بھی قتل نہ کرنے کے سلسلہ میں یہاں صرف دو استثناء EXCEPTIONS کی گئی ہیں ایک تو قاتل کو قتل کے بدلے میں قتل کرنے کی اجازت ہے (6/153)، اور دوسرے باغی کو بغاوت کے جرم میں قتل کرنے کی اجازت ہے (5/53) اس آیہ کریمہ کی یہ دونوں رُخصتیں (اجازتیں) آیات (6/153، 5/33) میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اور کسی حال میں بھی، کسی جرم کے بدلے، کسی فرد کو قتل نہیں کیا جا سکتا، اس آیت نے ایک ایسا حصار قائم کر دیا ہے کہ جس کو کسی حال میں بھی توڑا نہیں جا سکتا۔ اس آیہ کریمہ کے پیش نظر ان دو افراد (قاتل و باغی) کے علاوہ کسی کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ فلہٰذا مرتد و زانی کا قتل قرآن کے خلاف ہے اور کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے اس آیہ کریمہ سے قتل مرتد رجم دونوں کی تردید ہو جاتی ہے۔

3۔ مجوب الارث کا مفہوم یہ ہے کہ یتیم پوتے کو اس کے دادا کی میراث سے، چچا کی موجودگی کی وجہ سے، محروم کر دیا جاتا ہے حالانکہ قرآن کریم میں ایسی آیات بکثرت موجود ہیں جن میں یتیموں کی حفاظت، ان کی سرپرستی، اور ان سے حُسن سلوک کرنے کی

طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ خود سورۃ النساء کی ان آیات میں جن میں تقسیم میراث کے تفصیلی احکامات بیان کیے گئے ہیں، ان میں بھی اصل احکام بیان کرنے سے پیشتر بطور مقدمہ سلسلہ بیان یتیموں کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یتیموں کے بارے میں قرآن کریم جو SOFT-CORNER رکھتا ہے، اس کے پیش نظر یتیم پوتے کو محروم الارث کرنا، اسلامی مزاج، اسلامی روح اور اسلام کے عدل وانصاف سے مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ قانون اسلام کے دیگر قوانین میں بالکل بے جوڑ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام کے دیگر عادلانہ اصول واحکام تو یتیموں کے ساتھ محبت وشفقت کرنے اور ان کے حقوق کی حفاظت کرنے کی تاکید کرتے ہیں۔ اس بارے میں مسدس حالی کے مشہور اشعار اسلامی ذہن وجذبہ کی پوری پوری ترجمانی وعکاسی کرتے ہیں، اور حضورؐ کی یتیموں کے بارے میں محبت وشفقت کو بیان کرتے ہیں۔

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا — مرادیں غریبوں کی بر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا — وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجاء یتیموں کا ماویٰ — ضعیفوں کا حامی، غلاموں کا مولا

محجوب الارث کا مسئلہ خالص فنی اور TECHNICAL ہے۔ ایک LAY MAN اس مسئلہ کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔ اس مسئلہ پر اسی وقت گرفت ہو سکتی ہے۔ جبکہ کوئی شخص علم الفرائض اور سراجی پر خوب مہارت رکھتا ہو۔ اس لئے اس مسئلہ پر اس سے زیادہ اس مضمون میں کچھ تحریر کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ جن حضرات کو اس سے دلچسپی ہو وہ تحریک طلوع اسلام اور فرقہ اہل قرآن کا فراہم کردہ لٹریچر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ فرقہ اہل قرآن تقریباً سو سال سے اس موضوع پر لکھتا چلا آرہا ہے البتہ یہاں ہم اپنی تائید میں جناب مولانا مودودی صاحب کا ایک اقتباس پیش کرنے پر اکتفاء کرتے ہیں جس سے ہماری بحث کہ اگر قرآن وحدیث میں تضاد ومخالف ہو۔ تو کیا صورت اختیار کی جائے، اس موضوع کی اصولی طور پر تائید ہوتی ہے کہ قرآن کریم سے محجوب لارث کی کوئی اصل ثابت نہیں ہوتی، یہ نظریہ قرآن کے خلاف محض حدیث پر مبنی ہے۔

"فقہائے اسلام" میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو، وہ وارث نہیں ہوتا، بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اس میں شیعوں کے سوا کسی نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن وحدیث میں ایسا صریح حکم نہیں ملا ہے جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلے کی بناء قرار دیا جاسکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں اس کو اتنا قوی کردیتی ہے کہ اس کے خلاف رائے دینا مشکل ہے" (ترجمان القرآن، مارچ 1953ء)

یہ بیان بالکل واضح ہے اور اس بیان سے یہ خوشی ہوتی ہے کہ مولانا صاحب مرحوم نے اس معاملہ میں نہایت درجہ دیانتداری سے کام لے کر، اس بات کا اعتراف کرلیا ہے کہ اس مسئلہ کی بنیاد قرآن کریم پر نہیں ہے۔ البتہ اس بات پر حیرت ہوتی ہے ان جیسا عالم اُنہیں شیعوں کی معلومات اس درجہ محدود تھیں کہ انہوں نے شیعوں کو اس مسئلہ میں مستثنیٰ کردیا ہے۔ جبکہ شیعوں کے ہاں بھی مجوب الارث کا مسئلہ درست قرار دیا جاتا ہے۔ وہ بھی اپنے یتیم پوتوں اور یتیم نواسوں کو جائیداد سے محروم کردیتے ہیں۔ حیرت ہے کہ مولانا نے یہ بات کیسے تحریر فرمادی۔

4۔ جہاں تک وصیت کا تعلق ہے تو ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ اپنی چھوڑی ہوئی جائیداد کے متعلق وصیت کردے یہ وصیت اس کے پورے مال کے متعلق ہونی چاہیے اور ہر اس شخص کے لئے ہونی چاہئے جسے وہ اپنے ترکہ میں سے کچھ دینا چاہتا ہے۔ اس میں وارث اور غیر وارث کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ لیکن ہمارے علمائے کرام (1) ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ (2) نیز وہ ورثاء کے لئے وصیت کرنے کو بھی جائز نہیں سمجھتے۔ وہ وصیت صرف غیر ورثاء کے حق میں کرنے کو جائز گردانتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں پابندیاں جو ہمارے علماء کرام نے عائد کی ہیں وہ قرآن کے خلاف ہیں۔ ان دونوں پابندیوں کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس آیہ کریمہ میں پہلے کُتب علیکم بیان کیا گیا ہے یعنی تم پر یہ بات فرض ہے اور آیت کے بالکل آخر میں حقا علی

المتقین فرما کر یہ تاکید مزید کی گئی ہے کہ تمام مومنین پر وصیت کرنا لازمی وضروری ہے۔ نیز یہ بات بھی واضح فرمادی ہے کہ ترکہ کے پورے کے پورے مال کے لئے وصیت کو فرض قرار دیا گیا ہے اور والدین اور اقربا کو اس آیت میں شامل کرکے، اس بات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ وصیت ورثاء کے حق میں بھی ہوسکتی ہے اور علماء کرام کے اس نظریہ کی تغلیط کردی کہ ورثاء کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی۔

اصل یہ ہے کہ ان دونوں خلافِ قرآن عقیدوں کو ہمارے علماء کرام نے دو وجوہات کی بناء پر اختیار کیا ہوا ہے۔ پہلے عقیدہ کے متعلق ان کا نظریہ یہ ہے کہ وصیت کی آیات منسوخ ہوچکی ہیں۔ لیکن ان کا یہ دعویٰ خود قرآن کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کریم میں جہاں وراثت کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں وہ سورہ النساء کی صرف دو آیتیں ہیں (4/12-11)، اور ان دونوں آیتوں کے بعد مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِىْ بِهَآ اَوْ دَيْنٍ (اور یہ سب) میت نے جس کے بارے میں وصیت کی ہے اس کی تعمیل اور ادائے قرض کے بعد، چار مرتبہ وصیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ میراث کی یہ تقسیم متوفی کی وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد عمل میں لائی جائے گی۔ اگر وصیت کا حکم منسوخ ہوچکا ہوتا تو ان میراث کی آیات میں چار مرتبہ وصیت کے حکم کا اعادہ نہ کیا جاتا۔ خود آیات میراث میں وصیت کو پورا کرنے کی چار مرتبہ تاکید کرنا صاف بتا رہا ہے کہ وراثت کی آیات نے وصیت کے حکم کو منسوخ نہیں کیا ہے بلکہ اس کو باقی رکھا ہے۔ جہاں تک دوسرا مسئلہ ہے کہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہوسکتی ہے تو اس کے لئے علماء کرام کے پاس ایک حدیث کہ **لا وصية لوارث**، وہ اس نظریہ کی اساس اس حدیث پر رکھتے ہیں۔ جو خلاف قرآن ہے اور یہاں پھر وہی مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کے دونوں ماخذوں میں تضاد وتخالف ہے۔

واضح رہے کہ ہم نے اوپر جو کچھ وصیت کے بارے میں دلیل تحریر کی ہے کہ اس کے احکام منسوخ نہیں ہوئے ہیں وہ صرف علماء کرام کے لئے تحریر کی ہے۔ جو نسخ کے قائل ہیں۔ ورنہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو ہمارے نزدیک تو نسخ آیات کا عقیدہ ہی قرآن کے خلاف ہے۔

5۔ پانچواں مسئلہ جو قرآن کریم کے خلاف اور سنت وفقہ کے مطابق ہے اور جس نے مسلمانوں کی تباہی وبربادی میں سب سے زیادہ حصہ لیا ہے وہ ہماری فرقہ بندی ہے۔ قرآن کریم کی نص صریح کے مطابق فرقہ بندی شرک ہے۔

وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا

(30/30-31) اور شرک کرنے والوں میں سے نہ ہوجانا کہ انہوں نے اپنے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور بہت سے گروہ ہوگئے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6/159)۔ بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کردیا اور گروہ بن گئے، آپ سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مزید ارشاد ہوتا ہے ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاء ھم البینٰت اولٰئک لھم عذابٌ الیم (3/104)۔ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت آنے کے بعد آپس میں تفرقہ اور اختلاف پیدا کرلیا۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا (3/103)۔ تم سب مل کے قرآن کریم کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور فرقوں میں تقسیم نہ ہوجانا۔ فرقہ بندی کے خلاف قرآن کریم میں اس کے علاوہ بھی اور بہت سی آیات ہیں۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ ہمارے علماء کرام اس کے خلاف ایک لفظ نہیں بولتے۔ کیونکہ یہ حدیث وفقہ کے مطابق ہے۔ فرقہ بندی کے خلاف سب سے پہلے طلوع اسلام نے آواز بلند کی تھی۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل (1) 277 میں درج ہے "تمام موجودہ قوانین کو اسلام احکام کے مطابق وضع کیا جائے گا جو قرآن وسنت میں مذکور ہیں اور کوئی ایسا قانون وضع نہیں کیا جائے گا جو ان کے احکام کے خلاف ہو" آرٹیکل کے پیش نظر پھر اسی دشواری سے دوچار ہونا پڑتا ہے کہ فرقہ بندی حدیث کے مطابق ہے لیکن قرآن کے خلاف ہے۔ اس میں حکومت نے پھر قرآن کو چھوڑ دیا اور سنت کی پیروی کی۔ نہ صرف یہ کہ حدیث کی پیروی کی بلکہ صدارتی حکم نمبر 14، مجریہ 18 ستمبر 1980 میں ان قوانین کے سلسلہ میں مزید ترمیم ان الفاظ میں کردی گئی ہے۔ وضاحت۔ جب ان قوانین کا اطلاق مسلمانوں

کے کسی فرقہ کے پرسنل لا (شخصی قوانین) پر ہوگا تو قرآن وسنت سے مراد اس فرقہ کی اپنی تعبیر ہوگی'۔

دستور کی شق نمبر (1) 277 کی اس ترمیم سے فرقہ بندی کو پورا پورا آئینی تحفظ مل گیا۔ جس سے عملاً دو دشواریاں پیدا ہوں گی۔ پہلی دشواری یہ کہ ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے مختلف فرقوں کے لئے شخصی قوانین کی حد تک مختلف قوانین وضع ہوں گے۔ اس طرح ایک ہی ملک میں کئی قوانین کا نفاذ ہوگا۔ دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اس طرح پرسنل لاء اور پبلک لاء میں قوانین تقسیم کر دیئے گئے۔ اسلامی حکومت میں پبلک لاء اور پرسنل لاء کی تفریق بالکل غیر قرآنی ہے۔ یہ تفریق تو سیکولر حکومتوں میں ہوتی ہے جہاں پبلک لاء تو سیکولر ہوتے ہیں، لیکن پرسنل لاء جاری کرنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ جب حکومت ہی اسلامی ہو، تو وہاں پرسنل اور پبلک لاء کی تفریق نہیں ہوتی۔

فرقہ بندی کے سلسلہ میں یہ دشواری ہے کہ ہمارے علمائے کرام تو فرقہ بندی کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ تو خود فرقہ بندی کی پیداوار ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہر فرقہ کو چاہیئے کہ رواداری سے کام لے۔ لیکن جب فرقہ بن جاتا ہے تو رواداری از خود ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ کیونکہ فرقہ تو قائم ہی اس وقت تک رہتا ہے جب مختلف فیہ اور متنازع فیہ امور کو ہوا دی جاتی ہے۔ اگر ان مختلف فیہ امور کو ہوا نہ دی جائے اور ان کو نظر انداز کر کے متفق علیہ اور مجتمع فیہ مسائل ونظریات کو پھیلایا جائے تو پھر فرقہ باقی کیسے رہ سکتا ہے؟ یہ مضمون تو اس غرض کے پیش نظر تحریر کیا گیا تھا کہ یہ دکھایا جائے کہ اگر کسی مسئلہ میں قرآن وحدیث کا ہی باہم اتفاق نہ ہو تو پھر علماء کرام اور حکومت وقت کیا موقف اختیار کرے گی۔ اس مضمون میں یہاں تک یہ بات پانچ موضوعات کے ذریعہ واضح کر دی گئی ہے کہ ہمارے علماء کرام اور ہماری حکومت نے اس بارے میں قرآن کریم کو نظر انداز کر کے، حدیث پر عمل کرنے کو ترجیح دی ہے۔

فرقہ بندی کے نقصانات کے سلسلہ میں اپنے قارئین کرام کے ازدیاد علم کے لئے ایک اور بات کا اضافہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا کہ پروفیسر

MR. SAMUEL. P. HUNTINGTON جو ہارورڈ یونیورسٹی میں ایک معروف پروفیسر ہیں، ان کا ایک مضمون THE CLASH OF CIVILIZATION ایک مشہور رسالہ GFOREIGA AFFAIRS کے SUMMER 1993 کے ایشو میں طبع ہوا تھا اس مضمون نے بہت شہرت پائی۔

ایک تو صاحب مضمون معروف شخصیت ہیں دوسرے مضمون کا موضوع پر کشش ہے اور مضمون بھی علمی اعتبار سے بلند پایہ ہے۔ ملخص اس مضمون کا یہ ہے کہ دنیا میں آئندہ جو تصادم ہوگا وہ تہذیبوں کا ہوگا۔ ایک طرف مسلمان اور کنفوشش کے پیروکار یعنی چینی وغیرہ ہوں گے اور دوسری طرف مغربی تہذیب ہوگی۔ مضمون پُر مغز ہے اور پروفیسر صاحب موصوف نے تاریخی حوالہ جات وواقعات پیش کرنے کے بعد اپنے نظریہ کو بخوبی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو کچھ ڈاکٹر صاحب موصوف نے تحریر فرمایا ہے زیر نظر مضمون کو اس کی صحت وسُقم سے کوئی تعرض نہیں ہے۔ اس زیر تسوید مضمون کا جس بات سے تعلق ہے اور جو بات قارئین کرام کی خدمت عالیہ میں پیش کی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ مضمون کے بالکل آخر میں انہوں نے دیگر سات مشورے دینے کے علاوہ یہ مشورہ بھی دیا ہے کہ مغرب کو چاہئے کہ اپنی تہذیب کو ترقی دے اور خاص طور پر شمالی امریکہ، لاطینی امریکہ اور مشرقی یورپ کی تہذیبوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھے اور جاپان اور روس سے بھی تعاون پر مبنی تعلقات کو فروغ دے ان مختلف تجاویز کے بعد اصل بات جو انہوں نے تحریر کی ہے اور جس کے لئے اس مضمون کا حوالہ دینا ضروری سمجھا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

TO EXPLOIT DIFFERENCES AND CONFLICTS AMONG CONFUCIAN AND ISLAMIS STATES

کنفوشش کے پیروکاروں اور اسلامی حکومتوں میں آپس کے اختلافات سے ہمیں فائدہ اٹھانا چاہئے۔ یعنی کنفوشش کے پیروکاروں میں جو باہمی اختلافات ہیں ان کو فروغ دینا چاہیے اور مسلم ممالک کے باشندوں میں جو باہمی اختلافات ومناقشات ہیں ان سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

واضح رہے کہ جن حضرات نے اس عبارت کا یہ مفہوم لیا ہے کہ کنفوشش کے پیروکاروں اور مسلمانوں کے اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے تو انہوں نے اس عبارت کا

مفہوم غلط سمجھا ہے۔ اس عبارت کا درست مفہوم یہ ہے کہ کھوشش کے پیروکاروں کے اپنے باہمی اختلافات اور مسلمانوں کے اپنے باہمی (فرقہ وارانہ اختلافات۔ از راقم سطور) اختلافات سے فائدہ اٹھانا چاہئے اس عبارت کا صحیح ترجمہ اور مفہوم یہ ہے۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ تجاویز جناب پروفیسر نے بین الاقوامی سطح پر پیش کی ہیں۔ پروفیسر صاحب موصوف کے اس مضمون سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ فرقہ بندی کی لعنت ہمارے لئے کس درجہ مُہلک اور تباہ کن ہ اور ہمارے اغیار واعدا کے لئے کیسی اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

مضمون کے آخر میں یہ کمترین راقم سطور آپ سب قارئین کی خدمت میں یہ درخواست کرتا ہے کہ آپ خود غور فرمائیں کہ ہم مسلمانوں میں یہ تباہی و بربادی کی بات کیوں ہے کہ ہم کسی بات کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ حالانکہ قرآن کریم کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ہر بات کا فیصلہ واضح طور پر دیتا ہے۔ **وما اختلفتم فیه من شئٍ فحکمه الی الله** (42/10) اور تم جس بات میں بھی اختلاف کرو تو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ ہمارے تمام متنازع فیہا امور جو ہزار سال سے چلے آرہے ہیں ان میں سے کسی ایک کا بھی فیصلہ آج تک نہیں ہوا۔ اور نہ آئندہ ہونے کی توقع ہے۔ ہمارے دونوں فرقوں، شیعہ و سنی میں جس قدر امور متنازعہ فیہ ہیں، اس ایک ہزار سال میں، ایک بات میں بھی آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ ختم نبوت جیسا بنیادی مسئلہ جس پر ڈیڑھ سو سال سے احمدی حضرات سے مناظرے ہوتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن دونوں طرف کے علماء کسی واضح فیصلہ پر نہیں پہنچ پاتے۔ قرآن کریم سے اگر کوئی واضح فیصلہ نہیں ملتا تو کیا نعوذ باللہ وہ واضح فیصلہ دینے سے قاصر ہے یہ کتاب کا سقم ہے کہ وہ کوئی واضح فیصلہ نہ دے، اور ہر فرقے کی تائید اس سے حاصل ہو جائے۔ ہم قرآن کریم کے متعلق اس قسم کا تصور تک نہیں سکتے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم قرآن کو میزان و محک بناتے ہی نہیں ہیں۔ اور حدیث و سنت اور فقہ کی بھول بھلیوں میں گم رہتے ہیں۔ اول تو قرآن کو سامنے ہی نہیں لاتے اور اگر قرآن کو سامنے لاتے ہیں تو آیات کی وہ تفسیر کرتے ہیں جو شان نزول و روایات کے ذریعے کی جاتی ہیں۔ وہ پھر مختلف فیہ ہوتی ہیں۔ اور بھڑوں کا چھتہ۔ اور بقول مرزا غلام احمد صاحب کے مداری کا

پکار لے۔ آپ کسی بھی معاملے اور مسئلے میں صرف اور صرف قرآن خالص کو سامنے رکھیں ہو ہی نہیں سکتا کہ کسی بھی مسئلہ کا صاف اور واضح جواب آپ کو اس سے نہ ملے اس کا دعویٰ ہے۔ **أدعوني استجب لكم** (40/60) مجھے پکارو میں جواب دوں گا نیز فرمایا **أجيب دعوة الداع اذا دعان** (2/186) جب کوئی مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں ۔اس کے یہ دعاوی کسی حال میں غلط نہیں ہو سکتے ۔ یہ ہماری غلطی اور ہمارا سقم ہے کہ ہم قرآن کی بارگاہ کو چھوڑ کر دوسرے دروازوں پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔ اور یوں ہر مسئلہ کو پیچیدہ سے پیچیدہ اور مشکل سے مشکل تر بناتے چلے جاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جدید مغرب میں اب ایسی کوئی مسلمہ قدر نہیں رہ گئی ہے جس کی بنیاد پر نیک و بد کا فیصلہ کیا جاسکے۔ اگر ایک طرف ہم خود کو ان خوش قسمتوں میں سمجھتے ہیں جنہیں طب و صحت کی جدید سہولتوں نے طویل العمری عطا کی ہے۔ سفر کی سہولتوں نے ہمارے لیے جلوۂ کائنات کے مواقع فراہم کیے ہیں، کوہ و دشت کی وسعت اور فضاؤں کی بلندی ہمارے تصرف میں آ گئی ہے، کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے ہمیں جام جمشید کا لطف عطا کیا ہے تو دوسری طرف بے لطف، یکسانیت کی ماری، خالی خولی زندگیاں ہر لحہ ہم سے سوالی ہیں کہ آخر اس تمام دوڑ دھوپ کا حاصل کیا ہے؟ آخر وہ کیا چیز ہے جو کھوئی گئی ہے جس کے بغیر زندگی بے لطف ہے۔ وہ مسرت آمیز زندگی، وہ طرب انگیز لمحے جب محض جیئے جانا بھی ایک لطف تھا آخر کہاں رخصت ہو گئے۔

لندن کے لارڈ میئر کے بیان پر تبصرہ

کمترین راقم سطور کو لندن سے جناب محمد شاکر فاروقی صاحب کا ایک ای میل E-Mail موصول ہوا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا کہ لندن کے لارڈ میئر جناب KEN LIVING STONE نے فرمایا ہے کہ مسلمانوں نے پانچ سو سال سے دنیا کو کچھ نہیں دیا۔ اس پر جناب فاروقی صاحب نے ناراضگی کا اظہار فرمایا ہے۔ کیونکہ جناب فاروقی صاحب نے کسی اخبار یا رسالہ کا حوالہ نہیں دیا ہے اس لئے میرے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے میں اس بیان کی تصدیق کرسکتا تاہم یہ ایک ایسا بیان ہے جو نہ صرف حقیقت پر مبنی ہے بلکہ ہم خود بھی اکثر اس بات کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ اس لئے جناب میئر صاحب کے بیان پر تبصرہ کرنے کے لئے اس تصدیق کرنے کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو اس میں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ جناب میئر صاحب نے مسلمانوں کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ جبکہ ہم خود بھی اسلام اور مسلمانوں کو غلط ملط (confuse) کرنے کے عادی ہیں۔ ہم ہمیشہ مسلمانوں کی تاریخ کو اسلامی تاریخ، مسلمانوں کے فلسفہ کو اسلامی فلسفہ، اور مسلمانوں کے خود ساختہ قوانین کو اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں۔ یہ بات تو درست ہے کہ مسلمانوں نے 500 سال میں دنیا کو کچھ نہیں دیا لیکن اسلام کے متعلق یہ بات کبھی درست نہیں ہے۔ غور کرنے کے قابل یہ بات ہے کہ آخر مسلمانوں نے ان 500 سال میں انسانیت کی ترقی میں کوئی بھی کام کیوں نہیں ادا کیا اور خود اسلام نے جو کچھ دیا ہم نے اس سے بھی کیوں فوائد حاصل نہیں کئے۔ زیر مطالعہ مضمون میں ان دو امور کے متعلق وضاحت پیش خدمت عالی کی جائے گی۔

یہ بات ظاہر ہے کہ انسانیت یا دوسری اقوام کی خدمت وہی قوم کرسکتی ہے جو دیگر اقوام عالم میں ممتاز درجہ رکھتی ہو اور ان میں امامت یا پیشروی کے مقام پر فائز ہو

۔حضرت ابراہیمؑ اپنے دور میں انسانیت کے رہبر و قائد تھے۔چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اِذِابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی الظّٰلِمِیۡنَ (1/124) جب ابراہیم کو اس کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا تو ان میں پورے اترے اور تو اللہ نے فرمایا ۔میں تم کو (لوگوں) کا پیشوا بنانیوالا ہوں۔حضرت ابراہیمؑ نے عرض کی اور میری اولاد میں سے۔ فرمایا میرے اس عہدہ پر ظالموں میں سے کوئی شخص فائز نہیں ہوسکتا۔حضرت ابراہیمؑ سے اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا کہ ان کی اولاد بھی ان کی طرح انسانیت کی پیشوا ہوگی جس طرح خود اپنے دور میں حضرت ابراہیم تھے۔لیکن ان کی ذریت میں سے جو لوگ ظالم ہوں گے وہ کبھی بھی انسانیت کے رہبر و پیشوا نہیں بن سکتے۔تعریف آیات پیش نظر رکھنے سے اس آیت کی وضاحت سورہ بقرہ میں یوں ملتی ہے۔ وَ مَنۡ یَّتَعَدَّ حُدُوۡدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الظّٰلِمُوۡنَ (2/229) جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کرتے ہیں وہ ظالم ہیں ظالمین کی یہ بڑی جامع تعریف ہے۔اس لئے کہ انسانیت کے حقوق کا تعین قوانین خداوندی کی رو سے ہی ہوسکتا ہے اور جو شخص ان قوانین کو توڑتا ہے وہ حقوق انسانیت غصب کرتا ہے۔لہٰذا حدود اللہ (قوانین خداوندی) کو توڑنے والا ظالم ہے جس معاشرے میں بھی ان قوانین کے علاوہ دیگر خود ساختہ قوانین کا اجراء ہوگا۔قرآن کریم کی رو سے وہ ظالم قوم ہوگی۔اسے دنیا کی امامت نہیں مل سکتی ۔دنیا میں امامت حاصل کرنے کا واحد طریقہ حدود اللہ کو جاری کرکے قرآن کریم کا نظام جاری کرنا ہے یہ امامت خود حضرت ابراہیمؑ کو "کلمات" پورا کرنے پر ملی تھی۔اور دیگر اقوام کو بھی ان "کلمات" کو پورا کرنے پر ہی مل سکتی ہے ہماری تفاسیر میں ان "کلمات" کی فہرست تفصیل سے لکھی ہے ۔وہ تفصیل آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔تفسیر حسینی میں وہ 'کلمات' یہ ہیں۔

(یعنی شگافتن موئی سر دو نیم ساختن آں را کہ کسی موئی دارد۔ ومضمضہ واستنشاق، وچیدن موئی لب وگرفتن ناخن، وبرکندن موئی زیر بغل وحلق عانہ وختنہ واستنجا بہ آب) یعنی سر کے بیچ میں مانگ نکالنا۔کلی کرنا،ناک میں پانی ڈالنا مونچھیں کم کرنا ناخن کٹوانا۔زیر بغل

وزیر ناف بال کاٹنا ختنہ کرانا، استنجا کرنا دوسری تفاسیر میں جمعہ کا غسل کرنا۔ اور مسواک کرنا بھی شامل ہے ہماری تفاسیر کی رو سے یہ وہ امور ہیں جن کی وجہ سے حضرت ابراہیم کو مقام امامت ملا تھا، اور دیگر اقوام کو بھی ان امور کی سرانجام دہی کے بعد امامت مل سکتی ہے ان کے نزدیک مسلمانوں کا عروج قرآنی نظام سے وابستہ نہیں ہے مقام ابراہیم کے متعلق اگلی ہی آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (2/125) اور بناؤ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ۔ تفسیر مظہری میں ہے "اور ہم نے حکم دیا ہے کہ بنالو ابراہیم علیہ اسلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ، یعنی اور بناؤ مقام ابراہیم کو نماز کی جگہ، اس نماز سے طواف کی دو رکعتیں مراد ہیں"۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رقمطراز ہیں "مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ اسلام کے قدموں کا نشان ہے اور اسی پتھر پر کھڑے ہو کر انہوں نے حج کی دعوت دی تھی اور وہ (پتھر) جنت سے لایا گیا تھا جیسے حجر اسود۔ اب اس پتھر کے پاس نماز پڑھنے کا حکم ہے اور یہ حکم استحبابی ہے"۔ تفسیر حسینی میں تحریر ہے کہ "از مقام کہ منسوب است بابراہیم مصلی نماز گاہ وآن موضعی است کے در آن حجرے وضع کردہ اند واثر قدمہائے مبارک آنحضرت بر دست۔ صفحہ 38

موجودہ دور کی بلاشبہ بہترین تفسیر "تدبر قرآن" میں تحریر ہے اور یہاں آیت میں مقام ابراہیم کا لفظ آیا ہے۔ مقام ابراہیم سے کیا مراد ہے۔ علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے وہ پتھر مراد ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ میں تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے" صفحہ 329، (اقتباس ختم ہوا)

یعنی ان سب حضرات کے نزدیک مقام سے مراد کوئی جگہ ہے۔ لیکن علمائے اہل قرآن کے نزدیک، اس سے مراد، رتبہ، مرتبہ، رفعت، منزلت ہے۔ مصلےٰ وہ مقام ہے جس

کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے چلا جائے۔ آیہ کریمہ میں حکم دیا جا رہا ہے کہ ابراہیم کے مقام امامت کے ساتھ ملے ہوئے پیچھے پیچھے چلا جائے اور کسی حال میں بھی اس مرتبہ بلند کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ جب تک تم ابراہیم کے اس رتبہ بلند کو تھامے رہو گے۔ اس وقت تک تم بھی پوری انسانیت کے امام ہی بنے رہو گے، لیکن جس وقت تم ابراہیم کے اس مقام بلند، اعلیٰ رتبہ کو چھوڑ دو گے (اور اس سے مراد ایک خاص پتھر کو قرار دو گے) تو پھر تم انسانیت میں کسی مرتبہ و مقام پر بھی نہ رہو گے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ قرآن کریم کو اصرار اپنے مقرر کردہ نظام کی اقامت پر ہے، کہ اسی سے امت مسلمہ کا عروج و زوال وابستہ ہے۔ اسی نظام کے قیام کے سلسلہ میں بنی اسرائیل کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَ بَشِّرِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ (10/87)، اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ اور بناؤ اپنے گھر قبلہ رو اور قائم کرو نماز تو بشارت ہے مومنین کے لئے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ گھروں کو قبلہ رو بنانے اور نمازیں پڑھنے سے کسی قوم کو نہ محکومی سے نجات مل سکتی ہے اور نہ ہی وہ قرآنی نظام قائم کر سکتی ہے۔ اصل سوال یہاں قبلہ کے مفہوم کا تعین ہے جس کے غلط تعین کی وجہ سے آیہ کریمہ کا مطلب دین کے نقطہ نگاہ کی بجائے بالکل مذہب پر کفایت کر جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ جب نظام ہی باقی نہ رہے اور قوم انفرادی زندگی، مذہب کی سطح پر گذار رہی ہو لیکن اس قوم میں نظام قائم کرنے کی پیش از پیش آرزو و تمنا ہو، تو اس وقت قبلہ کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اور کس چیز کو اس وقت قبلہ بنایا جائے۔ یعنی اس وقت مذہب کی انفرادی زندگی ترک کر کے، دین کی اجتماعی زندگی کا سلسلہ کہاں سے شروع کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کریم قوم بنی اسرائیل کو ہدایت فرماتا ہے کہ ہم نے موسیٰ کی طرف وحی کی کہ اس کی ابتداء کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ

وَّ اجۡعَلُوۡا بُیُوۡتَکُمۡ قِبۡلَۃً وَّ اَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ (10/87) یعنی اپنے ہی گھروں کو اپنی توجہات کا مرکز (قبلہ) بناؤ اور وہاں سے ہی نظام صلوۃ کی ابتداء کر دو۔ یعنی یہ کہ اس نظام کا آغاز اپنے اپنے گھروں سے کرو، اور رفتہ رفتہ یہ نظام پوری قوم میں جاری

ہوجائے گا اور پھر خود بخود سب کا ایک ہی قبلہ قائم ہوجائے گا۔ ان چند آیات کریمات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہماری تفاسیر نے کس طرح دین کا تصور محو کرکے، مسلمانوں کے زوال میں کیا کچھ کردار ادا کیا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف کا حال ہے۔ دین میں تو قرآن کریم کے قائم کردہ نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ کیونکہ اس نظام میں قوانین اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں اور ان کو نافذ اللہ کا رسول کرتا ہے، اس لئے اس نظام کی اطاعت از خود اللہ و رسول کی اطاعت ہوجاتی ہے، اور یہ ایک اطاعت ہوتی ہے، اس میں حدیث کی نہ کوئی اہمیت ہے اور نہ کوئی مقام۔ لیکن صرف اور صرف حدیث شریف کے زیر اثر دین کا یہ تصور ہم میں ختم ہوا۔ اور حدیث شریف کی اطاعت کو رسول اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا۔ حدیث شریف کی اہمیت و مقام بھی صرف مذہب ہے۔ دین میں حدیث شریف کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں ہے۔ حدیث کا صحیح مقام صرف اس وقت متعین ہوگا جب ہم مسلمانوں میں دین کا تمکن ہوگا۔ حدیث شریف کے ذریعے حضورؐ کی اطاعت کرنے کا عقیدہ دین کے قیام میں مانع ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ جب ہم اللہ و رسول کی اطاعت کر رہے ہیں تو نظام قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اور اس طرح حدیث شریف عملاً دین کے قیام اور مسلمانوں کی سرفرازی و سربلندی میں سخت حارج ہوتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل کمترین کے مضمون "دین میں حدیث کا مقام" میں ملاحظہ فرماسکتے ہیں

اسی طرح ہم نے فقہ کو SACRED COW بنایا ہوا ہے لیکن اس کی صحیح پوزیشن واضح کرنے کے لئے راقم سطور کے مضمون "اسلامی فقہ کی حقیقت" کا ایک اقتباس پیش خدمت عالی ہے۔ اس سے آپ کو فقہ کی صحیح حقیقت معلوم ہوگی۔

"قرآن کریم کی رو سے سلطنت و بادشاہی کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہے بلکہ یہ قطعاً اور مطلقاً حرام ہے۔ قرآن کریم کی رو سے خلافت کا حق کسی فرد واحد کو نہیں ہے بلکہ پوری کی پوری امت اس میں شامل ہوتی ہے (24/55, 22/78) لیکن قرآن کریم کی اس واضح تعلیم کے باوجود، ظالم، جابر، فاسق، بدچلن، بادشاہ تلوار کے زور پر امت مسلمہ کی

گردنوں پر سوار ہو گئے ان ظالم بادشاہوں نے جن کے حرم میں بیک وقت کئی کئی سو کنیزیں ہوتی تھیں، خلافت کے بجائے اپنی بادشاہی اور ملوکیت قائم کر لی اور جمہور مسلمانوں کا حق غصب کر کے اپنی بادشاہت کو مستقل طور پر قائم کر دیا اس دور کے ائمہ کرام وفقہائے عظام، امام جعفر صادق، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، نے ملوکیت کی سخت مخالفت کی اور شدید مذمت فرمائی اگرچہ ملوکیت نے ان کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ان حضرات باوقار کوہ تمثال نے تمام مصائب وآلام برداشت کیے لیکن ملوکیت وشہنشاہی کا ساتھ نہیں دیا۔ البتہ ان سے کم درجہ کے فقہا جو ان کے ہی شاگردوں میں شامل تھے انہوں نے ملوکیت کا ساتھ دیا اور اس طرح یہ قوانین جنہیں اسلامی قوانین کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، مدون کیے گئے لیکن حق یہ ہے کہ ان قوانین کا اسلام سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کے تدوین کردہ قوانین ہیں اور بس ان کا فقہ ملوکیت یا شاہی فقہ زیادہ مناسب نام ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ تمام قوانین اور فقہا سے حاصل کردہ فتاویٰ، بادشاہوں نے اپنی حکومت چلانے کے لئے بنوائے تھے۔ اس دور میں جتنی فقہ بھی تیار ہوئی وہ سب بادشاہوں کو سپریم اتھارٹی تسلیم کرتے ہوئے مرتب ہوئی تھی۔ جو کہ اسلام میں قطعاً حرام ہے فلہٰذا اس سارے قانون وفقہ کی بنیاد ہی خلاف قرآن ہے۔ امام ابوحنیفہ اور اس دور کے فقہا زمین کی ملکیت کو بالکل حرام قرار دیتے تھے۔ لیکن ان بادشاہوں نے زمین کی ملکیت جائز قرار دی اور دوسرے درجہ کے فقہا سے اس کی تصویب کرا لی۔ قرآن کریم کی رو سے اوقاف کا کوئی تصور نہیں ہے، لیکن ان قوانین میں اوقاف کے ادارے قائم کرنے کو جائز شمار کیا گیا۔ چنانچہ آج تمام مسلم ممالک میں اوقاف بھی ہیں اور وزارت ہائے اوقاف بھی قائم ہیں۔ ان قوانین میں عورتوں، بچوں، مزدوروں، کسانوں، اقلیتوں اور بین الاقوامی حقوق کی کوئی رعایت نہیں رکھی گئی اس مضمون کا موضوع تفسیر، احادیث، وفقہ سے متعلق نہیں ہے ان تینوں "اسلامی" علوم کا صرف اس درجہ تذکرہ کیا گیا ہے جس سے صرف یہ معلوم ہو سکے کہ مسلمانوں کے زوال میں ان کا کیا کردار اور کتنا حصہ ہے۔ اور مسلمان کیوں اس قابل نہیں رہے کہ وہ انسانیت کو کچھ دے سکیں اس کی وجہ بدیہی اور واضح ہے کہ

ہم مسلمانوں کے عقائد قرآن کریم کے خلاف ہیں اور وہی ہمارے زوال کا سبب ہیں اور کوئی بھی ترقی یافتہ قوم ان عقائد کو اپنا لے وہ زوال پذیر ہو جائے گی۔

ہمارے لئے اس سے بھی زیادہ تباہ کن چیز تصوف ثابت ہوئی۔ یہ امت مسلمہ میں TERMITE کی طرح پھیلا اور ساری امت کو گھن کی طرح چاٹ گیا۔ اس کے سارے بنیادی واساسی نظریات قرآن کریم کے خلاف اور ہماری تباہی و بربادی کے اسباب ہیں۔ اس کے نزدیک کائنات کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں یہ سب دھوکا اور سراب ہے اور بقول ان کے **او عکوس فی المرایاء او ظلال** (یہ ساری دنیا، آئینہ میں عکس ہے یا سایہ ہے) جب کوئی قوم دنیا کا وجود ہی نہیں مانتی تو وہ اس میں SCIENTIFIC DISCOVERIES کیوں اور کیسے کر سکتی ہے۔ تصوف کے نزدیک حواس خمسہ کے ذریعے جو علوم انسان حاصل کرتا ہے وہ بھروسہ کے قابل ہی نہیں ہیں اس کے نزدیک بھروسہ کے قابل صرف وہ علم ہے جو ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے براہ راست مل سکتا ہے اور اس طرح یہ نظریہ علوم حاصل کرنے کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔ قرآنی نظام میں جب انفرادی عبادت کی کوئی جگہ نہیں رہتی تو تصوف کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ تصوف تو دین کے اس نظریہ کے بالکل خلاف جاری کیا گیا تھا۔ اور تصوف دین سے کھلی کھلی بغاوت پر مبنی ہے۔ مذہب میں اس کی جگہ نکالی جا سکتی ہے لیکن معاف بفرمائیے دین میں اس کا کوئی مقام نہیں ہے۔ جب تک مسلمان مذہب میں الجھے رہیں گے تصوف فروغ پاتا رہے گا، جس دن مسلمان دین پر آ گئے اور دین یعنی قرآنی نظام کے ذریعے اللہ کی اطاعت کرنی شروع کر دی تصوف خود اپنی موت آپ مر جائے گا۔

ان نظریات کے برخلاف اگر مسلمان قرآن کریم کے مطابق نظریات رکھتے اور کائنات (ملائکہ) کو تسخیر کرنا اور دیگر علوم حاصل کرنا اپنا فریضہ سمجھتے تو بے شک وہ اس قابل ہوتے کہ دنیا میں کچھ CONTRIBUTE کر سکتے۔ ارشاد ہوتا ہے **وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ** (2/37) تو اللہ نے فرشتوں سے فرمایا کہ جو کچھ تم اب ظاہر کرتے ہو، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو میں وہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اس آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائناتی

قوتوں یعنی ملائکہ کا ظاہر ان کے باطن سے مختلف ہے۔اسی میں ملائکہ (کائناتی قوتوں) پر تحقیقات اور ریسرچ کرنے کا راز مضمر ہے کہ ان ملائکہ (کائناتی قوتوں) کا باطن تلاش کیا جائے۔" آپ اشیائے کائنات پر غور فرمائیں جب یہ کائنات عالم وجود میں آئی یہ تمام چیزیں اس میں موجود تھیں۔جوں جوں انسان کی ترقی کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا ان اشیاء کی مضمر صلاحیتیں بے نقاب ہوتی چلی گئیں۔ایتھر ہمیشہ سے موجود ہے لیکن اس سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔اب اسی ایتھر سے بہت طرح کے کام لئے جاتے ہیں۔ٹی وی اور ریڈیو کی لہریں اس کے ذریعے منتشر کی جاتی ہیں۔اسی طرح ایٹم (Atom) ہے یہ تخلیق عالم کے وقت بھی موجود تھا لیکن اس کی ساری صلاحیتیں مخفی تھیں۔محسوس طور پر وہ سامنے نہیں آئی تھیں اس دور میں یہ تحقیقات بعد میں سامنے آئیں۔یہ ہے اشیاء کائنات کی وہ حالت جسے ملکنتم تکتمون سے تعبیر فرمایا اور اس کے بعد جب ان کی قوتیں استعمال میں آنے لگیں تو وہ ان کی وہ حالت ہے جو ماتبدرون 2/37 میں بیان کی گئی ہے۔سورہ شوریٰ کی آیت 4 میں ozone کی طرف واضح اشارہ ہے جب فرمایا کہ:

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ (42/5) قریب تھا کہ فضائے آسمانی پھٹ پڑتی۔لیکن اللہ تعالیٰ کی کائناتی قوتیں (ملائکہ) ہر وقت سرگرم عمل ہیں اور اس طرح اہل زمین کو اپنے سامان حفاظت میں لئے ہوئے ہیں اگر کائنات کی قوتیں (ملائکہ) درمیان میں نہ ہوتیں تو فضائے آسمانی اب تک پھٹ چکی ہوتی۔قرآن کریم نے ملائکہ کو اولی اجنحۃ بھی کہا ہے یعنی کئی پروں والے ملائکہ فرمایا اُولِىٓ اَجْنِحَةٍ مَّثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ (35/1) دو دو تین تین، چار چار پروں والے ملائکہ۔ یہ وہ ملائکہ یا کائناتی قوتیں ہیں جن کے اندر کئی کئی صلاحیتیں مضمر و مخفی ہیں۔جیسے سورج سے خارج شدہ توانائی فصل بھی پکاتی ہے روشنی بھی مہیا کرتی ہے۔سمندر سے بخارات بھی اٹھاتی ہے، اس لئے اس توانائی (ملک) کو کئی پروں والی بیان فرمایا ہے۔اسی آیہ کریمہ کے آخری حصہ نے یہ بھی بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کائنات میں برابر اضافہ کرتا رہتا ہے ابھی ہمیں

بالکل معلوم نہیں کہ ان میں کتنی کتنی اور کس قدر صلاحیتیں مخفی ہوں گی جن کو اب تک عقل انسانی دریافت نہیں کرسکی، نیز کہ ایک ملک (کائناتی قوت) میں زیادہ سے زیادہ چار صلاحیتیں ہوسکتی ہیں، اس سے زیادہ نہیں ہوسکتیں۔ (اقتباس از ملائکہ کی حقیقت، تحریر کردہ راقم سطور)

اس کے برعکس ہمارے ہاں تفسیر مظہری میں اسی آیہ کریمہ کے ذیل میں مرقوم ہے کہ حسن رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ واعلم مَا تُبْدُوْنَ میں تبدون سے مراد مضمون آیت تجعل فیھا من یفسد فیھا ہے اور وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ سے مراد فرشتوں کا وہ قول ہے جو آپس میں چپکے چپکے کیا تھا کہ خدا تعالیٰ ہم سے زیادہ بزرگ کوئی خلق پیدا نہ کرے۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا کہ حضرت آدم کا جسد جب مکہ وطائف کے درمیان پڑا تھا، ابلیس ادھر سے گذرا اور کہا اس کو کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ پھر اس میں منہ کی راہ سے داخل ہو کر پیچھے کو نکل گیا اور کہا یہ مخلوق اپنے کو کسی شے سے بچا نہ سکے گی۔ کیونکہ یہ اندر سے بالکل خالی اور کھوکھلا ہے پھر اور فرشتے جو اس کے ساتھ تھے اگر اس کو افضل بنایا گیا اور تم کو اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا تم بولو کیا کرو گے؟ سب نے ایک زبان ہو کر کہا ہم اپنے رب جلیل کی اطاعت کریں گے ابلیس نے اپنے دل میں کہا خدا کی قسم اگر میں اس پر مسلط کیا گیا تو میں اسے تباہ کر کے رہوں گا اور جو یہ مجھ پر مسلط کیا گیا تو میں اس کی نہ مانوں گا اور سرکشی اور سرتابی کے سوا اور کچھ نہ کروں گا۔ اس پہ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ یعنی فرشتوں نے جو ظاہر کی اسے ہم جانتے ہیں اور شیطان نے جو سرکشی اور معصیت اپنے جی میں رکھی اس سے بھی ہم واقف ہیں تفسیر مظہری جلد اول صفحہ 82 حضرت ملا واعظ کاشفی اس آیت کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقم فرماتے ہیں ''

دمی ادنم آنچہ شما ظاہر می کند از گفتار تجعل فیہا وآنچہ بو دید شما کہ بزعم خود ہا می پوشید از کراہیت معزول شدن خود ہا از حکومت زمین۔'' ہمارے ساتھ سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ ابتداء میں کسی مفسر نے اپنی تفسیر میں جو کچھ لکھ دیا۔ آخر تک سب وہی لکھتے چلے

جائیں گے اس آیت کے ذیل میں آپ جس قدر بھی تفاسیر ملاحظہ فرمائیں گے۔ gist تقریباً ایک ہی ہوگا۔دل پر پتھر رکھ کر، صرف نمونے کے طور پر چند اقتباسات تحریر کردیئے گئے ہیں،ان کو پڑھیئے اور سر پیٹیئے۔

قرآن کریم نے جب یہ علم افروز دعویٰ فرمایا کہ **ربنا ما خلقت ھذا باطلاً** (3/191) اے ہمارے پروردگار تو نے کائنات کی کسی چیز کو فضول پیدا نہیں کیا تو یہ بہت بڑا دعوے تھا جس کے یہ معنی ہیں کہ کائنات کی ہر شے کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے اور نوع انسانی کے لئے اس میں کوئی نہ کوئی فائدہ ومنفعت ضرور ہوگی۔اب یہ ہمارا قرآن کریم پر ایمان لانے والوں کا کام ہے کہ یہ کائنات کی ایک ایک چیز پر غور وفکر کریں۔اور مشاہدات وسائنسی تجربات سے یہ ثابت کریں کہ کائنات کی کونسی چیز کس فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔اس طرح کائنات کی قوتوں یعنی ملائکہ کو تسخیر کرکے، خود بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور انسانیت کو بھی اس کا فائدہ دیں تاکہ پھر کسی کو یہ اعتراض نہ ہوسکے کہ مسلمانوں نے دنیا کو 5 سو سال سے کچھ نہیں دیا۔سورۃ حج میں ہے **وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْم** (15/21)، اور ہمارے پاس ہر چیز کے خزانے موجود ہیں۔لیکن ہم نازل یعنی عطا اسی قدر کرتے ہیں جس قدر انسان تلاش کے بعد معلوم کرتا ہے۔بقدر معلوم میں ایک اہم بات پوشیدہ ہے مثلاً زراعت کے لئے بھی قوانین مقرر ہیں۔ان قوانین کا علم جس قدر بڑھتا جائے گا وہ بقدر معلوم ہوتا جائے گا، اور اسی نسبت سے زمین کے خزانوں تک انسانی رسائی ہوتی چلی جائے گی۔آپ خود غور کرسکتے ہیں کہ آج سے دو سو سال پیشتر آج کی پیداوار کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا تھا۔وہ انہی زرعی قوانین کے ''معلوم'' ہونے کا نتیجہ ہے۔جو قومیں اس زرعی علم یا دیگر سائنسی علوم کو زیادہ سے زیادہ حاصل کریں گی اور ان کے مطابق زراعت کریں گی، ان کے ہاں اسی طرح رزق کی فراوانی ہوجائے گی۔یہ قوم دوسری اقوام کو بھی رزق فراہم کرکے،انسانیت کی خدمت کرے گی اس آیت کریمہ کی روشنی میں ہم مسلمانوں پر بھی فرض تھا کہ ہم ان عطایا کو حاصل کرکے،انسانیت کو اس سے نفع پہنچاتے۔حج کا اجتماع انسانی نظام میں نہایت اہم

رکن ہے قرآن کریم نے اس کے دو مقاصد بیان فرمائے ہیں ایک لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (22/37) تا کہ تم اللہ کے قانون کو غالب کرو اس بات کے بدلے کہ اللہ نے تمہاری ہدایت فرمائی اور دوسرا مقصد فرمایا کہ وَ اَذِّنْ فِى النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (22/27)

اور ہم نے ابراہیم سے کہا وہ لوگوں میں اعلان کر دے کہ وہ حج کی تقریب میں یہاں آئیں دنیا کے دور دراز گوشوں سے لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے، تا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہو جائیں وہ آئیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی یعنی انسانیت کے منافع کے لئے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ان دونوں مقاصد میں انسانیت کا فائدہ مضمر ہے۔ اسلامی نظام قائم کرنے سے بھی مقصد انسانیت کو نفع پہنچانا ہے اور حج کے اجتماع میں جو فیصلے اور اقدامات طے کئے جاتے ہیں، ان سے بھی مقصود انسانیت کو کچھ دینا ہی ہے۔ لیکن ہمارے ہاں لتکبروا اللہ سے مراد قانون خداوندی کو غالب کرنے کی بجائے عید کی نماز میں چھ (6) تکبیرات لیا جانے لگا اور حج کا اجتماع جو خالص انسانی و سیاسی نوعیت کا تھا، اس کو محض عبادت اور مذہبی رسوم میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہ عجیب تماشہ ہے کہ اسلامی نظام، حج جس کا ایک رکن عظیم رکن تھا وہ تو مدتوں سے معترض ہو چکا ہے، لیکن حج اسی اہتمام سے ہم کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اسلامی نظام کے بغیر حج کے فوائد حاصل ہی نہیں ہو سکتے۔

یہاں تک مضمون میں یہ بات بیان کی گئی ہے کہ اسلام کا اصل مقصد تو انسانیت کو فلاح پہنچانا تھا۔ لیکن ہم مسلمانوں نے ان نظریات کو کس طرح تبدیل کر دیا، اس میں اسلام کی کوئی خامی نہیں ہے بلکہ ہم مسلمانوں کا قصور ہے کہ ہم نے قرآن کریم کی تعلیم کو مسخ کر کے، وہ نتائج و فوائد حاصل نہیں کئے۔ لیکن ہماری ہر طرح کی کوتاہی کے باوجود اسلام نے انسانیت کو مستقل طور پر کیا دیا وہ اب پیش کیا جاتا ہے اس میں پانچ سو سال یا کسی عرصے کی تشخیص نہیں ہے۔ اسلام کے یہ عطیا دائمی ہیں۔

(۱) نزول قرآن کے وقت بادشاہت کا نظام ہر جگہ جاری تھا۔ یہ نظام ساری انسانیت پر کابوس کی طرح اس درجہ حاوی تھا کہ اس نظام کے علاوہ اس دور میں کوئی اور نظام سمجھ میں آتا ہی نہیں تھا۔ اور یہ نظام PARASITE کی مانند عوام کے خون پر پرورش پاتا تھا اس نے انسانیت کو بالکل مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے اس نظام کی سخت مذمت کی، اس کے برعکس اس نے جو نظام پیش کیا، اس سے قرآن کریم کی حقانیت کی دلیل بھی فراہم ہوتی ہے اور اس سے انسانیت کی نشوونما بھی ہوتی ہے۔ اس نظام سے قرآن کی حقانیت کس طرح ثابت ہوتی ہے اور یہ نظام انسانیت کو کیا دیتا ہے، اس کا ذکر مضمون کے آخر میں آتا ہے۔

(۲) قرآن کریم کے نزول کے وقت پیشوائیت کا تصور مسلمہ طور پر رائج تھا۔ پیشوائیت کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کچھ برگزیدہ حضرات ایسے ہوتے ہیں جو عام انسانوں اور خدا کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس نظریہ کو چیلنج کیا اور کہا کہ ہر شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا تعلق انسان سے، اور انسان کا اللہ تعالیٰ سے قرآن یا قرآن کے نظام سے قائم ہوتا ہے۔ آپ حد درجہ غور فرمائیں، اس تعلق کے علاوہ بندے اور خدا کے تعلق کا اور کوئی واسطہ بن ہی نہیں سکتا۔ قرآن کریم ہر شخص کے پاس ہے، اس پر غور و فکر، عمل کر کے، ہر شخص خدا سے تعلق قائم کرتا ہے، اس میں پیشوائیت یا خاص برگزیدہ لوگوں کے ہونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

(۳) اس زمانہ میں سرمایہ داری، جاگیرداری، کو ضروری اور لائینفک قرار دیا جاتا تھا۔ اس طرح لوگ غلط ذرائع سے زمین کی ملکیت یا دولت حاصل کرتے تھے اور اس سے غریب لوگوں کو EXPLOIT کرتے تھے۔ ساری دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی تھی۔ جو طاقتور ہوتا تھا وہ دولت پر قبضہ جما لیتا تھا۔ اور عام انسان سخت مصیبت کی زندگی بسر کرتے تھے اور یہ امیر طبقہ غریب طبقے سے حد درجہ مفادات حاصل کرتا تھا اور ان پر ظلم بھی کرتا تھا قرآن کریم نے ملکیت زمین کو حرام قرار دے کر ملکیت زمین کا تصور ختم کیا اور ربا کو حرام قرار دے کر سرمایہ داری کی بیخ کنی کر دی۔

(۴) نزول قرآن تک انسان قوموں اور قبیلوں میں منقسم تھا۔ نسلی، جغرافیائی حدود انسان اور انسان کے درمیان حائل بن رہی تھیں۔ قرآن کریم نے ان سب خود ساختہ حد بندیوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ تمام انسان ایک نفس واحدہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان سب کی زندگی کا Source ایک ہی ہے۔ اس لئے تمام انسان نسب و وطن کے امتیاز کے بغیر ایک عالمی برادری کے اجزاء ہیں۔ گذشتہ صدی میں یورپ میں جو دو جنگیں ہوئیں، انہوں نے ساری دنیا کو ہلا کے رکھ دیا۔ یہ صرف حدود بندی کا نتیجہ تھیں۔ خود ہی زمین پر لکیریں کھینچنا اور ان کے ذریعے آپس میں منافرت و معاندت پیدا کرنا، اور پھر جدال و قتال کرنا، یہ کون سی عقلمندی ہے۔ قرآن کریم نے ساری انسانیت کو ایک برادری قرار دیا۔

(۵) قرآن کریم نے ایک ایسا اصول دیا ہے جو سونے کے حروف سے تحریر کرنے کے قابل ہے **اما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض** (13/17) جو چیز ساری انسانیت کو فائدہ دے گی وہی دنیا میں باقی رہے گی۔ اس کی منفعت کسی خاص گروہ، کسی خاص قوم، خاص ملک تک محدود نہ ہو بلکہ منافع ساری انسانیت کے لئے یکساں طور پر فراہم ہو۔

(۶) اس دور میں غلامی کا رواج عام تھا۔ غلامی کو برا ہی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن قرآن کریم نے شرف انسانیت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اس لئے اس کے نزدیک کسی انسان کا کسی دوسرے انسان کو غلام بنانا، نہایت مکروہ اور قبیح فعل ہے۔ اس لئے اسلام میں غلامی کا وجود تو ایک طرف اس کا تصور بھی دین کے بالکل خلاف ہے۔ قرآن کریم نے جنگی قیدیوں کے لئے نہایت واضح حکم دے دیا کہ انہیں ہر حال میں چھوڑنا ہوگا۔ خواہ فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر **اما منا بعد و اما فدآء** (47/4) قرآن کریم نے غلامی کے سرچشمے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ ملوکیت کے دوران ہمارے بادشاہوں کے ہاں جو غلام و لونڈیاں پائی جاتی تھیں تو یہ ان کا اپنا ذاتی کردار تھا۔ اسلام کو اس سے کوئی علاقہ نہیں۔ لونڈیاں غلام کو تو ایک طرف، اسلام میں ملوکیت ہی قطعاً حرام ہے۔

(۷) قرآن کریم نے **یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى** (49/13)، اے لوگوں ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے کہ کر ذات

پات اور نسل پرستی کی جڑ کاٹ کے رکھ دی۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ یہ صرف توہم پرستی ہے ۔ انسان کی قدر و قیمت اس کے جوہر ذاتی سے ہوتی ہے نہ کہ نسب و خاندان سے۔ ہمارے ہاں سادات وغیر سادات کی تفریق، صدقات کو سادات پر حرام قرار دینا، اور خمس کو سادات کے ساتھ مخصوص کر دینا سب نسل پرستی پر مبنی اور قرآن کریم کی تعلیم کے یکسر خلاف ہے۔

(۸) قرآن کریم نے تزکیہ نفس کو زندگی کا مقصود قرار دیا ہے، اور اس کا طریقہ اللہ تعالیٰ کا یہ مقرر کردہ قانون ہے کہ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (92/18)، تزکیہ اس کا ہوتا ہے جو اپنے مال کو نوع انسانی کی پرورش کے لئے خرچ کرتا ہے۔ قرآن کریم کے اس اصول کو پیش نظر رکھیں اور پھر اندازہ فرمائیں کہ اگر لوگ قرآن کے اس عقیدہ کو تسلیم کر لیں، اور پھر اس کے مطابق عمل کریں تو اس سے انسانیت کو کس درجہ فائدہ پہنچتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان صرف وہ کام کرتا ہے جس میں اس کا اپنا فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ اگر عقل انسانی کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ دوسروں کی نشوونما کرنے سے اس کی اپنی نشوونما ہوتی ہے جو کہ مقصود حیات ہے، تو پھر ہر ذی ہوش انسان اپنا مال دوسروں پر صرف کر کے، انسانیت کو بے حد نفع پہنچائے گا۔

اسلام نے انسانیت کو جو کچھ دیا، ان میں سے چند کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور یہ کچھ اس وقت دیا تھا جب یورپ بالکل تاریکی اور اندھیرے میں تھا۔ لیکن جو اصل فائدہ اسلام انسانیت کو دیتا ہے، جیسا کہ پہلے بھی وعدہ کیا گیا ہے، اس کا ذکر مضمون کے آخر میں آتا ہے ۔ قرآن کریم کے یہ سنہری نظریات اپنے MOMENTUM زور دروں، یا حالات کے تقاضوں کی وجہ سے عام ہوتے چلے گئے۔ آج ساری دنیا میں یہ نظریات مسلمات کے طور پر مانے جاتے ہیں۔ قرآن نے جو یہ نظریات دیئے ہیں فکر انسانی نے ان کے علاوہ ایک بھی قابل تعریف نظریہ آج تک نہیں دیا۔

لیکن جناب MAYOR میئر صاحب کا یہ فرمان بے شک درست ہے کہ خود مسلمانوں نے انسانیت کو کچھ نہیں دیا بلکہ وہ اسلام کی اشاعت و ترویج میں رکاوٹ بن کے کھڑے رہے۔ برصغیر میں مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ صرف باغات اور مقبرے

بناتے رہے اگر وہ بادشاہ یہاں دین کا نظام جاری کر دیتے تو یہاں کی پوری آبادی مسلمان ہو جاتی۔ آج جبکہ ساری دنیا، اپنے نظامہائے باطل سے تنگ آچکی ہے اب بھی ہم اپنے نظام کو دلائل و براہین سے دوسری اقوام کے سامنے پیش نہیں کرتے بلکہ مذہب کی سطح پر ہی اسلام کو پیش کرتے ہیں یا پھر Terror یا Voilence ہم نے اپنا شعار بنا لیا ہے، اور اس طرح ہم اسلام کو بدنام کرنے کا سبب بن رہے ہیں۔ ہماری Values اس درجہ نفع بخش ہیں کہ اگر ان کو علمی طور پر پیش کیا جائے تو ممکن نہیں کہ دوسری اقوام ان کو APPRECIATE نہ کریں۔ وحی میں خود اتنا زور ہوتا ہے کہ وہ ہر ایک کو اپنی صداقت کی طرف کھینچتی ہے یہ ہماری اپنی خامی ہے کہ ہم اس کو درست طریقہ پر نہیں پہنچاتے تاہم یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جناب میئر Mayor صاحب کو یہ بھی ملاحظہ فرمانا چاہئے کہ انہوں نے اور ان کی قوم نے انسانیت کو کیا دیا۔ انہوں نے جو کچھ دیا اس کی بالکل مختصر روداد پیش کی جاتی ہے کیونکہ یہ مضمون اس کی تفصیل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

لگایا آئینہ یہ کہہ کے اس نے روزن در میں
کہ اپنا منہ تو دیکھیں میری صورت دیکھنے والے

آج سارا یورپ جو حقوق انسانی کا علمبردار بنا ہوا ہے، یہ وہی یورپ ہے جس نے ساری دنیا کو دو سو سال تک تگنی کا ناچ نچایا ہے، ساری دنیا کو قوت کے زور پر اپنا غلام بنانا کون سے حقوق کی پاسداری ہے۔ مفتوح ملک نے ان کے غالب آنے میں سخت مزاحمت کی۔ لیکن یہ مغربی ممالک خصوصاً برطانیہ، ان ممالک کی آبادی کو آپس میں لڑا لڑا کر، ان پر غالب آگئے۔ پھر اس کے بعد جس درجہ ان ممالک کی تذلیل و تحقیر کر سکتے تھے، اور جس قدر فائدہ اٹھا سکتے تھے، وہ انہوں نے کیا ہمارے برصغیر میں انگریزوں کے جو کلب ہوتے تھے ان میں بہت نمایاں مقامات پر تحریر ہوتا تھا۔ arenot Dogs and Indians allowed۔ پاکستان جب قیام میں آیا، اس وقت مال روڈ، لاہور پر لارنس کا مجسمہ نصب تھا اس کے نیچے تحریر تھا Do you want to be served by pen or sword۔ انگریزوں کی حکومت کے دوران سالانہ مالی بجٹ، Discuss نہیں ہوتا تھا جس قدر دولت وہ بھیج

سکتے تھے وہ عوام کا خون چوس کر ساری رقم انگلینڈ ارسال کر دیتے تھے سارا خام مال، چمڑا، پٹ سن، معدنیات، سب انگلینڈ جاتا تھا۔ انگلینڈ کی ساری شاندار عمارات یہاں کے غریب عوام کے خون کے گارے سے تعمیر ہوتی ہیں۔ لندن میں جو TUBES چلتی ہیں وہ جب ڈالی گئیں جب برصغیر کا پیسہ وہاں گیا اس وقت Brixton تک Tube پڑی تھی۔ اس کے بعد لندن میں بے حد وسعت ہوئی ہے، لیکن ان موجودہ آبادیوں تک Tube نہیں ڈالی جا سکیں کیونکہ یہاں کی دولت جانی بند ہوگئی تھی اور Tube ڈالنے پر خرچہ بہت آتا ہے ۔ہندوستان کے کسی ایک شہر میں بھی انہوں نے Tube نہیں ڈالی نہ ہی یہاں کی آبادی کے لئے کوئی فائدہ مند چیزیں بنائیں۔ ریل کا جو نظام انہوں نے قائم کیا وہ ان کی اپنی غرض سے تھا کہ اس سے فوج کی نقل و حرکت میں آسانی ہوتی تھی۔ یہ انتظام ہماری وجہ سے نہیں تھا۔ افریقہ کی کالی آبادی پر جو ظلم یورپ نے کیا ان کا تذکرہ کسی ایک مضمون یا کتاب میں نہیں آسکتا۔ جن حضرات کو ذرا سی بھی دلچسپی ہوں وہ Roots کتاب پڑھیں یا اس نام کی فلم ملاحظہ فرمالیں ۔ ان مظالم سے متعلق لٹریچر ہی الگ ہے اور یورپین ممالک کی لائبریریوں میں اس لٹریچر سے SHELVES بھرے پڑے ہیں، جو بالکل الگ ہوتے ہیں اور صرف اس لٹریچر کے لئے مخصوص۔ ان کتابوں کو پڑھ کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں راقم سطور طبعاً رقیق القلب ہے، اور ہر مرتبہ اس لٹریچر کو پڑھ کر گریہ ضبط نہیں کر سکا۔ امریکہ میں بھی جو سول وار Civil War بظاہر کالوں کے حقوق دلوانے کے لئے ہوتی تھی۔ اس میں بھی کالوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ ان کالوں کی زیادہ آبادی جنوب میں تھی، اور شمالی امریکہ میں مزدوروں کی سخت ضرورت تھی، اس لئے انہوں نے کالوں کا آزاد کرایا تا کہ انہیں سستی Labour فراہم ہو سکے۔ وہ صرف Labour چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ ان کالوں کو INCEST پر مجبور کرتے تھے تا کہ مزدوروں کی تعداد بڑھے یہ اس درجہ قبیح فعل ہے کہ ہمارے ہاں اردو میں اس کے لئے کوئی ایک لفظ نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ جو شخص یا قوم وحی کی پابندی نہیں کرتی، ان کی کوئی VALUES ہی نہیں ہوتیں۔ وہ بزعم خویش اپنے کو جس قدر مہذب خیال کریں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ

Valueless ہوتی ہیں۔ اور انہیں انسانیت کا خیال ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ خود ہی اپنی قدریں بنا لیتے ہیں۔ جو اقدار مستقل نہیں ہوتیں۔ جو قوم HOMOSEXUALITY جیسے مکروہ فعل کو جائز قرار دیدے ہیں ان کو تہذیب سے کیا علاقہ۔ آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ امریکہ نے ٹیکنولوجی پر قابو پالیا ہے، اس لئے وہ ساری دنیا میں اپنی من مانی کاروائی کرتا جارہا ہے۔ ورنہ تہذیب وشرافت سے ان کا کیا واسطہ۔ اور انسانیت کو کچھ دینے کا کیا تصور۔ یہ صرف انسانیت کے ناسور اور Cancer ہیں، جو انسانیت کو صرف دکھ دے سکتے ہیں۔

چونکہ یہ موضوع اس مضمون کا عنوان نہیں ہے، اس لئے اس کے متعلق صرف اس پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ ورنہ تفصیل تو کتاب کی متقاضی ہے۔ انسانیت کو جس چیز سے سب سے زیادہ نفع پہنچ سکتا ہے اور جو چیز قرآن کریم کی حقانیت کی واضح دلیل ہے، اور جس کا تذکرہ دوران مضمون کیا گیا تھا کہ اس کا ذکر آخر مضمون میں کیا جائے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین ہے سخت تعجب وحیرانی کی بات ہے اور آپ خود بھی اس بات پر بار بار غور فرمائیں کہ قرآن کریم نے ساری دنیا میں جاری مذہب کے تصور کو بالکل یک دم بدل کے رکھ دیا قرآن کریم سے پیشتر اس نظریہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ نظریہ اس وقت کی انسانیت کے فہم وادراک سے اس درجہ بلند تھا کہ اس پر عمل کرنے اور اس سے بے حد فوائد حاصل ہونے کے بعد بھی، انسانیت نے اس کو چھوڑ دیا اور سخت بدقسمتی یہ ہے کہ خود مسلمانوں نے اس نظریہ کو ترک کر کے مذہب کا سابقہ نظریہ اپنا لیا۔ مذہب کے نظریہ کے مطابق ہر شخص اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق قائم کرسکتا ہے یہ تعلق ایک طرح کا ذاتی تجربہ ہوتا ہے اس کا احساس بھی انفرادی وذاتی ہوتا ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ سے تعلق کے طریقے بھی مختلف ہوسکتے ہیں، جن کے لئے صحیح اور غلط ہونے کا کوئی معیار قائم نہیں ہوسکتا۔ یہ تعلق مسجد، مندر گرجا، SYNAGOGUE، کسی جگہ بھی قائم ہوسکتا ہے۔ کوئی شخص یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ اس کا تعلق باللہ کا طریقہ درست ہے اور دوسرے کا غلط ہے۔ کیونکہ اس تعلق کے نتائج اس دنیا میں ظاہر نہیں ہوتے، اسی طرح مذہب یا تعلق باللہ کو دنیاوی امور سے کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوتا۔ ان مذاہب کے متبعین کو دنیا میں زندگی گذارنے کے لئے کوئی نہ کوئی ضابطہ حیات بنانا

اور اس پر عمل کرنا ہوتا ہے۔ ان اختیار کردہ مذاہب کو انسانوں کے باہمی تعلقات وتنازعات سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔اس کے بالکل برخلاف قرآن کریم کے دین کا تصور یہ ہے کہ انسانوں کے باہمی تعلقات، معاملات، تنازعات کو قوانین خداوندی (قرآن) کے مطابق طے کرنا دین ہے۔ اس میں انسان کا اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق نہیں ہوسکتا بلکہ اس نظام کے ذریعے اللہ سے تعلق قائم ہوتا ہے اس میں مختلف لوگ مختلف طریقے اختیار نہیں کرسکتے۔ ہر شخص صرف ایک دین کے ماتحت رہ کر ہی اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔اس دین کے نتائج اس دنیا میں ہی سامنے آجاتے ہیں، اس لئے دین کے صحیح یا غلط ہونے کا علم یہاں دنیا میں ہی معلوم ہو جاتا ہے۔اس میں حقوق اللہ وحقوق العباد الگ الگ نہیں ہوتے دین میں اس تفریق کی کوئی راہ نہیں ہے۔ کفر درحقیقت دین یا نظام خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے۔ خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی، یا اعتقادی جس میں ہم سب مسلمان اس وقت مبتلاء ہیں۔ اصل شے وہ دین خداوندی ہے جسے انسان قائم کرتا ہے اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ دین میں انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں، لیکن طاغوتی نظام جو قرآن کریم کی اقدار کے خلاف قائم ہوتا ہے، اس میں انفرادی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھوٹنے کے لئے قائم رکھا جاتا ہے۔ انسانیت پر ظلم کرنے والے طاغوتی نظام کے اندر انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ قرآنی نظام وہ نظام ہے کہ اگر اس کو قائم کرلیا جائے تو اس کے منافع ونتائج ساری دنیا کو جنت بنادیتے ہیں اور پھر لارڈ میئر KEN LIVINGSTONE جیسے حضرات کو صحیح علم ہو کہ اسلام اور اس کے داعی مسلمان دنیا کو کیا کچھ دے سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں احکامات مدینہ شریف میں نازل ہوئے ہیں۔ مکہ شریف میں جو آیات نازل ہوئیں وہ عموماً عقائد سے متعلق تھیں۔ اب جو قرآن کریم کے نسخوں میں سورۃ کے شروع میں مدنی یا مکی تحریر ہوتا ہے یہ صرف روایات کو سامنے رکھ کے ان کا تعین کیا گیا ہے جو بالکل ظنی ہے۔ آج ہمارے پاس کوئی ذریعہ اس بات کو واضح کرنے کا نہیں ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیات مکی یا مدنی ہیں۔ مجموعی طور پر مفسرین کا خیال ہے کہ جو آیات

عقائد سے متعلق ہیں اور زیادہ فصیح وبلیغ ہیں وہ مکی ہیں اور جن میں احکام نازل ہوئے ہیں۔ وہ مدنی ہیں۔ احکام نازل ہی جب ہوئے جب مدینے شریف میں نظام کی ابتدا ہو چکی تھی۔ احکام کے نزول کے بعد یہ نہیں ہوتا تھا کہ ان پر انفرادی طور پر عمل کیا جاتا ہو، بلکہ اس کا طریقہ ہی یہ تھا کہ وہ احکامات نظام کی طرف سے نافذ ہوئے تھے۔ مثلاً جب چوری سے متعلق احکامات نازل ہوئے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دیا جائے تو اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ جس کے گھر چوری ہوتی تھی اس نے محلہ کے لوگوں کو جمع کیا، اور چور کا ہاتھ کاٹ دیا بلکہ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جس کے گھر چوری ہوئی وہ حضور کے پاس یا حضور کے مقرر کردہ نمائندوں کے پاس اس جرم کی اطلاع کرتے اور وہ نمائندے تحقیق وتفتیش کے بعد اس جرم کا فیصلہ کرتے۔ نکاح، طلاق کے احکامات میں حکومت کو INVOLVE کرنا لازمی تھا۔ بغیر حکومت کی INVOLVEMENT کے نکاح وطلاق نہیں ہوسکتا تھا۔ وراثت کے احکامات کا اطلاق حکومت کی جانب سے ہوتا تھا۔ قرآن کریم کے نازل کردہ احکامات کی اطاعت اس نظام کی رو سے ہوتی تھی۔ چونکہ یہ احکامات اللہ تعالیٰ کے ہوتے تھے، اور رسول اللہ ان کو نافذ فرماتے تھے، اس لئے ان کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہو جاتی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا نظام یا دین جس کو حضورؐ نے عملاً اس زمین پر نافذ فرمایا، صرف اور صرف، اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت ہے۔ نظام کے قیام کے بغیر اللہ ورسول کی اطاعت کا تصور "حدیث بے خبراں" ہے۔ اس نظام کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) یہ نظام زندہ بادی نظام ہوتا ہے۔ اس میں زندہ اتھارٹی کا ہونا لازمی ہے۔ لوگ پہلے اس اتھارٹی کے احکامات سنتے ہیں پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ مجرد کتاب (قرآن) یا روایات کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت کبھی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اس میں 'سمع' کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے (۱) وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2/285)، اور کہنے لگے اے ہمارے پروردگار ہم نے سنا اور مان لیا، ہمیں تیری مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف لوٹنا ہے۔

(۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ

أَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اے ایمان والو خدا اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جبکہ تم سن رہے ہو

(۳) إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ إِذَا دُعُوْا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24/51) ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو خدا اور اس کے رسول کی طرف بلایا جائے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کردیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ (64/16) تو جہاں تک تم سے ہو سکے خدا سے ڈرتے رہو اور (اس کے احکام) سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔ ان آیات میں آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ ورسول کی اطاعت سے پیشتر 'سماعت' شرط ہے جو صرف زندہ اتھارٹی کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ مجرد کتاب یا روایات سے نہیں ہوسکتی۔

(۲) یہ اطاعت ایک ہے قرآن کریم میں ان دو مطاعوں کے لئے ضمیر واحد استعمال کی گئی ہے اس کے لئے آیات (9/62، 9/74، 8/24، 24/54، 9/24) وغیرہ۔ ملاحظہ ہوں۔ (۳) اس نظام کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ قرآن کریم میں سمعنا واطعنا کے الفاظ جمع کے صیغے میں آتے ہیں اس سے ظاہر ہے کہ اطاعت خداوندی اجتماعی نظام میں ہی ممکن ہے۔

(۴) اللہ تعالیٰ نے جو وعدے مومنین سے کئے ہیں وہ اس نظام کی معرفت پورے ہوتے ہیں ارشاد ہوتا ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11/6) زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں ہے کہ جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ مگر آج کل یہ صورت حال نہیں۔ ہزاروں آدمی بھوکے مر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم اپنے جاری کردہ خود ساختہ نظام کے مطابق رزق کی تقسیم کرتے ہیں اس سے اللہ کی ذمہ داری اٹھ جاتی ہے۔ یہ تو غیر مناسب بات ہے کہ رزق ہم اپنے خود ساختہ نظام کے مطابق

تقسیم کریں اور توقع اللہ کے وعدوں کے پورا ہونے کی کریں۔ اللہ تعالیٰ کے وعدے اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں۔ آپ قرآن کریم کا معاشی نظام جاری کریں، اس نظام میں ہر شخص کے رزق کی ذمہ داری اللہ کے ذمہ ہوگی اور ہر شخص کو یقیناً رزق ملے گا اللہ تعالیٰ کا دوسرا وعدہ یہ ہے کہ مومنین ہمیشہ غالب رہیں گے۔ یہ وعدہ بھی اللہ کے نظام کے ہاتھوں پورا ہوگا۔ انفرادی طور پر یہ وعدہ پورا نہیں ہوسکتا۔ نیز فرمایا: وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (63/8) عزت تو خاص اللہ اور اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے مگر منافقین اس بات کو نہیں مانتے۔ پھر ارشاد ہوتا ہے وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ (30/47) مومنین کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے نیز ارشاد ہوتا ہے وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ (9/14) اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب رہنے کی کوئی راہ نہیں چھوڑی نیز فرمایا: تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47/7) اے ایمان والو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدم رکھے گا ان آیات اور اسی طرح کی متعدد آیات کریمات میں مومنین سے غلبہ کا وعدہ کیا گیا ہے لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج مسلمانوں سے زیادہ ذلیل خوار اور کوئی قوم نہیں ہے اس کی وجہ ظاہر و باہر ہے کہ یہ سب وعدے اللہ تعالیٰ کے نظام کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اگر مسلمان وہ نظام قائم کرلیں تو اللہ تعالیٰ کے یہ سارے وعدے پورے ہوجائیں گے۔ مسلمانوں کا عروج وزوال ان کے نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔ مسلمانوں کے لئے اس قعر مذلت سے نکلنے کا واحد حل ان کے نظام کا قیام ہے۔ جس دن مسلمانوں نے یہ نظام قائم کرلیا اور اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت قرار دے دیا مسلمانوں کی یہ ساری تباہی و بربادی ختم ہوجائے گی اور مسلمانوں کو صدر اول کا سا عروج و اقتدار حاصل ہوجائے گا کیونکہ وہ عروج و اقتدار بھی اسی نظام کے ذریعے حاصل ہوا تھا۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ (11/88)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اخبار ڈیلی ٹائمز کے ایک مضمون پر تبصرہ

روزنامہ ڈیلی ٹائمز کے مضامین عموماً بہت معلومات افزا ہوتے ہیں ۔یہ اخبار LEFTIST رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔لیکن اس میں بسا اوقات اسلام ،قرآن مسلمانوں سے متعلق مضامین طبع ہوتے رہتے ہیں جو معلومات افزا اور معنی خیز ہوتے ہیں ۔اس اخبار کی مورخہ 8 اگست کی اشاعت میں ایک مضمون "قرآن (ایک) اخلاقی یا قانونی ضابطہ؟،، کے عنوان سے طبع ہوا ہے۔یہ مضمون محترمہ فرزانہ حسن شاہد کا تحریر کردہ ہے جو کینیڈا کے شہر TORONTO میں مقیم ہیں ۔پاکستانی نژاد ہیں ۔مضمون علمی اور سنجیدہ ہے ۔کمترین راقم سطور نے اس کا آزاد ترجمہ کیا ہے جسے RENDERING کہنا زیادہ مناسب ہے ترجمہ کرنا ایک بہت اکتانے والا کام ہوتا ہے۔حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ اس کے وہ سارے نکات سامنے آجائیں جو تبصرہ کے متقاضی ہیں ۔اس مضمون پر اگرچہ مختصر سا تبصرہ بھی تحریر کیا جارہا ہے تاہم مقصد اس کا اصل یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی بھائیوں کو اس بات کا علم ہوجائے کہ صرف پاکستان میں ہی نہیں بلکہ دنیا میں جہاں جہاں بھی پاکستانی مسلمان موجود ہیں ،اپنی بساط کے مطابق قرآن کریم پر غور وفکر کررہے ہیں ۔نیز یہ کہ اس مضمون سے ان کی فکر سے بھی آگاہی ہوگی ۔اصل مقصد مضمون کو پیش کرنا ہے۔تبصرہ صرف ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔

﴿مضمون کا ترجمہ﴾

قرآن ،اخلاقی یا قانونی ضابطہ ؟

حال میں QUEBEC گورنمنٹ نے ایک فیصلہ جاری کیا ہے جس کے ذریعے

اسلامی عدالتوں کو جو کہ کینیڈا کی عدالتوں کے ساتھ کام کر رہی تھیں ختم کر دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کی کچھ تعداد نے تو اس فیصلے کو سراہا ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں مذہبی امور کو آزادی سے ادا کرنے کے حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ راسخ العقیدہ مسلمان قرآن کریم کے احکامات پر عمل کرنا ضروری خیال کرتے ہیں اور ان سے انحراف کو گناہ شمار کرتے ہیں۔

کچھ مسلمان یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر قرآن کریم کے عدل وانصاف پر مبنی اخلاقی اصولوں اور قانونی احکامات میں تضاد واقع ہو جائے تو اخلاقی ضوابط کو اختیار کر لینا چاہئے۔ شرعی قوانین کے اطلاق کے سلسلہ میں بہت سے امتیاز کا حوالہ دیتے ہوئے یہ مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ شرعی قوانین کو ONTARIO اور دیگر مسلمان ممالک میں ختم کر دیا جائے۔ اعداد وشمار سے اپنے موقف کی تائید کرتے ہوئے وہ مندرجہ ذیل سبب وحکمت کے باعث اپنے موقف کو جائز قرار دیتے ہیں۔

جن حالات میں قرآن کریم نازل ہوا، وہ حالات وماحول قرآن کریم کا پیدا کردہ نہیں تھا۔ مرد وعورت کے باہمی تعلقات، معاشرتی دباؤ، قبائلی اثرات، کئی کئی شادیوں کا رواج نزول قرآن کے وقت موجود تھے۔ قرآن کریم نے اس زمانے کی معاشرتی رسوم کو درست تو کیا، لیکن ان کے منفی اثرات کو بالکلیہ ختم نہیں کر سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآنی اصلاحات ایک بہترین معاشرہ تو قائم نہیں کر سکیں البتہ اس دور کی ضروریات کو انہوں نے عمدہ طریقہ سے حل ضرور کر دیا۔ اگرچہ قرآن نے ایک اچھی کمیونٹی تخلیق کر دی، جس میں اس دور کی ماڈرن سوسائٹی کی بنیادی باتیں بھی تھیں تاہم آج کل کی سوسائٹی، جس میں مرد وعورتوں کے باہمی تعلقات، مساوات، عدل وانصاف جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں، ان کو وجود میں لانے کے لئے بہت محنت وتدبر کی ضرورت ہے۔

قرآن کریم کے زیادہ تر قانونی اقدامات وقتی اسباب کے باعث تھے۔ کچھ احکامات اس درجہ مخصوص تھے کہ ان کا تعلق صرف حضورؐ کے افراد خانہ سے تھا۔ ان قوانین کو نہ تو عالمگیر سمجھنا چاہئے اور نہ ہی وہ آج کی مشکلات کا حل ہیں۔ ان وقتی قوانین پر نعل بالنعل

عمل کرنے سے، قرآن زمانہ کے ساتھ چلنے کے قابل نہیں رہتا۔ اور اس طرح اس کی یہ صلاحیت کہ یہ ہر زمانہ کا ساتھ دے کم ہو جاتی ہے۔

مسلمانوں نے نسل بعد نسل ان احکامات میں قیاس کو استعمال کرکے، ان احکامات کو عالمگیر اور ابدی بنانے کی کوشش کی ہے۔ قرآن کے بنیادی قانونی ڈھانچہ سے، شریعت کا نظام تشکیل دیا گیا۔ لیکن چونکہ اس نظام میں قرآن کے علاوہ ثانوی ذریعے سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس لئے اس میں سقم باقی رہ گیا۔ قرآن نے زنا کے قوانین بنائے۔ لیکن زنا بالجبر کا قانون نہیں بنایا کہ وہ قیاس کے ذریعے بنایا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کی تشریح وتعبیر میں ایک سقم باقی رہ گیا کہ فقہا نے زنا بالرضا و زنا بالجبر کو ایک ہی جرم تصور کرلیا۔ چنانچہ پاکستان میں ان کے لئے الفاظ تقریباً ایک جیسے ہیں۔ کنواری یا شادی شدہ عورت سے بد چلنی کرنا۔ اور زبردستی کسی سے بد چلنی کرنا بھی زنا بالجبر ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن ایک مکمل ضابطہ قوانین نہیں ہے بلکہ اس نے خاص حالات سے تعرض کیا ہے۔ کیونکہ اس سوسائٹی میں زنا عام تھی اس لئے اس نے پردہ جاری کیا اور زنا کو جرم قرار دیا اس کے خلاف قرآن میں زنا بالجبر، جنسی تشدد، اور لواطت کے احکامات نہیں ہیں۔ قتل کے جرم میں بھی اختیار دیا گیا ہے کہ متاثرہ کنبے کے لوگ چاہیں تو معاف کردیں اور چاہیں تو دیت وصول کرلیں اسی طرح قبائلی قوانین میں بھی جہاں جدی رشتہ داروں کے حقوق تسلیم کئے جاتے تھے۔ وہاں وراثت کے قوانین جاری کئے گئے جو عورتوں کے حقوق کے لئے زیادہ سازگار تھے۔ چونکہ اس وقت سود سے بہت ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا تھا، اسے منع کردیا گیا۔ چنانچہ قرآن کے اپنے نزول کے دوران جو مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ قرآن نے ان کا نوٹس لیا۔ لیکن اس کے علاوہ دوسرے معاشروں کے مسائل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی کہ جن کے لئے قوانین عطا کئے جاتے۔

اگرچہ مسلمان قرآن کو ایک ابدی قانون مانتے ہیں لیکن قدامت پسند اور مجددین کا اس بات میں اختلاف ہے کہ قانونی لحاظ سے اس ابدیت سے کیا مراد ہے۔ متجددین کا خیال ہے کہ قرآن کے اصول تو ابدی ہیں لیکن نزول قرآن کے وقت جس

طریقہ سے ان کا اطلاق ہوا ہے وہ طریقہ ابدی نہیں ہے۔ ان اصولوں کو نہایت دیانت داری سے ایسے قوانین کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے جو سب کے لئے انصاف فراہم کرسکتے ہیں۔ خصوصاً غربا و مساکین کے لئے۔ مسلم کینیڈین کانگریس اور کونسل کا خیال ہے کہ کینیڈین قوانین ان کی ضروریات کے لئے زیادہ بہتر ہیں۔ انہیں اسلامی قوانین سے بدلنا مناسب نہیں ہے۔ کیونکہ اس طرح مسلمان آبادی مقامی آبادی سے الگ ہوجاتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ کینیڈین قوانین قرآن کے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے وہ کیوبک QUEBEC گورنمنٹ کے اس فیصلہ کو پسند کرتے ہیں۔ اور توقع کرتے ہیں کہ ONTARIO گورنمنٹ بھی ARBITRATION ACT پر نظر ثانی کرے گی۔ اور آخر لامر اسلامی عدالتوں کو ختم کر دے گی کینیڈین مسلمان، پاکستان میں اور دیگر اسلامی ممالک میں حدود قوانین کو منسوخ کرنے کی حمایت کرتے ہیں۔

ترجمہ آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن خود مکتفی اور فیصلہ طلب نکات پر مشتمل ہے۔ مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کینیڈا میں وہاں کی مقامی عدالتوں کے علاوہ کچھ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق بھی فیصلے کرتی تھیں جن کو محترمہ مصنفہ صاحبہ نے ISLAMIC COURTS کے نام موسوم کیا ہے۔ یہ بات کہ وہاں اسلامی عدالتیں بھی تھیں یہاں کے عوام کے علم میں نہیں ہے۔ کیوبک گورنمنٹ نے عدالتیں ختم کر دی ہیں جس کے رد عمل کے طور پر وہاں کے بزرگ حضرات اس کو اچھا نہیں سمجھتے۔ لیکن کچھ حضرات کا خیال ہے کہ عدل و انصاف پر مبنی اصولوں، اور قانونی احکامات میں اگر تصادم واقع ہو تو قانونی احکامات کے بجائے اخلاقی ضوابط کو اختیار کر لینا چاہیئے۔ مصنفہ نے یہ تحریر تو کیا ہے کہ جو حضرات اس کے حامی ہیں وہ اس کی مثالیں پیش کرنے کے بعد یہ نظریہ قائم کرتے ہیں۔ لیکن مضمون زیر نظر میں انہوں نے کوئی مثال تحریر نہیں کی ہے اور ہمارے خیال میں ایسی کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ قرآن کریم کے قوانین عدل و انصاف کے خلاف نہیں ہوسکتے۔

جہاں تک اسلامی کورٹس کے کام کرنے کا تعلق ہے اس سلسلہ میں ایک اصولی

بات پیش نظر رکھنی ضروری ہے۔ اسلامی قوانین صرف اسلامی حکومت ہی جاری کرسکتی ہے ۔ اگر کوئی غیر اسلامی حکومت اسلامی قوانین جاری کرتی ہے تو وہ قوانین اسلامی نہیں ہوجاتے۔ بھارت کی حکومت اگر کسی وجہ سے شراب کو ممنوع قرار دیدے تو اگرچہ یہ قانون قرآن کریم کے مطابق ہے لیکن یہ اسلامی قانون نہیں ہوگا۔ اگر بھارت کی حکومت زنا کے مجرم کو سو کوڑے لگانے لگے، تو یہ اسلامی قانون یا اسلامی سزا نہیں ہوگی۔ اسلامی قوانین صرف وہ ہوتے ہیں جو اسلامی حکومت نافذ کرتی ہے۔ چنانچہ استشہاداً وتائیداً تدبر قرآن، سے یہ چند جملے نقل کئے جاتے ہیں۔ حد کے اجراء ونفاذ کے لئے دار السلام یا بالفاظ دیگر اسلامی حکومت کا ہونا ضروری ہے۔ ہمارے نزدیک یہ شرط لازمی ہے۔ یہ احکام نازل ہی اس وقت ہوتے ہیں جب اسلامی حکومت مدینہ میں استوار ہوگئی ہے"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ جبکہ عام دنیاوی حکومتوں کی اطاعت سے اللہ کی اطاعت نہیں ہوتی۔ سیکولر حکومتیں جب اسلامی قانون نافذ کرتی ہیں، تو ان کی اطاعت سے ان حکومتوں کی اطاعت ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ قوانین اسلامی شمار نہیں ہوتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص جرم کرتا ہے تو اس کے دو نتائج ہوتے ہیں۔ ایک تو اس نے حکومت کی خلاف مرضی کی۔ اور دوسرے اس کے نفس پر غلط اثرات مرتب ہوگئے جو اس نفس کے اضمحلال کے باعث ہوئے۔ دنیاوی حکومت جب سزا دیتی ہے تو اسے دنیاوی بدنی سزا تو مل جاتی ہے۔ لیکن اس کے نفس پر غلط مرتب شدہ اثرات قائم رہتے ہیں ہاں اگر اسلامی حکومت کسی کو سزا دیتی ہے تو اس کی سزا دنیاوی بھی ہوتی ہے اور اس حکومت کی سزا پوری کرنے سے اس کی نفس پر مرتب شدہ اثرات بھی زائل ہوجاتے ہیں۔ اس لئے غیر اسلامی حکومتوں کے احکامات اسلامی نہیں ہوسکتے۔ اس اصولی بات کے ملاحظہ کے بعد آپ خود غور فرمالیں کہ کینیڈا کی اسلامی عدالتوں کی اسلام کے نزدیک کیا پوزیشن تھی۔ ہمارے نزدیک تو ان کا ہونا اور نہ ہونا برابر تھا ۔ صرف ایک تسلی خاطر ہی تھی۔

اگر کوئی قانون خلاف قرآن نہیں ہے تو بہتر یہی ہے کہ LAW OF THE

LAND FOLLOW کو ہی کیا جائے۔ مثال کے طور پر نکاح کے انعقاد کے لئے، لڑکے اور لڑکی کا مسلمان ہونا، دونوں کی بلوغت، تراضی مابین، اعلان، مہر، یہ سب امور لازمی، اور نکاح کے شرائط میں شامل ہیں۔ اگر ان میں سے ایک بھی شرط ساقط ہو جائے تو نکاح درست نہیں ہوتا۔ لیکن نکاح کا طریقہ قرآن نے مقرر نہیں فرمایا اگر یہ پانچوں شرائط موجود ہوں تو نکاح کا جو طریقہ لندن یا کینیڈا میں مروج ہے۔ اس کے مطابق وہاں کے مسلمان بھی نکاح کر سکتے ہیں۔ آج سے چند سال پیشتر لندن میں اس مسئلہ پر بہت بحث ہوئی پاکستان کے ایک معروف عالم وہاں یہ فتوی دے آئے تھے کہ لندن کے معروف طریقہ کے مطابق مسلمان اگر نکاح کر لیں تو جائز ہے۔ چنانچہ وہاں جنگ، کے دفتر میں ایک مشاورتی میٹنگ ہوئی جس میں وہاں کے وکلاء، بیرسٹر حضرات، اور علمائے کرام نے شرکت فرمائی ۔وکلاء و بیرسٹر حضرات نے ان عالم دین کی رائے کی تائید کی مگر علمائے کرام اس پر متفق نہیں ہو سکے۔ اور اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب علمائے کرام نکاح پڑھاتے ہیں تو ان کو ایک سو پاونڈ بطور نذرانہ کے ملتے ہیں۔ اگر لندن کے مروجہ سرکاری طریقہ پر نکاح ہو تو وہ اس سے محروم رہتے ہیں اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔

یہ خیال کرنا کہ قرآن کریم کی اصلاحات صرف اس دور سے متعلق تھیں جب کہ قرآن کریم نازل ہوا تھا اور وہ احکامات بھی اس معاشرے کی خرابیوں کے پیش نظر نازل ہوئے تھے جو اس وقت عام ہو رہی تھیں، درست نہیں ہے۔ قرآن کریم کے قوانین واحکامات کوئی وقتی یا ہنگامی نہیں تھے بلکہ وہ دائمی، عالمگیر اور ابدیت کنار تھے۔ وہ نہ صرف چند اصلاحات پر مبنی تھے بلکہ قرآن کریم نے زندگی کے ہر ہر شعبے میں راہنمائی عنایت فرمائی عام اس سے کہ وہ سیاسی، سماجی، معاشرتی، تمدنی ہو، یا اس کے اعمال کے نتائج کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہو۔ اس نے زندگی کو ایک نا قابل تقسیم وحدت واکائی قرار دے کر ،اور حقیقت کا بالکلی ادراک کر کے یہ احکامات نازل فرمائے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اس سے ملتا جلتا نظریہ آیات کے شان نزول کا مروج ہے کہ ہر آیت کسی نہ کسی واقعہ کے سبب سے نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ نظریہ قرآن کے خلاف ہے۔ قرآنی آیات کا نزول انسانی

زندگی کے تقاضوں کے مطابق ہوا، اور وہ تقاضے ہی آیات کا شانِ نزول ہیں۔ قرآن کریم ایک باقاعدہ تدبیر الٰہی کے ماتحت اور بہترین ترتیب کے مطابق نازل ہوا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً

(25/33) مفہوم۔ اے رسول اس قرآن کو نجماً نجماً اس لئے نازل کیا گیا ہے کہ اس پر ساتھ کے ساتھ عمل ہوتا جائے اور اس طرح اس کے خوشگوار نتائج تمہارے لئے تقویت اور ثبات قلب کا موجب بنتے جائیں۔ اس کی تمام تعلیم، باہمدگر مربوط ہے اور ایک خاص نظم و ضبط کے ساتھ، سلسلہ درسلسلہ، آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک مسلسل پروگرام کو اسی ترتیب کے ساتھ سامنے آنا چاہئے تھا۔ (مفہوم القرآن)

اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن کریم خلا (VOID) میں نازل نہیں ہوا تھا قرآن کریم جس معاشرے میں نازل ہوا وہ ایک قائم شدہ معاشرہ تھا جس میں عرصہ دراز سے رسوم و روایات چلی آرہی تھیں۔ افراد معاشرہ ان رسوم کے پابند تھے۔ ان کے ہاں بھی قدریں (VALUES) تھیں ان میں بُرے اور اچھے کی تمیز کی جاتی تھی۔ شہرت، نیک نامی و بد نامی کے پیمانے مقرر تھے۔ لوگوں میں نیکی و بدی کے داعیات موجود تھے اور نیک عملی اور بد عملی ان کی وجہ شہرت بھی ہوتی تھی ان حالات میں قرآن کریم اپنی انقلاب انگیز قدروں کے ساتھ نازل ہوا۔ معاشرے میں جو اچھی رسوم و روایات تھیں ان کو جاری رکھا، جو رسوم و روایات بُری تھیں، قرآن کریم نے ان کا سدباب کردیا۔ شادی بیاہ کی وہ رسوم جن سے معاشرہ میں لوچ و لچک پیدا ہوتی ہے، وہ برقرار رکھیں۔ دعوت ولیمہ عربوں کی ہی رسم تھی اس کو جاری رکھا البتہ تعدد ازدواج، نکاح کے شرائط، عورتوں کی حفاظت کے لئے مہر کی رقم، کو رواج دیا گیا۔ جہاں تک حضورؐ کی ازواج مطہرات کے متعلق محترمہ مصنفہ صاحبہ نے تحریر فرمایا ہے کہ کچھ احکام خاص ازواج مطہرات کے متعلق تھے اور ان کا اطلاق عمومی نہیں ہے حضورؐ کے اپنے لئے اور ازواج مطہرات کے لئے بھی جو احکام تھے قرآن نے ان کی الگ نشاندہی کردی ہے۔ حضورؐ کے لئے تہجد، جہاد و نماز میں امامت کے فرائض انجام دینا،

ازواج کے لئے پردہ کے احکامات، دوسری شادی کی ممانعت، نہایت ذمہ دار اور اہم مقام پر ہونے کی وجہ سے سزا کا دوچند ہونا، یہ اور شاید ایک دو اور حکم ہوں گے جو حضورؐ عالی مقام اور ازواج مطہرات کے لئے مخصوص تھے۔ ان کی نشاندہی واضح طور پر کردی گئی تھی باقی تمام امور میں حضورؐ خود اور ازواج مطہرات قرآن کے اتباع کے مکلف تھے۔

محترمہ مصنفہ کا یہ خیال کہ قرآن کریم ایک مکمل ضابطہ حیات نہیں ہے بلکہ صرف مخصوص حالات میں اس کے قوانین نافذ ہوسکتے ہیں، درست نہیں ہے۔ قرآن کریم تمام دنیا کے لئے اور تمام ادوار وازمنہ کے لئے ضابطہ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز اصول ہوتے ہیں اور دوسری اس کی فروعات وجزئیات۔ قرآنی ضابطہ حیات کے اصول وہ مستقل اقدار ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوسکتیں۔ البتہ ان قوانین کی فروعات وجزئیات انسانی معاشرتی زندگی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہیں گی۔ اور اس طرح وہ زندگی کے عملی مسائل کو حل کرتی چلی جائیں گی۔ قرآنی ضابطہ کے اصول وہ مستقل اقدار ہیں جو زمانہ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرنے سے انسانی زندگی مزید ارتقائی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ مستقل اقدار صفات الٰہیہ کا ہی دوسرا نام ہیں، اور سیاسی زندگی میں یہ مستقل اقدار انسانی حقوق کا پیرایہ اختیار کرلیتی ہیں۔

جہاں تک زنا بالجبر اور زنا بالرضا کا تعلق ہے، بے شک قرآن نے زنا بالجبر کے لئے الگ کوئی تذکرہ نہیں کیا لیکن RAPE زنا کے تحت ہی آجاتی ہے۔ RAPE میں عورت کو کوئی سزا نہیں دی جاتی، البتہ مرد کے لئے دوہری سزا ہوتی ہے۔ اسی طرح اغلام کی صورت ہے وہ لواطت کے ذیل میں آجاتی ہے، البتہ جہاں تک قتل کے متعلق مضمون میں تحریر ہے وہ درست نہیں ہے کہ مقتول کے ورثا کو اختیار ہے کہ وہ خون بہا لے کر قاتل کو چھوڑ دیں۔ قرآن کریم نے قتل بالعمد اور قتل بالخطاء میں فرق کیا ہے۔ قتل عمد میں خون بہا نہیں ہے۔ صرف قتل خطا میں خون بہا ہے۔ مگر اس کا کیا علاج کہ ہمارے ہاں قانون ہی قرآن کے خلاف جاری ہے اور قتل عمد میں بھی خون بہا کی اجازت وگنجائش رکھ دی گئی ہے۔ مصنفہ محترمہ کو پاکستان میں جاری شدہ قانون سے مغالطہ ہوا ہے ان سے گذارش ہے کہ

اس بارے میں قرآنی قانون، اور پاکستان میں جاری شدہ قانون میں فرق پیش نظر رکھیں۔

حدود لاز کی بھی یہی صورت ہے کہ لاز قرآن کریم کے بالکل خلاف پاکستان میں جاری ہے۔ جس آیت کریمہ (4\15) کے تحت یہ بنائے گئے ہیں اس کا ارتکاب زنا سے دور دور کا تعلق نہیں ہے بلکہ وہ آیہ کریمہ سحاقت HOMOS EX UAL ITY FEMALE کے بارے میں ہے۔ ان قوانین کے سلسلہ میں بھی قرآنی اور پاکستانی قوانین کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا چاہیئے

اخبار میں طبع شدہ مضمون پر مختصر سا تبصرہ ختم ہوا۔ بنیادی مقصد اصل مضمون کو قارئین کرام کی نظر سے گذارنا تھا تا کہ یہاں کے عوام کو یہ معلوم ہو جائے کہ پاکستان کے باہر مسلمانوں کی سوچ کس طرح کی ہے۔ مسلمان کہیں بھی ہوں وہ بخوبی اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ وہ مصائب و نوائب سے دوچار ہیں اور حد درجہ پستی و تذلل کا شکار ہیں۔ اس دور کے مسلمان ہوں یا سابقہ ادوار کے مسلمان ہوں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے زوال کا سبب اسلام پر صحیح عمل نہ کرنا ہے۔ قرآن کی حقانیت اور اسلام کا بہترین ضابطہ عمل ہونے سے کوئی منکر نہیں ہے۔ بس یہ سمجھتے ہیں کہ ہم قرآن کی تعلیم پر درست عمل نہیں کر رہے ہیں اور اس کا تدارک وہ کرتے چلے آرہے ہیں۔ امام ابن تیمیہ نے اپنے دور میں عقائد میں اصلاح کی۔ شیخ عبدالوھاب نے اپنے دور میں اصلاح کی۔ قبر پرستی، تعزیہ پرستی، ایصال ثواب، عرس، قوالی، اور بے شمار بدعات کو سختی سے روکا۔ ہمارے برصغیر میں شیخ سرہندی، مجدد الف ثانی نے اسی طرح اصلاح کی۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کی کثیر التعداد تصانیف کو مطالعہ فرمایئے، انہوں نے اپنی بساط و فہم کے مطابق مسلمانوں کو قرآن کے قریب لانے کی کوشش کی۔ ہمارے ہاں ماضی قریب میں، سر سید مولوی چراغ علی، مولانا حالی، سر سید امیر علی، اور چند دیگر حضرات نے قرآن کریم پر نئے نئے انداز سے غور و فکر کیا۔ اور مسلمانوں کو نیا فکر دیا۔ انہوں نے مغرب کے فکری ریلے و سیلاب کا جم کے مقابلہ کیا۔ اور مسلمانوں کے اُکھڑتے ہوئے قدموں کو جمایا مولوی محمد عبداللہ چکڑالوی مرحوم، مولوی حشمت علی مرحوم، خواجہ احمد دین نے تفاسیر قرآن کے نئے شہ پارے پیش کیئے ان تینوں حضرات کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ انہوں نے خالص قرآن پیش کیا

۔حدیث کے وحی خفی ہونے اس کے حجیت ہونے سے انکار کیا اور قرآن فہمی کا بالکل نیا طریقہ تفسیر القرآن بآیات القرآن جاری کیا۔ جو اس سے پیشتر تیرہ سو سال میں کہیں نہیں دکھائی دیتا لیکن وہ بھی مسلمانوں کی بگڑی بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکے، اور خود ایک الگ فرقہ بن گئے۔ یہ حضرات فرقہ اہل قرآن کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کے پیش نظر بھی صرف فقہ تھا اور انہوں نے ملوکیت کے مدّون شدہ فقہ کو خالص قرآنی فقہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ ہر چند کہ ان اکابرین نے مسلمانوں کو زوال و پستی سے نکالنے کی حد درجہ کوشش کی مگر مسلمان اسی طرح گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کے مانند گھومتے رہے۔

یہ سب اکابرین ہماری عزت و تعظیم کے مستحق ہیں۔ ان کی نیت، اخلاص، محنت وجد وجہد پر کوئی حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ان میں سے کسی کی نگاہ دین و مذہب میں امتیاز نہیں کر سکی جو کہ مسلمانوں کے زوال کا اصلی سبب ہے۔ ان سب حضرات کی نگاہ بنو عباس کے دور تک جا کر رُک گئی، اور اسی دور کے علوم تک جا کر یہ رُک جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں سمجھ سکا کہ ہم جس کی پیروی کر رہے ہیں وہ مذہب ہے، اللہ کا دیا ہوا دین نہیں ہے۔ مذہب جب از خود غلط ہے، تو آپ مذہب میں ہزار ہا اصلاح کر لیں، آپ وہاں کے وہاں ہی رہیں گے۔

زوال کے اس سبب کو صرف اقبال کی آنکھ نے بھانپا۔ انہوں نے واضح طور پر دین و مذہب میں کھلا کھلا فرق محسوس کیا۔ اور ہمارے مروجہ اسلام کی ہر چیز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ سب غیر اسلامی یعنی عجمی تصورات کی آمیزش ہے۔

تمدن تصوف شریعت کلام بتان عجم کے پجاری تمام

جب تک قرآن کریم کو بحیثیت دین کے جاری نہیں کیا جائے گا۔ مسلمان کسی طرح گرداب سے نہیں نکل سکتا انہوں نے نہایت بلیغ رباعی میں فرمایا کہ انسان کی حکومت انسان پر حرام ہے، اور حق حکومت بجز اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں ہے۔

آدم از بے بصری بندگی آدم کرد گوہر داشت ولے نذر قباد و جم کرد
یعنی در خوئے غلامی زسگاں پست تر است من نہ دیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

اس موضوع کو انہوں نے بے شمار اشعار میں باندھا ہے اور اپنے خطبات میں جگہ بہ جگہ بیان کیا ہے لیکن اس موضوع کے لئے انہوں نے کوئی جامع مضمون تحریر نہیں فرمایا لیکن ہماری خوش بختی کے کسی زمانے میں علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری، پروفیسر تاریخ اسلام، جامیہ ملیہ اسلامیہ دہلی، نے" اسلامی نظام" کے نام سے ایک پُرمغز اور جامع مقالہ تحریر فرمایا جس کا ملخص یہ تھا کہ اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہوسکتی، اس کی اطاعت نظام کے ماتحت ہوسکتی ہے۔ اگر وہ نظام جاری ہے تو اللہ کی اطاعت ہو رہی اور اگر وہ نظام باقی نہیں ہے تو ہم اللہ تعالیٰ کی اطاعت جیسے اہم فریضہ سے محروم ہیں۔ انہوں نے آیات کے حوالہ جات کے ساتھ یہ بات ثابت کی کہ مسلمانوں کی ترقی وعروج کا واحد حل اسلامی نظام کے قیام کے ساتھ وابستہ ہے لہٰذا مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل، اور آخری ضابطہ حیات تسلیم کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظام الٰہی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کردے کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون کو جاری کردے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں وہ اللہ اور رسول کے دشمن، باغی، عادی، نافرمان، اور مجرم ہیں۔ خواہ وہ کتنے ہی نماز روزوں کے پابند ہوں۔ اور خواہ کتنی ہی نمناک آنکھوں سے نعت خوانی کرتے ہیں۔

علامہ اقبال اور تحریک طلوع اسلام نے اس نظریہ کو بہت زور سے اٹھایا چنانچہ پاکستان کا ایک معتد بہ حصہ اس نظریہ کا قائل نظر آتا ہے کہ اسلام کو بحیثیت دین اور ضابطہ حیات کے اختیار کیا جائے۔ اگر ہم قرآن کو بطور ضابطہ حیات اختیار کرلیں، تو قرآن کے وہ

تمام مواعید پورے ہو جائیں گے جو قرآن نے مسلمانوں سے ان کے عروج وترقی کے بارے میں کر رکھے ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں اب ان جماعتوں اورتحاریک کی کمی نہیں ہے جو اسلامی حکومت کی داعی ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے تو قائل ہیں لیکن اس نظریہ کے قائل نہیں کہ اللہ کی اطاعت صرف قرآنی نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان سب جماعتوں کے نزدیک اسلامی حکومت کی تعریف یہ ہے کہ اسلامی حکومت وہ ہے کہ جس میں قرآن وسنت کے قانون جاری ہوں اور کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو لیکن قرآن کریم کی رُو سے اسلامی حکومت وہ ہے کہ جس کی وساطت سے اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہاں جس قدر تحاریک ہیں ان کا نظریہ یہ نہیں ہے بلکہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت انفرادی نجی، پرائیویٹ طور پر بھی کرنے کے قائل ہیں۔ جبکہ قرآن کریم انفرادی عبادت واطاعت کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ قرآنی حکومت میں تو یہ سب حکومت کے ماتحت ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ فرداً فرداً نہیں ہوسکتی اور یہی صورت دیگر عبادات کی بھی ہے۔ اس موضوع پر ایک مفصل مضمون راقم سطور کا ماہنامہ طلوع اسلام میں شائع ہوا ہے۔ اس لئے اُسی بات کو دوبارہ تحریر کرنے سے احتراز کیا جاتا ہے۔

بہر حال مسلمانوں کا واحد علاج یہ ہے کہ وہ اپنی سوچ میں بنیادی تبدیلی لائیں دین ومذہب میں واضح طور پر امتیاز پیش نظر رکھیں۔ ہمارا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر مذہب کا ترجمان ہے جو خود قرآن کے خلاف ہے، اس سے قطعی طور پر صرف نظر کریں۔ قرآن کریم کو بحیثیت دین کے اختیار کریں اور اسی نقطہ نگاہ سے تفاسیر وفقہ تحریر کیا جائے۔ صرف قرآن خالص پیش نگاہ رہے افسوس یہ ہے کہ ہمارے ہاں اسلام کے نام پر جس قدر کام ہو رہا ہے، وہ سب احیاء مذہب کا ہو رہا ہے احیاء دین سے اس کا کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اسلامی حکومت کی اطاعت کو اللہ ورسول کی اطاعت قرار دیا جائے کیونکہ یہی وہ واحد محرک INCETIVE ہے جس کی وجہ سے مسلمان اسلامی حکومت کو قائم کرنے پر مجبور ہوں گے۔

☆☆☆

قرآن الکریم کلام اللہ یا کلام رسول

عزیز مکرم جناب حسین امیر فرہاد صاحب نے ایک تحریر ارسال فرمائی ہے جس میں قرآن کریم کے متعلق دو موقف اختیار کیے گئے ہیں۔ایک موقف تو وہ ہے جو ہمارے سب کے درمیان متداول ہے کہ قرآن کریم مع اپنے الفاظ کے نازل ہوا ہے۔اس کے الفاظ بھی منزل من اللہ ہیں۔دوسرا موقف ایک قابل احترام پروفیسر صاحب کا ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے کہ ''قرآن پیغام غیب ہے'' جو رسولؐ کے دل پر اترا اور انہوں نے اپنی زبان میں لوگوں کو پیش کر دیا جیسے دوسرے انبیاء نے۔

نیز یہ تحریر فرمایا کہ ''قرآن ہے پیغام اللہ بزبان رسول'' اگر پروفیسر صاحب موصوف ''قرآن ہے پیغام اللہ بزبان رسول'' کے فقرے میں پیغام کی جگہ کلام کا لفظ استعمال کرکے ''قرآن ہے کلام الٰہی بزبان رسول' تحریر فرمادیتے تو کسی اختلاف کی گنجائش نہ رہتی۔لیکن محترم پروفیسر صاحب کے تحریر کردہ فقرے کی توضیح یہ ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف مضمون یا مفہوم سے حضور کو مطلع فرمایا تھا اور حضورؐ اس مضمون کو اپنے الفاظ میں بیان فرمادیتے تھے۔اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ محترم پروفیسر صاحب کے نزدیک صرف مضمون منزل من اللہ ہے جبکہ قرآن کریم کے الفاظ منزل من اللہ نہیں ہیں بلکہ وہ حضورؐ کے اپنے الفاظ ہیں۔

قرآن کریم کے اس نظریہ کی تائید و تصویب نہیں ہوتی قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ (2/23) اور اگر تم لوگ اس کلام سے جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے شک میں پڑے ہو تو تم بھی ایک سورۃ اس جیسی بنا لاؤ۔اس آیت کریمہ میں تحدی مما نزلنا کی گئی ہے جس میں مفہوم اور الفاظ دونوں شامل ہیں۔اس آیت کریمہ میں قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل

دی جارہی ہے کہ قرآن اسی وجہ سے منجانب اللہ ہے کہ اس کی مثل انسان نہیں بنا سکتے۔ اس تحدی (چیلنج) میں الفاظ و معنی دونوں شامل ہیں۔ کیونکہ اگر یہ الفاظ حضورؐ کے اپنے ہوتے اور منجانب اللہ نہ ہوتے تو یہ تحدی میں شامل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ تحدی صرف اس چیز کی ہو رہی ہے جو منجانب اللہ ہے۔ دوسری بات یہ غور طلب ہے کہ الفاظ کے لئے یہ تحدی کہ قرآن جیسے الفاظ کوئی نہیں بنا سکتا۔ اگر یہ تحدی حضورؐ کے الفاظ کی ہوتی تو حضورؐ کے الفاظ کی مثل تو بن سکتا ہے، یہ وضع شدہ احادیث ساری حضورؐ کے الفاظ کی مثل ہیں۔ اس طرح قرآن کریم کی تحدی غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

نیز یہ کہ اگر قرآن کے الفاظ بھی حضورؐ کے ہیں اور احادیث تو بہر حال حضورؐ کے اپنے الفاظ میں ہیں۔ تو یہ نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ 23 سال تک دو زبانیں بولتے رہے ہوں۔ ایک اپنے خیالات ادا کرنے کے لئے اور دوسری اللہ تعالیٰ کے خیالات کو ادا کرنے کے لئے۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ سابقہ دور میں یہ نظریہ شاید کچھ عرصے چل سکتا تھا لیکن اب psychology نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اس نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ بغیر الفاظ کے معنی ذہن میں آ ہی نہیں سکتے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی مضمون یا معنے الفاظ کے بغیر convey کیا جا سکے۔

قرآن کریم اپنے آپ کو جگہ جگہ عربی مبین ہی کہتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ** (26/195-196) بے شک یہ قرآن ساری دنیا کے پالنے والے کا اتارا ہوا ہے جسے روح الامین صاف عربی میں لے کر تمہارے دل پر نازل ہوئے تا کہ تم بھی ڈراؤ دوسری جگہ **حکماً عربیا** (13/37) عربی زبان میں حکم **لساناً عربیا** (46/12) عربی زبان میں بھی فرمایا گیا ہے ایک جگہ **قراناً عربیاً** کے ساتھ۔ **غیر ذی عوج** (39/28) بھی آیا ہے۔ ایسی واضح کتاب جس میں کوئی پیچیدگی نہیں، جو عربی میں ہے۔ اس کے علاوہ تین مختلف مقامات پر قرآن کریم کو کلام اللہ بھی کہا۔

(۱) **یسمعون کلام اللہ ثم یحرفونہ** (2/75) اللہ کے کلام کو سنتے ہیں اور اس میں

تحریف کرتے ہیں۔

(۲) فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰهِ (9/6) اس کو پناہ دو تاکہ وہ کلام اللہ کو سن لے۔

(۳) یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا کَلٰمَ اللّٰهِ (48/15) اللہ کے کلام کو بدلنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

ان تین آیات سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن کریم کلام اللہ ہے، حضورؑ کا کلام نہیں ہے سورہ شوریٰ میں جہاں وحی الٰہی کے نزول کے تین طریقے بیان فرمائے ہیں وہاں ارشاد ہوتا ہے **وما کان لبشر ان یکلمه الله الخ**۔ کسی بشر کے لئے اس بات کا امکان نہیں کہ اللہ اس سے کلام کرے، مگر یہ کہ یہ کلام صرف ان تین صورتوں سے ہوسکتا ہے جو آیت میں واضح کی گئی ہیں لیکن علم الٰہی حاصل ہونے کی تینوں صورتوں میں کلام کرنا شرط ہے۔ پھر اسی آیت کریمہ کے الفاظ **من وراء حجاب** کی تشریح 4/164) **من کلم الله موسی تکلیما**) نے کردی کہ موسیٰ علیہ السلام سے بھی اللہ تعالیٰ نے کلام کیا تھا صرف معانی القاء نہیں کئے۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ** (75/18) مفردات میں امام راغب اصفہانی نے اس کا ترجمہ تحریر فرمایا ہے، جب ہم وحی پڑھا کریں تو تم (اسی کو سنا کرو۔ راغب) اور پھر اسی طرح پڑھا کرو۔ اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ خیالات دل میں نہیں ڈالے جاتے تھے بلکہ حضورؑ کسی زبان میں وحی سنائی جاتی تھی اور پھر حضورؑ وحی کو اسی طرح پڑھا کرتے تھے۔ وحی صرف انبیائے کرام کو ملا کرتی تھی۔ غیر از نبی اس میں شامل نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ہم یہ نہیں جان سکتے کہ وحی کس طرح حضورؑ سنائی جاتی تھی اور پھر حضورؑ اس کو کس طرح پڑھتے تھے۔ ہمیں قرآن کریم سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے یہ ہے کہ ہم صرف اتنا جان سکتے ہیں کہ وحی الفاظ میں ہوتی تھی۔ صرف خیالات یا معانی دل میں ڈالے جاتے تھے۔

ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ **لَاتُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ** (75/16) (اے رسول) وحی کے جلدی یاد کرنے کے واسطے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اسی طرح سورۃ

طٰہٰ میں ارشاد ہوتا ہے وَ لَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ یُّقْضٰٓی اِلَیْکَ وَحْیُهٗ (20/114) (اے رسول) قرآن کے پڑھنے میں اس سے پہلے کہ تم پر اس کی وحی پوری کردی جائے جلدی نہ کیا کرو، اور سورۃ جن کی آخری آیت تو اس معاملے میں حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے

عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖٓ اَحَدًا ۝ اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ فَاِنَّهٗ یَسْلُکُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا ۝ لِیَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ وَاَحَاطَ بِمَا لَدَیْهِمْ وَاَحْصٰی کُلَّ شَیْءٍ عَدَدًا ۝ (2/26) (وہی) غیب داں ہے اور اپنی غیب کی بات ظاہر نہیں کرتا مگر جس پیغمبر کو پسند فرمائے تو اس کے آگے اور پیچھے نگہبان (فرشتے) مقرر کر دیتا ہے تاکہ دیکھ لے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کے پیغامات پہنچا دیئے اور (یوں تو) جو کچھ ان کے پاس ہے وہ سب پر حاوی ہے اور اس نے تو ایک ایک چیز گن رکھی ہے۔ یعنی وہ رسول کی تحویل میں جو امانت اپنی وحی کی دیتا ہے، اس کو پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھتا ہے۔ ایک ایک چیز (یعنی آیہ کریمہ) کو گنے ہوئے ہوتا ہے۔ مجال نہیں کہ کوئی چھوٹی سے چھوٹی آیت بھی اس کے شمار سے رہ جائے۔

ان آیات کریمہ کے پیش نظر یہ مغالطہ پیدا نہیں ہوسکتا کہ قرآن کے الفاظ حضورؐ کے تھے۔ لیکن قرآن کریم میں دو آیات بالکل ایک جیسی ہیں وانہ لقول رسول کریم 69/40، 81/19 ان آیات سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوتا ہے اور وہ ساری مذکورہ بالا آیات کو پس پشت ڈال کر، ان دو آیات سے جو بالکل ایک جیسے الفاظ پر مشتمل ہیں، استناد کرتے ہوئے غلط نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان دو آیات کی تشریح سے پیشتر قرآن کریم کے ایک اسلوب کی نشاندہی کرنی ضروری معلوم ہوتا ہے۔

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ کبھی حضورؐ اور مومن کے اعمال کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی اپنے اعمال کو مومنین یا رسول اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے۔ پہلی نسبت کی مثال یہ ہے کہ حدیبیہ کے مقام پر حالات بہت نازک ہو گئے تھے۔ جب حضورؐ کو جماعت مومنین سے اللہ کے ساتھ باندھے ہوئے عہد کی تجدید کرنی پڑی۔ اور اس کا

طریقہ یہ اختیار کیا گیا کہ مجاہدین آتے اور حضورؐ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اس عہد کی تو کید کرتے اس عہد کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ (48/10) یہ مجاہدین جو تجھ سے بیعت کر رہے ہیں تو یہ معاہدہ تیرے ساتھ نہیں بلکہ اللہ کے ساتھ کر رہے ہیں۔ توثیق معاہدے کے لئے جو تو ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتا ہے تو وہ تیرا ہاتھ نہیں ہوتا، وہ اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے رسول اللہ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ کہا ہے۔

اسی طرح سورۃ انفال میں وَ مَا رَمَیۡتَ اِذۡ رَمَیۡتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (8/17) (جنگ بدر میں) جو تیر اندازی تیری طرف سے ہو رہی تھی وہ تیری طرف سے نہیں بلکہ درحقیقت اللہ کی طرف سے تھی۔ اسی لئے کہ یہ تمام لڑائیاں اللہ کے حکم کے ماتحت اس نظام کو بلند کرنے کے لئے لڑی گئی تھیں۔

ان مقامات میں قرآن نے حضورؐ کے فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اسی طرح بعض جگہ، اس کے بالکل برعکس اپنے فعل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا ارشاد ہوتا ہے۔ وَ یَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَ الۡاَغۡلٰلَ الَّتِیۡ كَانَتۡ عَلَیۡهِمۡ (7/157) وہ ان بوجھوں کو اتار دے گا جن کے نیچے نوع انسانی دبی ہوئی چلی آ رہی تھی اور ان زنجیروں کو توڑ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی ہے۔ یہ وہ نظریات وعقائد ہیں جو قرآن کریم میں دیئے گئے ہیں۔ لیکن چونکہ حضورؐ نے اس نظریات کی ترویج کی اس لئے اس عمل کو حضورؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

حلال و حرام کے سلسلہ میں قرآن کریم نے واضح طور پر فرما دیا کہ وَ قَدۡ فَصَّلَ لَكُمۡ مَّا حَرَّمَ عَلَیۡكُمۡ (6/119) حرام صرف وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہے۔ یہ حضورؐ کی jurisdiction میں نہیں آتا لیکن سورۃ اعراف میں حضورؐ کے متعلق ہے کہ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَ یُحَرِّمُ عَلَیۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ (7/157) وہ ان کے لئے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور خبائث کو حرام ٹھہراتا ہے۔ اگرچہ حرمت و حلت کے احکام حضورؐ کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں، لیکن یہاں ان کو حضورؐ کی طرف منسوب کر دیا

گیا ہے۔

ان دو مذکورہ بالا آیات سے قرآن کریم کا اسلوب واضح ہو گیا کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ کی نسبتیں بدلتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سمجھنا بھی ضروری ہے کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی حضورؐ کی طرف۔ چنانچہ سورۃ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح فرمایا کہ جو امور وحی کی رو سے بیان ہوئے ہیں قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی رسول کی طرف اور مراد دونوں جگہ اللہ کی وحی ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (2/89) جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں، اور دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (2/101) دونوں آیات کریمات میں الفاظ بالکل ایک جیسے ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی آیت میں کتاب کا لفظ ہے اور دوسری میں رسول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایت کا تعلق ہے، اللہ، وحی، کتاب، رسول، ایک ہی حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

قرآن فہمی کے سلسلے میں یہ گذارشات بہت اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان گذارشات، اور قرآن فہمی کے اصول کو مدنظر رکھنے سے آیت کا مفہوم آسان ہو جاتا ہے۔

وانہ لقول رسول کریم (69/40) میں رسول کریم سے مراد حضورؐ ہیں۔ بے شک بعض مقامات میں اس کا اطلاق حضرت جبرائیل پر ہوا ہے کہ وہ رسول اللہ کے پاس اللہ کا کلام لاتے ہیں مگر یہاں وہ مراد نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ شاعر اور کاہن جبرائیل کو نہیں کہتے تھے وہ لوگ کاہن یا شاعر صرف حضورؐ کو ہی کہتے تھے یوں حقیقت میں جبرائیل کی طرف اور حضورؐ کی طرف نسبت اسی طرح ہے جیسے توفی یعنی قبض روح کی نسبت کسی جگہ ملائکہ کی طرف ہے **الذین توفهم الملئكة** (16/48) اور کسی جگہ ملک الموت کی طرف۔ قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ (32/11) لیکن اصل میں وہ فعل

اللہ کا ہے، جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا (39/42) اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں کھینچتا ہے۔ اسی طرح حضورؐ کی طرف قول کی نسبت اس لئے ہے کہ لوگوں تک وہ آپ کے ذریعے سے پہنچتا تھا۔ اور جبرائیل کا قول اس لئے کہ حضورؐ تک وہ ان کے ذریعے سے پہنچتا تھا۔ لیکن اصل میں وہ اللہ کا قول ہے۔ اسے اگلی آیت کریمہ تنزیل من رب العلمین (69/43) سے اور موکد کر دیا کہ وہ رب العالمین کی طرف سے اتارا ہوا ہے۔ لہٰذا حقیقت میں تو وہ کلام الٰہی ہے نہ وہ کلام جبرائیل ہے اور نہ کلام رسول۔

یہ آیت جس سے کچھ حضرات کو مغالطہ ہوتا تھا۔ اس کی وضاحت کے بعد اب کوئی التباس نہیں رہتا کہ یہ "قرآن ہے کلام اللہ بزبان رسول" یہ قلمی مباحثہ جناب پروفیسر حسن مظفر صاحب اور ڈاکٹر ازہر ازہری کے مابین جاری ہے برادر مکرم جناب حسین امیر فرہاد صاحب نے راقم سطور کو اس مباحثہ کی نقل ارسال فرمائی ہے اور حکم دیا کہ میں اس پر تبصرہ رقم کروں۔ یہ دونوں حضرات معروف عالم ہیں اور میرا یہ مقام و منصب نہیں کہ میں ان دونوں حضرات کے خیالات پر تبصرہ کروں۔ تاہم برادر عزیز جناب فرہاد صاحب کے حکم کے مطابق میں نے قرآن کریم کا موقف اس بارے میں بیان کر دیا ہے۔

آخر میں گذارش ہے کہ امت مسلمہ جس مشکلات و مصائب سے دوچار ہے اور اس سے نکلنے کی حد دجہ کوشش کر رہی ہے، اس میں اس قسم کے مباحث کچھ سودمند نہیں ہوں گے۔ بہتر یہ ہے کہ یہ عالی دماغ حضرات امت مسلمہ کو اس گرداب سے نکالنے کی کوشش کریں جس میں یہ امت مسلمہ غرقاب ہے۔

\#

☆ جس میں انتقام کی قوت نہیں اس کے عفو میں کیا خوبی ہے۔

☆ جس میں ہمسری کی ہمت نہیں اس کا جھک کر سلام کرنا خوئے غلامی ہے۔

☆ جس کے پاؤں کے نیچے تخت حکومت نہیں اس کا بوریا نشین ہونا گداگری ہے۔

☆ اختیار رکھتے ہوئے خود پر کنٹرول رکھنا ہی انسانیت کا شرف ہے۔

انسانوں کے باہمی معاملات کو وحی الٰہی
(قرآن) کے مطابق طے کرنا دین ہے

ابتداء آفرینش سے اللہ تعالیٰ کی ایک ہی سنت رہی ہے اور اس میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ شرائع کے فروعی احکامات میں گو مختلف صورتیں چلی آئی ہیں۔ لیکن ان سب کا مقصد صرف ایک ہی رہا ہے جو قرآن کریم نے آیہ کریمہ **وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ** (16/36) میں بیان (SUM-UP) فرما دیا ہے، اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول اس بات کے لئے ضرور بھیجا کہ لوگو! اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور انسانوں کے بنائے ہوئے ضابطہ ہائے حیات سے انکار کر دو۔

اس آیہ کریمہ میں نہ صرف قرآن کریم کی تعلیم کا ملخص بیان کر دیا گیا ہے بلکہ جملہ انبیائے کرام، حضرت نوحؑ سے لے کر، خود حضورؐ تک پر نازل کردہ وحی کا نچوڑ بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ آیہ کریمہ اس درجہ واضح ہے کہ اس کی مزید وضاحت کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ اس میں جو دو لفظ عبادت اور طاغوت کے آئے ہیں، یہ قرآن کریم کی ایسی جامع و مانع اصطلاحات ہیں کہ انہوں نے وحی کی تعلیم کو کھول کے بیان کر دیا ہے۔ لیکن ہم مسلمانوں کی بدقسمتی کہ ملوکیت کے زیر اثر ان اصطلاحوں کا صحیح مفہوم سامنے نہیں رہا۔ اور ان کا وہ مفہوم متداول ہو گیا جو عین خلاف قرآن ہے۔ اِن دونوں الفاظ کے صحیح معانی رسالہ صوت الحق کے صفحات پر بہت جگہ بیان کئے جا چکے ہیں۔ نیز لغات القرآن، جو علامہ پرویز صاحب مرحوم کی تحریر کردہ ہے اس میں بھی بیان کر دیئے گئے ہیں۔ جن سے قارئین "صوت الحق" بخوبی واقف ہیں۔ اس لئے ان کو بار بار دہرانے سے صرف مضمون کو طوالت دینا اور قارئین کرام کا وقت ضائع کرنا ہے۔ مختصراً یہی ہے کہ عبادت کا لفظ قرآن

کریم نے محکومیت کے لئے اختیار کیا ہے اور طاغوت کا لفظ بالکل اس کی ضد اور اس کے بالکل برعکس استعمال ہوا ہے۔

قرآن کریم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ اپنی اصطلاحات خود بناتا ہے اور پھر وہ اپنی ان اصطلاحات کا مفہوم چند لفظوں میں اس طرح نکھار کے واضح کر دیتا ہے کہ اس مفہوم سے گریز کی کوئی راہ نہیں رہتی۔ چنانچہ طاغوت کی تشریح کے سلسلہ میں اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ (4/60) "یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں" کہہ کر یہ بات خوب خوب واضح کر دی کہ طاغوت کوئی محض ذہنی تصور نہیں ہے بلکہ طاغوت کے معنی میں تمام وہ حاکم، وہ عدالتیں وحکومتیں، اور انسانوں کے خود ساختہ وہ نظامہائے حیات جو اللہ کے قانون (وحی الٰہی) کے علاوہ دوسرے قوانین کی رُو سے معاملات کے فیصلے کریں۔ اُن کی طرف رجوع کرنا اللہ سے انکار اور طاغوت کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ طاغوت کے مفہوم کی اس درجہ وضاحت سامنے آنے کے بعد عبادت کا مفہوم خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ عبادت سے مراد اللہ تعالیٰ کی محکومیت ہے نیز اس سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ عبادت کوئی ذہنی یا تصوراتی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اپنے روز مرہ کے معاملات، وتنازعات کو قرآن کریم کے مطابق طے کرنا ہی اللہ کی عبادت اور اللہ کے دین کی اطاعت ہے۔

انبیائے کرام پر دین ہی نازل ہوتا تھا۔ شروع سے سب انبیائے کرام یہی کہتے چلے آئے کہ اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (7/59) ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا اس نے کہا "اے میری قوم، اللہ کی محکومیت اختیار کرو، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں"۔ اسی طرح حضرت ہودؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے وَ اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ (7/65، 11/50) اور ہم نے قوم عاد کی طرف اس کے بھائی بندوں میں سے ہود کو بھیجا اس نے کہا "اے میری قوم کے لوگوں اللہ کی ہی محکومیت اختیار کرو، اس کے علاوہ

تمہارا کوئی حاکم نہیں'' ۔اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرمایا وَ اِبْـرٰهِيْمَ اِذْ قَـالَ لِـقَوْمِهِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اتَّقُوْهُ (29/16) اور ابراہیم کہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ کی محکومیت اختیار کرو۔اسی طرح حضرت یوسفؑ کو جب قید خانہ میں اللہ کے پیغام کی تبلیغ کا موقع ملا تو آپ نے یہی فرمایا امر الا تعبدوا الا ایاہ (12/39) اللہ کا فرمان یہ ہے کہ محکومیت صرف اسی کی اختیار کرو۔حضرت شعیبؑ جن قبائل کی طرف مبعوث ہوئے انہوں نے بھی ان سے یہی کہا۔وَ اِلٰى مَـدْيَنَ اَخَـاهُمْ شُعَيْبًا قَـالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰـهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (7/85، 11/84) اسی طرح مدین کی بستی میں شعیبؑ کو بھیجا گیا کہ ان ہی کے بھائی بندوں میں سے تھا۔اس نے کہا۔بھائیو اللہ کی محکومیت اختیار کرو اور اس کے علاوہ تمہارا کوئی حاکم نہیں۔اسی طرح سلسلہ رشد وہدایت کی ہر کڑی یہی کہتی چلی آئی کہ حکومت اللہ کی ہے اور اللہ کے علاوہ کسی کو حکومت سزاوار نہیں ہے۔انبیائے کرام اپنی اسی وحی کی مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ قائم کرتے تھے۔جن میں انسانوں کے معاملات وحی کی رُو سے طے کئے جاتے تھے۔لیکن ان کی تشریف براری کے بعد،ان کی قوم،ان کی وحی اور ان کی تعلیم میں آمیزش کر دیتی تھی اور ان کے اس دین کو مذہب میں تبدیل کر کے معاشرہ کو تو اپنے خود ساختہ قوانین پر متشکل کر دیتی اور عبادت کو صرف پرستش اور ذہنی تصورات تک محدود کر دیتی۔ہر نبی کی امت اسی غلط روش پر عمل کرتی یہاں تک کہ دوسرا نبی آ کر پھر دین قائم کرتا اور معاملات کے فیصلے وحی کے مطابق کرتا۔اس سلسلہ کے آخر میں حضورؐ کی بعثت ہوئی اور حضورؐ نے اپنی وحی (قرآن) کے مطابق مدینہ شریف میں اسلامی حکومت قائم کر دی۔مومنین کو یہی حکم ہوا کہ۔فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِـنُوْنَ حَتّٰى يُحَـكِّمُوْكَ فِيْمَا شَـجَـرَ بَيْنَهُمْ (4/65) یہ لوگ مومن نہیں ہوسکتے جب تک یہ اپنے متنازعہ فیہ امور کے فیصلے تجھ سے نہ کرائیں۔نیز ارشاد ہوا ومـا اختلفتم فيه من شئی فـحكمه الى الله (42/10) تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف رکھتے ہو،اس کا فیصلہ اللہ کے حوالے ہے۔چنانچہ اس حکم کے مطابق انسانوں کے تمام باہمی معاملات کے فیصلے حضورؐ خود وحی کے مطابق فرماتے تھے۔حضورؐ کے ان فیصلوں کو تسلیم کرنا،اللہ ورسول کی

اطاعت تھی۔ اللہ کا عطا کردہ دین جس کو حضورؐ نے عملاً ایک نظام کی صورت میں متشکل کر دیا تھا، اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ حضورؐ کے بعد خلافت راشدہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ جب تک وہ نظام قائم رہا اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ وہ نظام اگر اب تک جاری رہتا تو اس نظام کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی، لیکن بدقسمتی سے وہ نظام معترض ہو گیا اور اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ آج دنیا کے سارے مسلمان اللہ و رسول کی اطاعت سے محروم ہیں۔ خواہ ہم مسلمان کتنے ہی دھوکہ میں مبتلاء ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ قرآن کی رو سے ہم اللہ و رسول کی اطاعت سے قطعاً محروم ہیں۔ اللہ اور انسان کے درمیان تعلق اور واسطہ کا واحد ذریعہ اس کی کتاب اور اس کے مطابق قائم کردہ نظام ہے۔ قرآن کریم میں اس کے علاوہ اور کسی ذریعہ کا سراغ نہیں ملتا۔ نظام کے معترض ہو جانے کی صورت میں دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے اور لوگ انفرادی طور پر عبادت، اطاعت کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی رو سے یہ اطاعت اطاعت الٰہی نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ سے تعلق صرف نظام کی معرفت ہوتا ہے۔ دین و مذہب میں چند واضح امتیازات ہیں جو ہمیشہ پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ اگر دین کی مندرجہ خصوصیات نہ ہوں تو سمجھ لیں کہ دین پر نہیں، بلکہ مذہب پر عمل ہو رہا ہے، جو خلاف قرآن ہے۔

(۱) قرآن کریم نے اسلام کے لئے دین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنی ہی ضابطہ حیات کے ہیں۔ صرف اور صرف یہی ضابطہ حیات اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (3/85) جو شخص اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی خواہش کرے گا تو اس کا وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ یہ دین تمام ادیان پر غالب آ کر رہے گا (48/28) دین ہی ہماری زندگی میں ہماری آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرتا ہے جس کے مطابق ہمارے اعمال کے نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں اس پر عمل کرنے سے ہی صدر اول کے مسلمانوں کو بے مثال رفعت و عروج

حاصل ہوا تھا۔ اس پر عمل کرنے سے مسلمانوں کو یہ مقام حاصل ہوتا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (2/143) اور اس طرح ہم نے تمہیں ایک امت وسط بنایا جس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کے اعمال کی نگرانی کرے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے کہ اس قوم کو ایسی بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو کہ وہ ہر قوم سے برابر فاصلے پر ہو۔ اور بین الاقوامی معاملات کو قرآن کریم کی روشنی میں عدل وانصاف کے ساتھ سلجھائے، اور تمام متنازعہ فیہ امور کا فیصلہ وحی الٰہی کی رو سے طے کرے مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وَ لَا تَهِنُوْا وَ لَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3-139) مسلمانو نہ کاہلی کرو نہ گھبراؤ، اگر تم سچے مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے۔ اس لئے کہ تم نے قوانین الٰہی کے مطابق نظام قائم کیا ہے اور اس میں قوانین الٰہی کے مطابق تمام امور کے فیصلے ہو رہے ہیں اس میں اسی غلبہ کی طرف اشارہ ہے جو طاغوتی قوتوں کو شکست دے کر دنیا میں نظام عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے ضروری ہے۔ نیز فرمایا وَ لَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4/141)، اور اللہ ہرگز ہرگز کافروں کو مومنوں پر غلبہ حاصل نہیں ہونے دے گا۔ مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ۔

مومنے بالائے ہر بالاترے　　　غیرت او برنتا نہ ہمسرے

لیکن مسلمانوں کو یہ حیثیت اور یہ مقام یونہی مفت میں نہیں مل جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ، ایمان والو اگر تم نے اللہ کی مدد کی تو وہ تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعین کردہ نظام، اس کے دین کو دنیا میں قائم کرو، اس کے قوانین کے مطابق عمل کرو اگر تم نے ایسا کر دیا تو اس نظام اور دین کی برکات تمہارے شامل حال ہو جائیں گی اور اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ویثبت اقدامکم (47/7)، وہ تمہارے پاؤں جما دے گا تمہیں ثابت قدمی عطا کر دے گا۔ لیکن یاد رہے کہ اس میں اول قدم INITIATIVE مومنین کی طرف سے ہوگا۔ اگر مومنین یہ اول قدم نہیں اٹھائیں گے تو نہ تو اللہ کی مدد آئے گی اور نہ ہی اس کی مدد کسی طور بھی

شریک حال ہوگی۔

(۲) دین کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ دین میں فرقے نہیں ہو سکتے۔ قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30/31)، جو فرقہ بندی کرے گا اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں رہتا (6/160)، اس لئے فرمایا کہ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَ اخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۔ دیکھنا تم بھی کہیں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے اللہ کی طرف سے واضح حقائق مل جانے کے بعد فرقے بنائے اور آپس میں اختلاف کرنے لگے وَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (3/105)، یہ لوگ جو فرقوں میں بٹ جاتے ہیں اور آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں۔ ان پر سخت عذاب مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اگرچہ ہر رسول کا پیغام یہی ہوتا تھا کہ دین قائم کرو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ ہر رسول اس پیغام کے ذریعے ایک جماعت، ایک امت تشکیل دیتا تھا۔ اس کی امت کچھ وقت تو متحد رہتی تھی لیکن اس کے بعد اس میں گروہ بندیاں پیدا ہو جاتیں، اور اس کی وجہ کیا ہوتی تھی؟ قرآن کریم اس کی بھی نشاندہی کر دیتا ہے کہ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ (42/14) اللہ کی طرف سے وحی آ جانے کے بعد جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا تھا باہمی فرقہ بندی کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ اس وحی کے وارث آپس میں ایک دوسرے سے ضد کی وجہ سے فرقہ بنا لیتے تھے۔ یہ فرقہ بندی محض ہوس اقتدار کی خاطر ہوتی تھی۔

(۳) دین میں نتائج اپنی آنکھوں کے سامنے محسوس شکل میں حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ نتائج ہی اس دین کی صداقت کے دلائل ہوتے ہیں۔ اس سلسلہ میں قبیلہ بنی عامر کے ایک بزرگ کا واقعہ بہت حقیقت افروز اور چشم کشا ہے کہ وہ بزرگ حضورؐ کی دعوت کی صدا سن کے حاضر خدمت عالی ہوا۔ حضورؐ نے اس بزرگ کے سامنے اسلام پیش کیا۔ وہ اس کو بغور سنتا رہا، اور اس کے سننے کے بعد اس نے سوال کیا کہ لکل قول حقیقة و ما حقیقة قولك ۔ ہر دعوے کا کوئی نہ کوئی ٹھوس ثبوت ہوتا ہے آپ کے دعویٰ کی صداقت کا ٹھوس ثبوت کیا ہے؟ حضورؐ نے ارشاد فرمایا نعم النصر و التمکین فی

البلاد۔ بہترین فتوحات اور مختلف ممالک پر حکومت۔ یہ محض نظری یا اعتقادی گفتگو نہیں تھی بلکہ کچھ عرصہ کے بعد یہ دعویٰ حقیقت بن کے سامنے آ گیا یہی وہ یقین محکم تھا کہ جس کی بناء پر حضورؐ کبھی اعلان فرماتے "زمین کے مشرق و مغرب کے علاقے میرے ہاتھ میں دیئے گئے ہیں" کبھی اپنے صحابہ بلند مرتبت سے فرماتے "قیصر و کسریٰ کی بادشاہوں کا خاتمہ ہو جائے گا"۔

عربوں کی معاشرت بہت سادہ تھی اور ان کے مقابلہ میں ایرانیوں کی معاشرت بہت پُر تکلف اور SOPHISTICATED تھی۔ عرب اپنی تصورات کی دنیا میں اس طرح کی معاشرت حاصل کرنے کے لئے WISHFUL THINKING کرتے تھے، اور اس بات کی طمع کرتے تھے کہ ان کے پاس بھی موتی، جواہرات، زمرد کنگن، اطلس، حریر اور اس قسم کی اشیاء ہوں۔ قرآن کریم نے ان سے ان تمام چیزوں کے حصول کے وعدے کئے تھے۔ چنانچہ فتح ایران کے بعد اُن کو وہ ساری چیزیں مل گئیں جن کے وہ خواہشمند تھے۔ فتح قادسیہ کے بعد حضرت سعدؓ نے فتوحات کے اموال کی جو فہرست ارسال فرمائی تھی، اس میں وہ تمام قیمتی اشیاء مندرج تھیں جن کا وعدہ قرآن میں کیا گیا تھا۔ خود مشرکین عرب حضورؐ سے مطالبہ کرتے تھے کہ ہم تو تم پر اس وقت ایمان لائیں گے جب لَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ (17/91)، یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ فرمایا جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ (25/10) "وہ تجھے ان چیزوں سے جن کا یہ مطالبہ کر رہے ہیں بدرجہا بہتر چیزیں دے گا ایک باغ چھوڑ کئی باغ" پھر انہوں نے مطالبہ کیا کہ یَکُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ (17/93) یا تیرے لئے سونے کا ایک محل ہو۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا (25/10)، نیز (قیصر و کسریٰ کے) محلات تمہیں حاصل ہوں گے اس کے علاوہ یہ کہ حضورؐ کی حیات طیبہ میں ہی دس لاکھ مربع میل پر اسلامی حکومت وسیع ہو چکی تھی۔ اور حضرت عمر فاروق کے دور میں تو بائیس لاکھ مربع میل کا رقبہ ان کے زیر حکومت تھا۔ یہ اسلامی نظام اور دین الٰہی پر عمل کرنے کے محسوس نتائج تھے جو اس وقت مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے حاصل ہو گئے تھے لیکن مذہب میں نتائج سامنے نہیں آتے

،ان کے لئے اُخروی زندگی میں وعدے کئے جاتے ہیں۔

حضورؐ نے اپنی حیات مبارکہ میں دین قائم فرمایا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت قرار دی گئی تھی۔خلافت راشدہ میں یہی نظام قائم تھا۔اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت قرار پائی۔بدقسمتی سے وہ نظام معترض ہوگیا اور دین مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ اب چونکہ باب نبوت بند ہو چکا ہے اور کوئی نیا نبی نہیں آئے گا،اس لئے ختم نبوت کے بعد ہم مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ ہم دین کے نظام کو قائم کریں۔ اس کے قیام کی اہمیت ولابدیت سے تین وجوہ کی بناء پر انکار نہیں کیا جاسکتا۔ایک تو یہ کہ اس کا قائم کرنا ہمارا دینی فریضہ ہے۔اس کے قیام کے بغیر ہم اطاعت الٰہی سے محروم ہیں۔دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے عملی نتائج،اس کی برکات وثمرات صدر اول کے مسلمانوں کو جو حاصل ہوئے وہ یقیناً اس کے برحق ہونے اور اسکے دعویٰ کی دلیل ہیں۔اور اگر ہم نے اس نظام کو قائم کرلیا تو ضروری ہے کہ ہم بھی ان برکات وثمرات سے مالا مال ہوں گے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس وقت ساری دنیا اپنے خودساختہ نظامہائے حیات سے بیزار ہے۔خصوصاً مسلمان اپنی تباہی و بربادی کی وجہ سے قرآن کی طرف آرہے ہیں۔اس دور میں جس قدر کام قرآن کریم پر ہو رہا ہے شاید ہی کسی صدی میں اس سے پیشتر کبھی ہوا ہو۔اس وجہ سے بھی مسلمان چاہتے ہیں کہ قرآن کا نظام قائم کریں۔لیکن ان تینوں وجوہات کے باوجود یہ نظام نہ تو اب تک قائم ہوا،اور نہ ہی مستقبل قریب میں اس کے قیام کی کوئی کرن نظر آتی ہے۔ کیونکہ اس کے قیام میں یہ موانعات پیش آرہے ہیں۔

(۱) ہمارا سارا ایک ہزار سال کا لٹریچر اسلام کو بطور مذہب کے پیش کرتا ہے۔ قرآن کریم کی جملہ تفاسیر،احادیث مبارکہ،فقہ،سب کچھ مذہب کے زیر اثر تحریر کیا گیا ہے ۔آپ ان تمام تفاسیر کا مطالعہ فرمائیں۔ان جملہ تفاسیر میں دین یا نظام کی کوئی رمق دکھائی نہیں دے گی۔وہ آیات کریمات جو واضح طور پر دین کی داعی ہیں ان کا مفہوم بالکل بدل کے رکھ دیا گیا ہے اس مضمون کا اختصار اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ان آیات کو پیش کیا جائے جن سے دین کا تصور مذہب میں تبدیل کیا گیا ہے۔تاہم اگر قارئین کرام کا اصرار

ہوگا تو وہ آیات بھی سینکڑوں کی تعداد میں پیش کر دی جائیں گی۔ یہی حال حدیث شریف اور فقہ کا ہے۔ ہماری فقہ کا تو سارا مطمع نگاہ اور مقصد ہی اس زمانہ کی ملوکیت کے مفادات کا تحفظ تھا۔ اس موضوع پر راقم سطور کا مضمون ''اسلامی فقہ کی حقیقت'' ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

دین کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا یہ ایک ہزار سال کا ''علمی سرمایہ'' ہے ہمارے علمائے کرام اس لٹریچر کے نمائندے ہیں اور وہ کسی حال میں اس لٹریچر کو چھوڑ نہیں سکتے۔ نیز یہ کہ وہ اس لٹریچر کے اثر کی وجہ سے مذہب کے معیار سے بلند نہیں ہوسکتے۔ ان کے سامنے دین کا تصور آہی نہیں سکتا۔

(۲) یہی حال ہماری تاریخ کا ہے۔ تاریخ جب تحریر کی گئی ہے اس وقت فرقے وجود میں آچکے تھے۔ ہماری ساری تاریخ فرقہ بندی کے زیرِ اثر لکھی گئی ہے۔ ہماری تاریخ ہی مسلمانوں کو آپس میں لڑاتی ہے۔ تاریخ نویسی کے جو اصول ہوتے ہیں ہماری تاریخ میں ان کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔ ہر آنے والی حکومت سابقہ حکومت کو اس لئے بُرا لکھتی ہے کیونکہ آنے والی حکومت نے سابقہ حکومت سے اقتدار بزور حاصل کیا ہوتا ہے۔ یہی حال ہماری تاریخ کا ہے ہماری ساری تاریخ بنو عباس کے دور میں تحریر ہوئی ہے۔ اس لئے انہوں نے بنوامیہ کو خوب بُرا لکھا ہے۔ خصوصاً امیر معاویہ کی بہت کردار کشی کی گئی ہے۔ بنوعباس کے دور میں تخت نشینی وجانشینی کے معاملہ میں ہمیشہ جھگڑے اور کشت خون ہوئے ہیں۔ اس کشت خون کے جواز کے لئے تاریخ نے جنگ صفین وجنگ جمل کے واقعات بنائے اور یہ ثابت کیا کہ جب حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے مابین جانشینی کے سلسلہ میں خون ریزی ہوسکتی ہے تو خلفاء بنی عباس نے اگر ایسا کیا تو یہ کون سی نئی بات ہے۔ آپ ہزار مرتبہ علمائے کرام سے کہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے صحابہ آپس میں لڑ نہیں سکتے تھے (48/29، 19/96) لیکن وہ جنگ جمل وجنگ صفین کے وقوع سے کبھی انکار نہیں کریں گے۔ جو جماعت بھی دین کے قائم کرنے کے لئے اُٹھے گی اسے ایک ہزار سال کے لٹریچر سے نہ صرف، صرف نظر کرنا ہوگا بلکہ اسے علی الاعلان مسترد کرنا ہوگا۔ قرآن کریم کی صحیح تفسیر جو دین کے نقطہ نگاہ سے، تصریف آیات سے تحریر کی جائے وہ ہی پیش نظر رکھنی ہوگی۔ اور علماء کرام کا سخت مقابلہ در

پیش ہوگا۔

(۳)تصوف کا لٹریچر بھی ہزار سال سے برابر چلا آرہا ہے۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر بات کرنا گویا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے۔طول طویل بحثیں جن کا خاتمہ ہی نہیں ہوتا۔جن پر گفتگو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتی۔لیکن تصوف کے بارے میں ایک بات قطعی ہے کہ تصوف دین کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔تصوف تو ایجاد ہی دین کے متوازی کیا گیا ہے۔ اس کا تو بنیادی نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اطاعت الٰہی انفرادی طور پر ہوتی ہے اور ہر شخص کا براہ راست اللہ سے تعلق قائم ہوسکتا ہے ۔تصوف اور دین دونوں ایک دوسرے کے متضاد ومتناقص ہیں۔لیکن ہمارے ہاں تصوف کا بہت اثر ہے۔ہم جن بڑے بڑے اولیاء کرام کی عزت کرتے ہیں، اور جن کا نام سن کر ہماری آنکھیں تعظیماً جھک جاتی ہیں وہ سب نظری طور پر دین کے خلاف تھے۔جب تک ان کا اثر قائم رہے گا،دین کا قیام اس وقت تک ممکن نہیں ہے۔

(۴)فرقہ بندی دین کے قیام میں ایک رکاوٹ ہے۔کیونکہ سب سے پہلے یہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی نظام میں کون سا فقہ رائج ہوگا۔فرقہ بندی ہوتی ہی مذہب میں ہے۔دین میں تو فرقہ بندی ہو ہی نہیں سکتی۔ ہر اسلامی حکومت کا قانون اس کا فقہ یا اس کی شریعت ہوتی ہے۔ اس لئے جب بھی مسلمانوں کی قسمت نے یاوری کی ،اور اسلامی نظام قائم ہوا،تو اس نظام کا قانون ہی اس کا فقہ ہوگا، وہ چونکہ اسلامی حکومت کے مرکز کی طرف سے نافذ ہوتا ہے اس لئے ہر شہری کو اس کی اطاعت کرنی ضروری ہوتی ہے اور اس کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔اس لئے اس میں فرقہ بن ہی نہیں سکتا نہ ہی اسلامی حکومت میں پبلک اور پرسنل لاء کی تفریق ہوتی ہے۔اور نہ معاملات وعبادات الگ الگ ہوتے ہیں۔معاملات وعبادات یکساں اور ایک طرح کے ہونے کی مثال یہ ہے کہ قرآن کریم میں حکم ہوا کہ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5/8)عدل کرو کہ وہ تقویٰ کے قریب ہے،اسی طرح حکم ہوتا ہے کہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (22/78)صلوۃ قائم کرو اور زکوۃ ادا کرو۔ عدل کرنے کے طور طریقے حضورؐ کے زمانے میں بالکل ابتدائی درجہ کے اور آسان وسہل تھے۔ مسجد میں دونوں پارٹیاں جمع ہوگئیں گواہوں اور قسموں پر

انحصار کر کے فیصلہ صادر کر دیا جاتا تھا۔ معاشرت کی ترقی کے ساتھ ساتھ عدل کے طریقوں میں تبدیلیاں ہوتی گئیں ۔ آج عدل کا طریقہ اس دور سے بالکل مختلف ہے۔ بڑی بڑی عالیشان عدالتیں، جرائم کے ثبوت و تفتیش میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اب انگوٹھے کے نشانات، فوٹوسٹیٹ کاپیاں، خون کے ٹیسٹ، ٹیپ کئے ہوئے بیانات، DNA کے ٹیسٹ یہ سب عدل کے حصول میں استعمال ہونے لگے۔ جس طرح عدل کے طور طریقوں میں تبدیلیاں ہوئیں اسی طرح صلوٰۃ و زکوٰۃ کے طور طریقوں میں بھی تبدیلیاں ہوسکتی ہیں، کیونکہ قرآن کی رُو سے معاملات و عبادات میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ لیکن یہ واضح رہے کہ یہ تبدیلیاں صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے۔ نہ تو افراد کو یہ تبدیلیاں کرنے کا حق ہے اور نہ غیر اسلامی حکومتوں کو۔

فرقہ بندی کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اگرچہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی قطعاً منع ہے اور شرک ہے۔ لیکن فرقہ بندی ہمارے علماء کرام ہی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ مذہبی مدارس الگ الگ ہیں۔ جامعہ اشرفیہ دیو بندی حضرات کا مشہور ادارہ ہے تو جامعہ نعیمہ بریلوی حضرات کا ہے۔ **الجامعة المنتظر** شیعہ حضرات کا ہے اور مدرسہ تقویۃ الاسلام، اہل حدیث حضرات کا ہے ۔ ان سب کا الگ الگ ہونا شرک کا ارتکاب ہے۔ عام علمی مباحثوں۔ T.V چینلو میں علماء کرام سینہ تان کر کہتے ہیں کہ ہمارے فقہ میں یوں ہے اور ہمارے فرقہ کا یہ نظریہ ہے۔ لیکن ہم علماء حضرات سے ہی رواداری اور فرقہ بندی کم کرنے کی اپیل کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں گورنمنٹ کی طرف سے جس قدر ادارے فرقہ بندی کم کرنے اور رواداری بڑھانے کے ہیں، ان میں علماء کرام ہی مقرر ہوئے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے کہ علماء کرام جو خود فرقہ بندی کے بانی اور اس کو پروان چڑھانے والے ہوں وہ فرقہ بندی کے خلاف کام کریں گے؟۔ اس سے تو ان کا اپنا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ فرقہ تو بنتا ہی جب ہے جب متنازعہ فیہ امور کو ہوا دی جائے اور ان کی گرہوں کو مضبوط کیا جائے۔

(۵) دین کے قیام میں ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ ہم دین کا قیام بھی چاہتے ہیں

اوراس کے ساتھ ساتھ مذہب کے زیر اثر انفرادی اور ذاتی عبادت واطاعت کے بھی قائل ہیں۔ اگر دین کے قیام کے بغیر بھی اللہ ورسول کی اطاعت ہوسکتی ہے تو پھر وہ کون سادہ لوح ہوگا کہ دین کے قیام کی کوشش کرے گا۔ دین یا اسلامی نظام کا قیام کوئی آسان کام نہیں ہے اس کے لئے ایک طویل جدوجہد اور قربانیوں کی ضرورت ہوگی۔ یہ صورت صرف اس وقت ہوگی کہ ہم اس بات کے قائل ہوں کہ براہ راست اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی اس کی اطاعت کا واحد ذریعہ اس کا نظام ہے۔ لیکن اگر ہم دوکشتیوں پر سوار رہے اور مذہب کی انفرادی عبادات کو بھی اطاعت الٰہی شمار کرتے رہے اور ساتھ ساتھ دین کے قیام کی بھی کوشش کرتے رہے، تو دین کبھی بھی قائم نہیں ہوسکتا۔ اسلامی نظام کی اطاعت سے ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ وہ اساس محکم ہے جس پر اس نظام کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اس نظریہ کو نکال دیں اور انفرادی اطاعت کے بھی قائل رہیں تو پھر یہ دین قائم نہیں ہوگا۔ انفرادی اطاعت اور دین کے فرق کے سلسلہ میں مفہوم القرآن سے چند سطور پیش کی جاتی ہیں جو اس مسئلہ کو مزید واضح کرتی ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ہمارا سلسلہ ہدایت محض نظری عقائد اور رسومات کے لئے نہیں آتا۔ نہ ہی دین اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ تعلق کا نام ہے کہ زبان سے اللہ کا اقرار کرلیا اور پھر جس طرح جی چاہا اپنے اپنے طور پر زندگی بسر کرتے رہے دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے جو سب سے پہلے خود رسول کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے اور اس میں اس کی حیثیت مرکزی اتھارٹی کی ہوتی ہے۔ قانون الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت، اللہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اپنے اپنے طور پر، اپنے اپنے ذہن کے مطابق "اللہ کی اطاعت" اطاعت الٰہی نہیں کہلاسکتی۔ مفہوم القرآن آیت (4/64)

اس سے چند سطور آگے ارشاد ہے دین کے نظام میں 'مجرم'، رسول اور اللہ کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔ نہ مجرم براہ راست اللہ سے معافی طلب کرسکتا ہے نہ اللہ اسے براہ راست معافی دیتا ہے۔ یہ سب کچھ اس نظام کی وساطت سے ہوتا ہے

جو قوانین الٰہی کے نفاذ کے لئے قائم ہوتا ہے۔ اور جب یہ نظام اسے معافی دیتا ہے تو یہ معافی اس نظام کی طرف سے نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی طرف سے ہوتی ہے کیونکہ یہ اس کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کا واحد ذریعہ وہ نظام ہوتا ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ آج ساری دنیا کے مسلمانوں میں اسلام بطور مذہب کے رائج ہے اور دنیا کے کسی خطے اور مسلمانوں کے کسی ملک میں ایک گز زمین پر بھی اسلام بطور دین کے رائج نہیں ہے۔ سب سے پہلے مسلمانوں میں یہ انقلابی نظریہ رائج کرنا ہوگا کہ ذاتی، انفرادی اطاعت کا تصور باطل ہے۔ جب ہی لوگ دین کے قیام کے لئے مُصر ہوں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اسلام کو ہمیشہ صرف مذہب کی سطح (LEVEL) پر ہی رکھا 1857ء کے غدر کے بعد، عیسائی پادری فوج در فوج اور غول در غول ہندوستان میں وارد ہوئے تاکہ یہاں عیسائیت کی تبلیغ کریں۔ ہمارے علماء کرام نے ان کا ڈٹ کے مقابلہ کیا مولوی محمد قاسم صاحب نانوتوی اور مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی ان میں پیش پیش تھے۔ عیسائی پادریوں میں پادری فنڈر FINDER اور پادری سیل (SALE) زیادہ نمایاں تھے۔ عیسائی پادری عیسائیت کو بہترین مذہب کے طور پر پیش کرتے تھے کیونکہ عیسائیت تو ہے ہی مذہب وہ تو خود ہی دین کی مدعی نہیں ہے۔ ہمارے علماء کرام بھی اسلام کو برحق مذہب کے طور پر پیش کرتے تھے۔ اگر ہمارے علماء کرام کے سامنے دین کا تصور ہوتا تو یہ قابل عزت حضرات، اسلام کو جمہوریت کے مقابلہ میں پیش کرتے کہ اسلام کا نظام حیات جمہوریت کے نظام سے بہتر ہے۔ ہمارے وہ علماء کرام، نہایت درجہ مخلص ایثار پسند، جانفروش اور حوصلہ مند تھے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ اسی طرح تقسیم ہند کے وقت ہمارے علمائے کرام سب کانگریس کے طرفدار تھے اور ہندوستان میں اپنے حقوق منوانا کافی سمجھتے تھے۔ اسی طرح ہمارے سابقہ اولیاء کرام، جنکے ناموں کے سامنے ہمارے سر جھک جاتے ہیں، کسی نے بھی ہندوستان کے کسی بادشاہ کو دین قائم کرنے کی تلقین نہیں کی۔

اگر ہندوستان کے کسی حصہ میں بھی دین قائم ہوجاتا تو یہاں کی ہندو آبادی، اس نظام کی خوبیوں، اچھائیوں اور اس کے ثمرات و برکات کو دیکھ کر، مسلمان ہوجاتی۔ وہ اپنی انفرادی عبادت گذاری میں ہی مصروف رہے۔ اور اسی میں ہمہ تن مشغول۔ خانقاہیں اور عبادت خانہ ہی آباد کرتے رہے۔ آج کل بھی پاکستان میں جس قدر اسلام کا چرچا ہورہا ہے اور اسلام پر کام ہورہا ہے، گورنمنٹ لاکھوں روپے خرچ کر کے مختلف ادارے بنارہی ہے۔ یہ سب مذہب کے فروغ کے لئے ہو رہا ہے۔ دین سے اس کو کوئی علاقہ نہیں۔ جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ ہماری T.V چینلو نے پوری کر دی۔ ان چینلو پر ہر وقت مذہب کو فروغ دیا جارہا ہے اور قوم کو مزید غارت کیا جارہا ہے۔ اطاعت الٰہی کے سلسلہ میں دو نظریات متداول ہیں، قارئین کرام ان کو بغور ملاحظہ فرمائیں۔

ایک نظریہ تو یہ ہے کہ حضورؐ نے جو نظام متشکل فرمایا تھا اس کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ نظام کوئی وقتی یا ہنگامی نہیں تھا۔ اس کو ہمیشہ کے لئے رہنا تھا۔ اس لئے حضورؐ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق کی اطاعت اللہ ورسول کی اطاعت تھی۔ یہ نظام اگر جاری رہتا اور اب تک چلا آتا تو اس کی اطاعت ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی۔ اس نظام کی ساخت کے اندر دو خصوصیات ازخود مضمر ہوتی ہیں۔ وہ دونوں خصوصیات اس میں INHERENT اور IN-BUILT ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس نظام میں اطاعت ایک زندہ اور محسوس اتھارٹی کی ہوتی ہے جو احکامات نافذ کرتی ہے اور ان کی اطاعت کراتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں دو مطاعوں کی اطاعت صرف ایک کی اطاعت ہوتی ہے۔ یہ دین کا نظریہ ہے اور قرآن کریم کے مطابق ہے۔

دوسرا نظریہ جو ہمارے علماء کرام کا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے کسی بھی نظام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر شخص انفرادی، بذاتی، پرائیوٹ طور پر اللہ ورسول کی اطاعت کرسکتا ہے۔ اس میں زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ کتابوں کی اطاعت سے ازخود اطاعت ہوجاتی ہے۔ جو کوئی بھی حضورؐ سے منسوب کردہ روایت کہہ دے، اس کی اطاعت سے حضورؐ کی اطاعت ہوجاتی ہے۔ اس اطاعت کے لئے

اقتدار، غلبہ، اپنی حکومت کی کوئی شرط نہیں ہے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کے مسلمان بخوبی اللہ ورسول کی اطاعت کر رہے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کے مطابق یہ نظریہ درست نہیں ہے۔ قارئین کرام بغور ملاحظہ فرمائیں کہ یہ دو نظریات ساتھ ساتھ متداول ہیں۔ ہم قرآن کریم کی روشنی میں پہلے نظریہ کو درست اور دوسرے نظریہ کو جو علماء کرام کا ہے، بالکل باطل اور قرآن کے خلاف ثابت کریں گے۔ اس کے لئے دلائل ملاحظہ فرمائیں۔

پہلے نظریہ کی تائید میں ایک دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے زندہ، محسوس اتھارٹی کا ہونا اس لئے ضروری ہے کیونکہ پہلے اس محسوس اتھارٹی کے احکامات کو سنا جاتا ہے، پھر اس کے بعد اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اطاعت کے لئے ''سماعت'' کو شرط (PRE-REQUISITE) قرار دیا ہے، بغیر 'سماعت' کے اطاعت نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل پانچ آیات کریمات پیش خدمت ہیں۔

(۱) وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2/285) اور کہنے لگے اے پروردگار ہم نے (تیرا ارشاد) سنا اور مان لیا ہمیں تیری ہی مغفرت کی خواہش ہے اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

(۲) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اے ایمان والوں اللہ اور رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو جب تم سن رہے ہو۔

(۳) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24/51) ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تاکہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کردیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

(۴) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَ مَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (64/16) تو جہاں تک تم

سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو، اور سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو اور جو شخص اپنی حرص سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

(۵) وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ (5/7) اور جو احسانات اللہ نے تم پر کئے ہیں ان کو اور اس عہد کو یاد کرو جس کا تم سے پکا اقرار لے چکا ہے جب تم نے یہ کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مان لیا۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ مجرد کتابوں کی اطاعت سے "سمع" کی شرط پوری نہیں ہوتی۔ نیز یہ کہ آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ ان سب آیات کریمات میں سمعنا ' واطعنا ' کے الفاظ جمع کے صیغے میں آئے ہیں اس سے واضح ہے کہ اطاعت الٰہی اجتماعی نظام میں ہی ممکن ہے۔ پہلے نظریہ کی تائید میں دوسری دلیل یہ ہے کہ ان دو مطاعوں کی اطاعت قرآن کریم ایک اطاعت قرار دیتا ہے۔ اسلامی نظام میں قوانین تو اللہ تعالٰی کے ہوتے ہیں لیکن اُنہیں جاری و نافذ، اس کا رسول کرتا ہے، اس لئے اس نظام کی اطاعت سے اللہ و رسول دونوں ہی کی اطاعت ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ نظام ایک ہے اور اس کی مرکزی، اتھارٹی ایک ہے، اس لئے ان دو مطاعوں کی اطاعت کو قرآن کریم ایک اطاعت گردانتا ہے۔ اس کے لئے مندرجہ ذیل آیات کریمات ملاحظہ فرمائیں۔ یَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ وَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ (9/62) (مسلمانوں) یہ لوگ تمہارے سامنے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تمہیں راضی کرلیں حالانکہ اگر یہ لوگ سچے ایمان دار ہیں تو اللہ اور اس کا رسول کہیں زیادہ حق دار ہے کہ اس کو راضی رکھیں۔ دیکھئے یہاں اللہ و رسول کے لئے ضمیر تثنیہ نہیں بلکہ واحد لائی گئی ہے۔ بلکہ یرضوہ میں ضمیرہ واحد ضمیر لائی گئی ہے۔

(۲) اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ (9/74) اُنہیں اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل (بیت المال) سے غنی کر دیا۔ یعنی واحد مرکزی نظام نے جو اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے اس نے اُنہیں غنی کر دیا۔

(۳) سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ رَسُوْلُهٗۤ (9/59) اللہ اور اس کا رسول

اپنے فضل سے ہم کو دے گا۔

ان تینوں مقامات میں اللہ و رسول کے لئے واحد کی ضمیر لا کر واضح کر دیا کہ اللہ و رسول کے الفاظ ایک قرآنی اصطلاح کے طور پر آئے ہیں اور اس سے مراد اس نظام کی مرکزی اتھارٹی ہے جو نظام خود حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔

(۴) اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِي سَبِيْلِه (9/24)

تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ عزیز ہیں۔ یہاں پھر ضمیر واحدہ لا کر واضح کر دیا کہ یہ اطاعتیں ایک ہی ہیں۔

(۵) یہودیوں نے مدینہ شریف میں اس عہد کو توڑا تھا جو اُنہوں نے حضورؐ سے باندھا تھا۔ اس عہد شکنی کو اللہ و رسول کی مخالفت کہہ کر پکارا گیا ہے اس لئے کہ یہ مخالفت نظام اسلامی کی مخالفت تھی۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَمَنْ يُّشَاقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (59/4) یہ اس لئے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے اور جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ بہت شدید العقاب ہے۔

ان تمام آیات سے ظاہر ہے کہ یہ اطاعت اگر چہ دو مطاعوں کی ہے، لیکن یہ ایک اطاعت ہے۔ اور اس سے مراد اسلامی نظام کی مرکزی، زندہ، محسوس اتھارٹی ہے۔ اس کے لئے مزید آیات ملاحظہ فرمائیں (33/57، 9/1، 24/63، 8/46، 9/107، 8/13، 58/5، 58/70، 33/36، 58/8، 58/21، 9/62، نیز اس کے علاوہ بھی متعدد آیات ہیں) آپ نے غور فرمایا کہ پہلے نظریہ کی تائید میں یہ آیات ظاہر کر رہی ہیں کہ ان دو مطاعوں کی اطاعت صرف ایک اطاعت ہے اور اس اطاعت سے پیشتر 'سماعت' لازمی ہے۔ جبکہ دوسرے نظریہ کی رُو سے (جو علماء کرام کا ہے) یہ اطاعتیں دو الگ الگ اطاعتیں ہیں۔ اس دوسرے نظریہ کے مطابق اللہ کی اطاعت قرآن سے ہو جاتی ہے اور رسول کی اطاعت روایات کے ذریعے ہوتی ہے اور اس میں کسی زندہ اتھارٹی کا ہونا بھی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ کتابوں سے از خود اطاعت ہو جاتی ہے۔ لیکن جیسا کہ ان تمام مندرجہ آیات سے واضح ہے کہ اس دوسرے نظریے کے دونوں موقف غلط اور قرآن کے خلاف ہیں۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آج کھڑے ہیں اور یہی اس مسئلہ کا مشکل ترین مقام (CRUX) ہے۔

پہلا نظریہ دینی و قرآنی ہے۔ دوسرا نظریہ مذہبی، روایتی، اور مولویانہ ہے سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اب اگرچہ مسلمان مذہب کو چھوڑ کر دین کی طرف آرہے ہیں اور اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں تاہم ان کے سامنے دین کا تصور واضح نہیں ہے وہ مذہب کو ہی بطور دین قائم کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمان روایات کو چھوڑنے کو تیار نہیں اور اطاعت رسول روایات کے ذریعے ہی کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جب تک مسلمان روایات کے ذریعے اطاعت رسول کریں گے اسلامی نظام قائم نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی نظام کی تو شرط ہی یہ ہے کہ اس کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت گردانا جائے یہی وہ اساس محکم اور عروۃ الوثقٰی ہے جس پر اسلامی نظام قائم ہوتا ہے اور اسی MOMENTUM (حرکت درونی) کی بنیاد پر وہ قائم رہتا ہے۔ اگر اس اساس و بنیاد کے بغیر آپ نے اسلامی نظام قائم کرنا چاہا تو اول تو وہ قائم ہی نہیں ہوسکتا اور اگر وہ قائم بھی ہوا تو وہ جلد ناکام ہوجائے گا۔ یہی وہ بنیادی غلطی ہے جو ایران میں ہوئی ہے اور اسی غلطی کی وجہ سے وہاں کا اسلامی نظام ناکام ہوا ہے۔ اور یہی وہ غلطی ہے جو یہاں پاکستان میں ہماری وہ مذہبی جماعتیں کر رہی ہیں جو اسلامی نظام قائم کرنے کے لئے کوشش کر رہی ہیں۔ بہر حال اللہ کا وعدہ ہے کہ اسلامی نظام تو قائم ہوکر ہی رہے گا (61/9, 48/28, 9/33) اسلامی نظام کو قائم کرنے کی فرضیت و اہمیت کے بارے میں بہت مواد صوت الحق' کے مختلف پرچوں میں بکھرا پڑا ہے۔ اگر کسی صاحب کو دلچسپی ہو تو راقم سطور کا مضمون اساس محکم طبع شدہ بابت ماہ اکتوبر 2004ء مطالعہ فرمالیں۔ یہاں صرف دو آیات کریمات تحریر کرنے پر اکتفاء کیا جاتا ہے تاکہ مضمون طویل نہ ہو۔ ان دو آیات سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ اسلامی نظام قائم کرنا کس درجہ ضروری ہے۔

(ا) وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (6/124) یہ ہے وہ نفسیاتی کیفیت جس کی

بناء پر ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے کہ جہاں کسی نے اللہ کے عالمگیر نظام ربوبیت کی دعوت دی وہاں ان کے اکابر مجرمین نے اس دعوت کی مخالفت کے لئے منصوبے باندھنے شروع کر دیئے اگر وہ ذرا بھی عقل وشعور سے کام لیتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ ان کی اس منصوبہ بندی میں خود اُن کا اپنا نقصان تھا اس لئے کہ نظام الٰہی کا قیام ان کی بہتری کے لئے تھا۔ قرآن کریم سلب ونہب اور ظلم واستبداد پر مبنی نظام کے ارباب حل وعقد کو "اکابر مجرمین" کہہ کر پکارتا ہے اس کی رُو سے، مجرم تو اس نظام کے تمام افراد ہوتے ہیں، لیکن ان میں سے اکابر مجرمین ارباب اقتدار (لیڈر) ہوتے ہیں۔ از مطالب الفرقان جلد پنجم صفحہ 120

(۲) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (4/97)

اب رہے وہ جو غیر الٰہی نظام کے تحت اطمینان سے بیٹھے زندگی بسر کرتے ہیں اور اس طرح اپنی ذات کا نقصان کرتے رہیں۔ اگر اسی حالت میں ان کو موت آ جائے تو ان سے پوچھا جائے گا کہ تمہیں کیا ہو گیا تھا کہ تم غیر الٰہی نظام کی محکومی میں پڑے رہے؟ وہ کہیں گے کہ ہم بہت کمزور وناتواں اور بے بس ومعذور تھے ان سے کہا جائے گا کہ (یہ ٹھیک ہے کہ تم میں اتنی قوت نہیں تھی کہ تم وہاں بالکل نظام بدل کر، نظام الٰہی قائم کر لیتے لیکن) اللہ کی زمین اس قدر وسیع تھی کیا تم ہجرت کر کے کسی ایسے مقام کی طرف نہیں جا سکتے تھے جہاں نظام الٰہی قائم تھا یا جہاں کی فضا اس کے لئے سازگار تھی۔ یہ لوگ جو اپنی کمزوری اور ناتوانی کا سہارا لے کر غیر الٰہی نظام کے تابع ومطمئن ہو کر بیٹھے رہیں، ان کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانہ ہے، یہاں بھی جہنم، کہ طاغوتی نظام کی غلامی میں رہے اور وہاں بھی جہنم کہ ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوتی۔ (ماخوذ از مطالب الفرقان جلد چہارم صفحہ 399)

فلہذا قرآن کریم کی رو سے مومن وہ ہے جو قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد، مکمل، اور آخری ضابطہ حیات خیال کرے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس

دنیا میں نظام الٰہی (جو قرآن کریم پر مبنی ہو) کے قیام کے لئے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور مقام میں بھی ہو، وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے کیونکہ نظام الٰہی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظامہائے حیات کو جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور نظام کو جاری کر دے اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہوں ان کے لئے ضروری ہے کہ اللہ کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضا مند ہوں، وہ اللہ و رسول کے باغی، عادی، غدار اور نافرمان ہیں خواہ وہ کتنے ہی نماز اور روزوں کے پابند اور عشق رسول کے دعویدار ہوں۔

محمد عربی کہ آبروئے ہر دو سرائی است   کسے کہ خاک درش نیست خاک بر سر او

==========☆☆☆==========

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ذاتی معاملہ میں "درست" پر چلنے میں زندگی کا سفر رکتا نہیں وہ برابر جاری رہتا ہے۔ مگر اجتماعی معاملہ میں ایسا کیا جائے تو فریق ثانی کی مخالفت فوراً آپ کے سفر کو روک دیتی ہے۔ اب سفر کو ملتوی کر کے ساری طاقت نزاع کے محاذ پر خرچ ہونے لگتی ہے۔ اس لئے مفید اور نتیجہ خیز طریقہ یہ ہے کہ فریق ثانی کے مطالبہ کی رعایت کرتے ہوئے عمل کی جو ممکن صورت مل رہی ہے، اس کو اختیار کر لیا جائے۔ حال کو مستقبل کے حوالے کرتے ہوئے اپنا سفر جاری رکھا جائے۔ یہی اس دنیا میں زندگی گزارنے کا حکیمانہ طریقہ ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اذا زلزلت الارض

8- اکتوبر کی صبح، اسلام آباد اور شمالی علاقہ جات میں جو زلزلہ آیا تھا، وہ بڑا ہی قیامت خیز اور تباہ کن تھا۔ پاکستان کی تاریخ میں اس سے پیشتر اس قسم کا زلزلہ کبھی نہیں آیا تھا۔ اس سے لاکھوں گھر ویران ہو گئے اور ہزاروں ناگہانی موت کے صدمے سے دوچار ہوئے۔ یہ حادثہ فاجعہ اور سانحہ داہیہ اس طرح اچانک واقع ہوا کہ اس کے وقوع سے پیشتر کسی قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ اسکول میں معصوم بچے، جو نہایت سکون واطمینان سے اپنی تعلیم میں مصروف تھے، چند ہی منٹوں میں موت کی آغوش میں چلے گئے۔ اور افسوس کہ ماں باپ، اس قدر بے بس تھے، کہ وہ اپنے نونہالوں کو موت سے نہیں بچا سکے۔

زلزلہ کیا تھا قیامت تھی لیکن اس واقعہ سے یہ اندازہ ہو گیا کہ ہماری قوم کوئی مردہ یا بے بس قوم نہیں ہے۔ توقعات سے زیادہ عوام نے اس مصیبت میں ایک دوسرے کی مدد کی۔ پاکستان کا کوئی فرد ایسا نہ تھا جو کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگرچہ فوج نے اپنا کردار بہت اچھی طرح ادا کیا، لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ فوج کے آنے سے پیشتر ہی ہمارے عوام مرگلہ ٹاور پہنچ گئے انہوں نے بغیر کسی Equiptment وآلہ جات کے اپنی جان پر کھیل کر لوگوں کو بچانا شروع کر دیا۔

اس سے بھی زیادہ کام ہمارے میڈیا MEDIA نے کیا۔ میڈیا کا تو ہر چینل اور ہر شخص اس کے لئے ہی وقف تھا۔ ہر طرح کے سابقہ پروگرام جو ENTERTAINMENT کے ہو رہے تھے، سب منسوخ کر دیئے گئے۔ بس ہر چینل پر زلزلہ کی خبریں ہی دی جا رہی تھیں۔ میڈیا کے لوگ تو فوج اور سرکاری اداروں کے لوگوں سے پیشتر ہی نہایت خطرناک اور دور افتادہ مقامات تک پہنچ گئے تھے۔ اس طرح میڈیا نے حکومت کو فوری اطلاعات

فراہم کیں، جس سے حکومت کو یہ آسانی ہوئی کہ اس نے ان اطلاعات کے مطابق فوری اقدامات لینے شروع کردیئے۔

اس واقعہ سے قوم کی یہ ساری خوبیاں سامنے آئیں جو بڑی خوش آئند اور ہمت افزا ہیں۔ البتہ ایک نہایت افسوس ناک اور تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ اس واقعہ پر جو تبصرے ہمارے T.V چینلز پر کیے گئے ہیں، وہ سب نہایت سطحی، طفلانہ، مضحکہ خیز، اور توہم پرستانہ تھے۔ اور قرآن کریم کی تعلیم کے بالکل خلاف۔ حیرت یہ ہے کہ اکثر حضرات دُنیاوی علوم وفنون میں نہایت بالغ نظر، پختہ فہم ہونے کے باوجود، جب مذہبی نظریات پر آتے ہیں تو وہ بچوں جیسی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں یہ توہم پرستانہ نظریات واعتقادات اس طرح جاری وساری، اور رچے بسے ہوئے ہیں کہ بچپن سے وہ اذہان میں مُرتسم ہوجاتے ہیں۔ اور اکثر حضرات ساری عمر اُن سے باہر نہیں نکلتے۔ اس واقعہ پر جو مختلف تبصرے ہمارے چینلز پر ہوئے ان میں یہ تین نکات نمایاں تھے جو تقریباً ہر چینل پر ہمارے علماء کرام اور دانشوروں نے بیان فرمائے۔

(۱) یہ واقعہ ہمارے گناہوں اور بُرے اعمال کی وجہ پیش آیا۔

(۲) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہے۔

(۳) یہ واقعہ ہماری آزمائش کے لئے ہوا ہے، اور ہمارے لئے ایک ابتلاء ہے

''دی نیوز'' اخبار کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ پاکستان کے اعلیٰ ترین اخبارات میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کی 15 اکتوبر کی اشاعت میں ایک مضمون میر خلیل الرحمٰن صاحب کا بعنوان 'GOD BLESS AMERICA' شائع ہوا ہے۔ اس کے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے بلکہ RENDERING ہے۔ امریکہ کے ایک شہری کا ایک خط اخبار میں طبع ہوا جس میں لکھا تھا کہ KATRINA اور RITA کے واقعات کے بعد مسلمان یہ کہتے ہیں کہ امریکیوں نے جو کچھ عراق اور افغانستان میں کیا ہے ان کے ان اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو یہ سزا دی ہے۔ مراسلہ نگار اب حیران ہے کہ اب جو حادثہ پاکستان میں ہوا ہے تو مسلمان اس کے بارے میں کیا توجیہ پیش کریں گے۔ لیکن

مراسلہ نگار امریکن کو حیرانی ہوگی کہ یہاں کے اکثر لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا دی جارہی ہے۔اس کی تائید مندرجہ ذیل بیانات کرتے ہیں۔

(۱)عبدالستار ایدھی نے کہا کہ اس قسم کے واقعات ہوتے رہیں گے۔کیونکہ ہم نہ زکوۃ اور نہ ہی ٹیکس (TAX) ادا کرتے ہیں

(۲)چودھری شجاعت حسین صاحب، صدر مسلم لیگ کا یہ خیال ہے کہ زلزلہ سے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے۔انہوں نے فرمایا کہ ہمیں اخلاق درست کرنے چاہئیں اور اللہ سے معافی طلب کرنی چاہئے۔

(۳)مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ زلزلہ ہمارے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ نماز اور روزہ ترک کرنے سے ہم نے اللہ کے عذاب کو دعوت دی ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آزاد خیالی کی وجہ سے شراب خوری، ناجائز شہوت پرستی، اور بدچلنی ایک فیشن بن گئی ہے۔جو عذاب الٰہی کا سبب ہے۔

(۴)حافظ محمد سعید صاحب، امیر 'الدعوۃ' نے فرمایا کہ طبعی حوادث مسلمانوں کو ایک امتحان کے لئے پیش آتے ہیں۔انہوں نے عوام سے کہا کہ اللہ سے گناہوں کی معافی طلب کریں اور درست راستہ پر چلیں۔انہوں نے حکومت کو بھی مشورہ دیا کہ وہ اپنی وہ پالیساں تبدیل کردے جو اللہ کی ناراضگی کا سبب ہیں۔

(۵)ملک ریاض، چیف آف بحریہ ٹاؤن، کا خیال ہے کہ نو منتخب شدہ ناظمین اور کونسلر نے جو 6 اکتوبر کو قرآن پر جھوٹی قسمیں کھائی ہیں۔یہ زلزلہ اس وجہ سے واقع ہوا۔ انہوں نے فرمایا کہ وہ سب قرآن کریم کی بے حرمتی کرنے کے مجرم ہیں۔انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اب بھی معاف کرسکتا ہے اگر وہ سب منتخب نمائندے یہ قسم کھائیں کہ وہ آئندہ کبھی جھوٹی OATH نہیں لیں گے (دی نیوز 15 اکتوبر 2005ء)

یہ چند اقتباسات آپ نے ملاحظہ فرمائے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس بارے میں جس قدر بھی بیانات اخبارات میں آئے اور جس قدر T.V چینلو پر نشر ہوئے تقریباً سب کے سب ان ہی نظریات کے حامل ہیں۔خواہ دانشوروں کی طرف سے ہوں خواہ علماء کرام

کی طرف سے ہر شخص کے دل میں یہ چور ہے کہ یہ زلزلہ ہماری بداعمالیوں کی وجہ سے آیا ہے ۔ایسی چند جماعتوں نے اجتماعی دعا اور اجتماعی توبہ کے لئے اپیل کی ہے۔ فیصل مسجد اسلام آباد میں بھی نماز توبہ ادا کرنے کا انتظام کیا جارہا ہے۔ اس قسم کے حادثات اور کسوف وخسوف کے لئے نماز ادا کی جاتی ہے۔ ان بیانات پر تبصرہ کرنے سے پیشتر چار نظریات کی وضاحت ضروری ہے۔

(۱) خدا کا صحیح تصور (۲) ابتلاء کا نظریہ (۳) فلسفہ عذاب (۴) توبہ

انسان نے اپنی ابتدائی زندگی میں خدا، ملائکہ، دیوی دیوتا وغیرہ کا تصور ایسا ہی قائم کیا تھا جیسا کہ وہ اپنے سامنے بادشاہ کو دیکھ رہے تھے۔ چونکہ انسان کے سامنے بادشاہ سے بڑھ کر قوت کا مالک اور کوئی نہیں تھا۔ اس نے خدا کو بھی بادشاہ کی طرح ہی اقتدار کا مالک بنایا۔ اس کے اردگرد مقربین، حاجب اور دربان کو جمع کیا۔ اس تک رسائی حاصل کرنے کے لئے متعدد ہستیاں مقرر کیں۔ انسان اگر کوئی درخواست اللہ کے حضور پیش کرے تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ کوئی نذرانہ بھی ادا کرے۔ کوئی سفارش کرنے والا اسے پہنچائے۔ ان درخواستوں کے فیصلے کسی قانون قاعدہ کے پابند نہیں ہوتے۔ اس تصور کی رو سے کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں، اپنی مرضی چلانے میں آزاد ہے ،لہٰذا بندوں کی کوشش یہی ہونی چاہیئے کہ وہ خدا کو کسی طرح راضی کرلیں۔ اسے خوش رکھیں کیونکہ اس کے ناراض ہونے سے ایسے طبعی حادثات جیسے سیلاب، زلزلہ، آندھی، وغیرہ واقع ہوجاتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ تصور انسان کی ابتدائی زندگی، اپنے انسانی ذہن کا تراشیدہ تھا قرآن کریم کے خدا کا تصور قطعاً نہیں ہے۔ قرآن کا خدا نہ کسی سے خوش ہوتا ہے ،اور نہ ہی کسی سے ناراض۔ قرآن نے خدا کے متعلق یہ باطل تصور دور کیا اور اس کی جگہ یہ تصور پیش کیا کہ اس نے کچھ قوانین مقرر کردیئے ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عالم اس نظم وضبط کے ساتھ اور گرم عمل ہے۔ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (35/43) اللہ کی سنت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انہیں تقدیر اللہ کہتے ہیں۔ نظام کائنات فطرتوں کی اندھی قوتوں کی رو سے نہیں چل رہا ہے۔ بلکہ غیر متبدل اور

متعین قوانین کے مطابق سرگرم عمل ہے۔اسی لئے قرآن نے مطالعۂ فطرت اور مشاہدہ کائنات پر بڑا زور دیا ہے۔مطالعہ فطرت سے قوانین خداوندی بے نقاب ہوکر انسان کے سامنے آجاتے ہیں۔جن کا تعلق نظم ونسق کائنات سے ہے۔زلزلہ یا دیگر تمام حادثات کائنات کے قوانین کے ماتحت واقع ہوتے ہیں۔اس میں نہ انسانوں کی بدعملیوں کا دخل ہوتا ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی خوشی وناراضی کا کوئی دخل۔انسان کو اختیار وارادہ کی نعمت سرفراز کیا گیا ہے۔اور اس کو بے پناہ قوتوں کا حامل بنایا گیا ہے۔اس کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ

(45/13)ارض وسموات میں جو کچھ ہے خدا نے اس کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے۔کائنات کی ہر شے ایک لگے بندھے قانون کے تابع سرگرم عمل ہے اور انسان میں اس بات کی صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ ان قوانین کو دریافت کرسکے۔قرآن کریم میں خدا کا تصور یہ ہے کہ اس نے جو یہ قوانین جاری کردیئے ہیں وہ خود بھی ان قوانین کی پابندی کرتا ہے مثلاً

كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ (6/12)اس نے اپنے پر رحمت فرض کرلی ہے۔اگر چہ وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے لیکن وہ اپنے اصول وقوانین خود نہیں توڑتا اور کائنات میں اور انسانوں کی دنیا میں مداخلت نہیں کرتا۔یہ بات کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کی دنیا میں مداخلت نہیں کرتا،اس کے متعلق کئی بار تحریر کیا جاچکا ہے۔اگر کوئی صاحب اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہوں تو وہ ماہنامہ صوت الحق کے اگست 2005ء کے شمارے میں کمترین راقم سطور کا مضمون ملاحظہ فرمالیں۔

کائنات کی ہر چیز انسان کے زیر تسخیر ہے۔اس لئے جس قدر انسان سائنس میں ترقی کرتا چلا جائے گا،اسی قدر وہ ان حادثات کی وجہ،اس کا سبب اور اس کی لم معلوم کرتا چلا جائے گا۔اور ان حوادث کو واقع ہونے کو پہلے سے معلوم کرے گا۔اس طرح اس کے نقصانات سے ایک حد تک محفوظ ہوجائے گا۔اور اس بات کا بڑا قوی امکان ہے کہ وہ ان حادثات کا تدارک ان کے واقع ہونے سے پیشتر کرلے،اور ان کو واقع ہی نہ ہونے دے۔خارجی کائنات کے یہ حوادث لوگوں کے اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے۔کیونکہ یہ ہمارا روزمرہ کا

مشاہدہ ہے کہ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص خطہ زمین کے انسانوں نے اخلاقی بدعملیاں شروع کیں اور ان کو اس قسم کا حادثہ پیش آ گیا ہو، اس قسم کے حوادث دنیا کے ہر خطے میں آتے رہتے ہیں۔ اور نیک و بد ہر قسم کے لوگ اس سے تباہ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ حوادث نہ تو کسی قوم کے غلط اعمال کا نتیجہ ہوتے ہیں اور نہ ہی صرف بداعمال لوگ اس سے تباہ ہوتے ہیں البتہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ جس قوم میں اجتماعی بدکرداری آجائے اور وہ قوم عیش و عشرت میں مشغول ہو جائے اور ملک کا نظم و نسق بالکل خراب ہو جائے گا تو اس قوم کو ایسے طبعی حادثہ سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔ جیسا کہ ہمارے ہاں اس بارے میں ہوا۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق ہمارے شہروں اور دیہات میں جو پُرانے مکانات اچھے میٹریل کے ساتھ بنائے گئے تھے، وہ قائم رہے، اور حالیہ دور کے تعمیر کردہ مکانات، جن میں بد دیانتی کی وجہ سے گھٹیا میٹریل استعمال کیا گیا تھا وہ سب گر گئے۔ یہ نقصان طبعی حادثہ سے نہیں ہوا، بلکہ یہ قوم کا اپنے نظم و نسق درست نہ رکھنے کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح مارگلہ ٹاور کا حال ہے۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق اس میں بہت ناقص میٹریل استعمال کیا گیا تھا۔ مزید یہ کہ اس میں کافی عرصہ پیشتر سے CRACKS آچکے تھے، اس لئے یہ زلزلہ برداشت نہیں کر سکی جبکہ اس کے ساتھ کی تمام عمارات بدستور قائم ہیں۔ اس کے گرنے کا سبب اس کے رہنے والوں کے بداعمال، یا ترک صوم وصلوٰۃ نہیں ہے، بلکہ ملک میں عام نظم و نسق کے خراب ہونے کے باعث، کرپشن عام ہوگئی، جس کی وجہ اس کے بنانے والوں نے بد دیانتی کی اور بُرا میٹریل استعمال کیا۔ اس لئے اس کے گرنے کے ذمہ دار اس کے بنانے والے ہیں نہ کہ رہنے والوں کی بداعمالیاں۔

ہمارے ہاں عام دستور یہی ہے کہ جب بھی طبعی حادثہ رونما ہوتا ہے تو لوگ اس کو عذاب خداوندی سمجھنے لگتے ہیں۔ بارش نہ ہو تو عذاب، سیلاب یا زلزلہ آجائے تو عذاب۔ یعنی دنیا میں کہیں اس قسم کے حوادث رُونما ہوں تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ عذاب الٰہی ہے۔ حالانکہ اس قسم کے حوادث تو ہوتے ہی رہتے ہیں جو ممالک سائنٹفک علوم میں بیش از بیش تحقیقات کرتے رہتے ہیں وہ ان سے محفوظ رہنے کی تدابیر اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ان کے

تباہ کن اثرات سے محفوظ رہتے ہیں جو ایسا نہیں کرتے وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔ جس قدر نوع انسانی سائنس میں ترقی کرے گی، اسی قدر ان حوادث پر قابو پالیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ یہ کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان نہ صرف ارضی حادثات بلکہ کسوف و خسوف تک کو قابو میں نہ لے آئے۔ اس قسم کے کائناتی حوادث کے متعلق یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کو ان کے گناہوں کی پاداش میں عذاب دیتا ہے، درست نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں جو مشکل مقام اور CORE ISSUE ہے۔ جو ہمارے دانشوروں اور علماء کرام کو CONFUSE کرتا ہے۔ وہ سابقہ اقوام کے وہ کوائف ہیں جو قرآن کریم نے مختلف اقوام کی تباہی و بربادی کے سلسلہ میں بیان فرمائے ہیں۔ اس سلسلہ میں قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوطؑ، وغیرہ کے احوال بڑے غور و فکر کے متقاضی ہیں کہ ان تمام اقوام پر جو عذاب آیا، اس کی کیا وجہ تھی۔ ہمارے علماء روایات کا یہ نظریہ ہے کہ انسانی اعمال اور فطری حوادث میں ایک ربط ہوتا ہے اور یہ فطری حوادث انسان کی بدعملیوں سے RELATED ہیں لیکن علمائے اہل قرآن اس طرف گئے ہیں کہ یہ حوادث ان کے اخلاقی اعمال کا نتیجہ نہیں ہوتے تھے۔ البتہ یہ ان کی تباہی کا ذریعہ بنا دیئے جاتے تھے۔ وہ طبعی حادثہ تو اپنے طبعی قوانین کے مطابق واقع ہونا ہی تھا، لیکن اس کا وقت اس قوم کی تباہی کے ساتھ COINCIDE اور SYNCHRONIZIE، توافق یا توافت کر جاتا تھا۔ اور وہ قوم تباہ ہو جاتی تھی بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس طبعی حادثہ کا علم، اس قوم کے رسول کو وحی کے ذریعے پہلے سے مل جاتا تھا، اور وہ قوم کے لئے حفاظتی تدبیر اختیار کر لیتا تھا یا وحی کے حکم کے مطابق وہ اس قوم کو لے کر کسی دوسری جگہ منتقل ہو جاتا تھا۔

حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم ملا۔ ان کی قوم ان کی کشتی بنانے پر مذاق اڑاتی رہی۔ لیکن وہ حکم خداوندی کے مطابق کشتی بناتے رہے۔ چنانچہ جس وقت سیلاب آیا، تو حضرت نوح اور ان کے ساتھی مومنین تو اس کشتی کی وجہ سے محفوظ رہے باقی ساری قوم غرق ہو گئی اس میں اصل بات حضرت نوحؑ کو قبل از وقت خبر ملنا ہے۔ جب تک انبیاء کرام آتے

رہے، وہ اس طرح اپنی قوم کو پہلے سے خبر دیتے رہے، اب یہ کام خود مسلمان دانشوروں اور سائنس دانوں کا ہے کہ وہ سائنس میں اس درجہ ترقی کریں کہ وہ اپنی (مسلمان) قوم کو اس طرح کے طبعی حوادث کی قبل از وقت اطلاع دیں۔ تا کہ حکومت اور قوم اس سے بچنے کا انتظام کرے۔ حضرت نوحؑ کے واقعات کے سلسلہ میں یہ بات غور طلب ہے کہ جو تباہی طبعی اسباب کے ذریعے آتی ہے (مثلاً سیلاب) اس کی حفاظت بھی طبعی اسباب (کشتی) کے ذریعے ہی ہوتی ہے، دعا، درود، یا ورد، وظائف یا کسی روحانی طریقے سے وہ دور نہیں کی جاسکتی۔

جہاں تک آزمائش کے تصور کا تعلق ہے تو واضح رہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو نہیں آزماتا۔ ہمارے عزیز و اقارب دوستی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دیکھیں کہ وہ اپنے قول میں سچے ہیں یا نہیں۔ اس لئے ہم اپنی پریشانی میں ان سے استمداد کرتے ہیں تا کہ معلوم ہوجائے کہ وہ کس قدر اپنے دعویٰ میں صادق القول ہیں۔ اس طرح ان کی آزمائش ہوجاتی ہے۔ لیکن خدا کو اس طرح کی آزمائش کی کیا ضرورت۔ وہ تو خود علیم و خبیر ہے۔ دلوں کے رازوں کو جانتا ہے۔ البتہ وہ ایسے مواقع فراہم کرتا ہے جن سے انسان خود اپنی صلاحیتوں کو آزمائے اور دیکھے کہ وہ کس حد تک نشوونما پا چکی ہیں۔ اس قسم کے مصائب و آلام سے ہم اپنی خود آزمائش کر لیتے ہیں کہ ہم میں حوصلہ و ہمت کس قدر ہے اور ہم مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے کی کس قدر طاقت رکھتے۔ یہ مصائب و مشکلات ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پرکھنے کے مواقع مہیا کرتی ہیں۔ قرآن میں جس ابتلا کا ذکر آتا ہے، اس سے یہی مقصود ہے نہ یہ کہ خدا اپنے کسی مقصد کے لئے ہماری آزمائش کرتا ہے۔ وہ ذاتِ بزرگ و برتر، اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے۔ ابتلاء درحقیقت محاسبہ خویش کا دوسرا نام ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَ اِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ (2/124) جب اس کے رب نے ابراہیم کے لئے مختلف قوانین کے ذریعے اس کی نمودِ ذات کے مواقع بہم پہنچائے۔ جب قوانین خداوندی کے مطابق زندگی کے مختلف حوادث اس کے سامنے آئے تا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس کی صلاحیتیں کس درجہ بیدار ہو چکی ہیں۔

ابتلاء کے اس قرآنی مفہوم کے مطابق آپ نے خود ملاحظہ فرمالیا کہ ہماری قوم اس موقع پرنہایت کامیاب رہی۔اس حادثہ سے یہ اندازہ ہوا کہ ہم ایک زندہ قوم ہیں اور اس قسم کے حوادثات کا مردانہ وار مقابلہ کرسکتے ہیں۔پاکستان کا کوئی شہری ایسا نہیں ہوگا کہ جس نے اس سلسلہ میں کوئی امدادی کام نہ کیا ہو۔عموماً سب لوگوں نے عملاً اس میں حصہ لیا ہے۔ ہمدردی اور ایثار کا جذبہ اس درجہ بیدار رہا کہ جوانوں نے اپنی زندگی داؤں پر لگا کر دوسروں کو بچالیا۔ ہر شخص نے مالی امداد میں مسابقت کی۔اور ہمارے میڈیا کے لوگ تو خصوصاً بڑی تعریف کے مستحق اور سزوار ہیں۔ان مواقع سے قوموں کے حوصلے، ہمت، ہمدردی، ایثار، اتفاق کے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔اور یہی قرآنی ابتلاء کا مفہوم ہے۔

جہاں تک توبہ مانگنے کا تعلق ہے جسے اجتماعی طور پرادا کرنے کے لئے فیصل مسجد اسلام آباد میں لوگ جمع ہورہے ہیں اور وہاں سب مل کر نماز پڑھنے کے بعد توبہ مانگیں گے۔تو یہ بات بھی قرآنی تعلیم کے مطابق نہیں ہے۔توبہ مانگنے کی چیز نہیں ہوتی توبہ تو ایک عملی اقدام ہے۔یعنی غلط کام کے نقصان رساں نتائج کے تدارک کے لئے صحیح کام کرنا۔آپ نے کسی شخص سے ایک رقم لی، اور اس کے ادا کرنے سے انکار کردیا۔کچھ عرصہ بعد، حالات کے اقتضاء کے مطابق، آپ نے شرمندگی محسوس کی۔آپ نے اس کی وہ رقم ادا کردی، اور آئندہ زندگی میں دیانتدار رہنے کا دلی عہد کیا۔یہ آپ کی توبہ ہے۔کسی شخص نے شراب پینا اپنا معمول بنایا پھر اس کو اندازہ ہوا کہ اس سے اس کی صحت خراب ہورہی ہے، وہ اپنے اس عمل پر نادم ہوا، اور آئندہ زندگی بھر شراب نہ پینے کا عزم کرلیا۔یہ اس کی توبہ ہوئی۔

اس صورت میں توبہ یہ ہے کہ مارگلہ ٹاور کی تعمیر میں جس قدر لوگ بالواسطہ یا بلا واسطہ، اس میں INVOLE ہوں۔وہ سب اپنے دل سے نادم ہوں اور آئندہ عمارات کی تعمیر میں بددیانتی یعنی گھٹیا میٹریل لگانے سے اجتناب کریں۔تو یہ ان کی توبہ ہے۔توبہ کے لئے مسجد میں جانا اور نماز پڑھنا ضروری نہیں۔ اس موقع پر تو یہ صرف ان لوگوں کو کرنی چاہئے جنہوں نے یہ ٹاور بنایا تھا۔یا ان لوگوں کو بھی جنہوں نے کسی جگہ بھی کسی تعمیر میں بددیانتی کی۔جن لوگوں نے کسی تعمیر میں حصہ نہیں لیا، جن کا کوئی تعلق تعمیر کے شعبہ سے نہیں انہیں توبہ

کی کوئی ضرورت نہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ صدر مضمون میں دو باتیں تحریر کی گئی تھیں۔ اول یہ کہ ابتلاء کا قرآنی مفہوم محاسبہ خویش ہے۔ اور دوسری یہ کہ مسلمان سائنس دانوں کو وقت سے بہت پہلے طبعی حوادث کا علم حاصل کرکے قوم کو قبل از وقت آگاہ کر دینا چاہئے۔ ان دونوں باتوں کی تائید میں مندرجہ ذیل اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔

لندن کے مشہور قدیمی اخبار گارڈین (GUARDIAN) مورخہ 18 اکتوبر 2005 میں ایک مضمون UN-ENDING DISASTER طبع ہوا ہے اس کا پہلا فقرہ مع ترجمہ کے تحریر ہے National Disasters are always a test of our Capacity to Empathise with other People's problems, and the massive earthquake that has devasted parts of Pakistan and India is no exeception. اس کا آزاد ترجمہ یہ ہے۔

طبعی حوادث ہمیشہ ہماری صلاحیت کا Test کرتے ہیں کہ ہم میں دوسروں کے مصائب میں شریک ہونے کی کتنی صلاحیت ہے اور پاکستان کے شمالی علاقہ جات اور ہندوستان میں جو زبردست زلزلہ آیا ہے وہ اس (Test) سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ آپ ملاحظہ فرماسکتے ہیں کہ قرآن کریم نے ابتلاء کا جو مفہوم بتایا تھا، آج یہ اخبار کس طرح اس کو اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہے۔ یہاں اخبار نے ابتلاء کے لئے Test یعنی محاسبہ خویش کا ہی لفظ استعمال کیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ چونکہ انبیاء کرام کی آمد کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے اس لئے مسلمان سائنسداں خود طبعی حادثہ کے واقع ہونے کی اطلاع قوم کو دیں۔ اس بارے میں عرض ہے کہ ایک خط "دی نیوز" اخبار کی 18 اکتوبر 2005ء کی اشاعت میں طبع ہوا ہے جس کا آزاد ترجمہ پیش خدمت ہے۔

اسلام آباد اس سے بھی بڑے زلزلہ کی زد میں (ہے) 'دی نیوز' اخبار کی اگست 2001ء کی اشاعت میں واشنگٹن سے آمر متین صاحب کا ایک مضمون عنوان بالا کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ساری تفاصیل نقشوں کی مدد سے اس طرح پیش کی گئی تھیں کہ وہ باآسانی سمجھ میں آسکیں۔

آمر متین صاحب نے ماہر سائنسدانوں کے حوالہ سے لکھا تھا کہ اس خطہ میں زلزلہ اس وجہ سے آتا ہے کہ ہمالیہ کے نیچے جو PLATES ہیں وہ سرکتی ہیں۔ اگر ان PLATES کے سرکنے میں کوئی رکاوٹ آجاتی ہے تو (زلزلہ کی) شدت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ چونکہ کافی عرصہ سے زلزلہ نہیں آیا تھا، اس لئے خدشہ تھا کہ آئندہ جو تباہی آئے گی وہ زیادہ شدید ہوگی۔ نیو یارک ٹائمز کا حوالہ دیتے ہوئے، اس مضمون میں تحریر تھا "جدید شہادت کی وجہ سے سائنس دانوں کو اس بات کا یقین ہے کہ مزید تباہی آنی نہ صرف لابدی ہے۔ بلکہ اس تباہی کے آنے میں دیر ہوگئی ہے"۔ اس بات کا اندازہ تو ہر شخص خود ہی کرسکتا ہے کہ محکمہ موسمیات نے اس انتباہ کو کیوں نظر انداز کردیا۔ متین صاحب جو واشنگٹن میں رہتے ہیں، اور ماہر ارضی ہیں، اور وہ پاکستانی نژاد ہیں۔ تو انہیں اس معاملہ کا پاکستانی حکومت سے تعاقب کرنا چاہیئے تھا۔ اس مضمون میں یہ بھی پیش گوئی تھی کہ 40 ہزار آدمی فوت ہوں گے اور ایک لاکھ زخمی (یہاں خط ختم ہوتا ہے)

آپ اس خط سے ملاحظہ فرماسکتے ہیں کہ نہ صرف اس حادثہ کا، بلکہ مزید حادثات کے واقع ہونے کے امکان کا، کس طرح 4 سال پیشتر (اگست 2001 میں) سائنسدانوں کو علم تھا اور ختم نبوت کے بعد کس طرح، مسلمان سائنس دان، اپنی قوم کے ان افراد کو بچا سکتے ہیں جو ان کے انتباہ کو اہمیت دیں گے۔ اور اب یہ حکومت پر فرض ہے کہ وہ اس انتباہ کو اہمیت دے ابھی سے حفظ ماتقدم کے طور پر، ان ANTICIPATED، حادثات سے بچنے یا ان کے نقصانات کو کم کرنے کی کوشش کرے۔

==========☆☆☆==========

اختیار رکھتے ہوئے خود پر کنٹرول رکھنا ہی انسانیت کا شرف ہے اسی سے اسکی خودی میں استحکام پیدا ہوتا ہے اور استحکام خودی ہی انسانیت کی معراج ہے۔

====================

شب برات

شب برأت تو خصوصی طور پر شیعہ حضرات کا تہوار ہے۔ کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق اس رات میں حضرت امام مہدی تولد ہوئے تھے۔ چونکہ اُن کا عقیدہ اس رات میں اُن کے تولد ہونے کا ہے تو بے شک اُن حضرات کا حق ہے کہ اس رات کو ہر طرح سے خوشی منائیں اور ہر طرح سے خوشی کا اظہار کریں۔ لیکن جمہور مسلمان اہل سنت حضرات کے نزدیک یہ رات اسی وجہ سے محترم و مبارک نہیں ہے۔ بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اس رات میں سارے سال کے امور کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے رزق کی تقسیم، موت و حیات کے فیصلے، شادی و نکاح و ولادت سے متعلق تمام امور کے فیصلے ہر سال اسی رات میں کر دیئے جاتے ہیں۔ ان تمام نظریات و عقائد کا انحصار سورۃ دخان کی آیت کریمہ **فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ أَمْرٍ حَكِيمٍ** (44-4) پر ہے اور یہ تمام عقائد اس آیت کریمہ سے ہی مستخرج کئے جاتے ہیں۔ اس آیت کا ترجمہ و تفسیر مستند کتب تفاسیر سے پیش خدمت کی جاتی ہے۔

(۱) اس میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (تفسیر) یعنی سال بھر کے متعلق قضاو قدر حکیمانہ اور اٹل فیصلے اسی عظیم الشان رات میں لوح محفوظ سے نقل کر کے ان فرشتوں کے حوالے کئے جاتے ہیں، جو شعبہ ہائے تکوین میں کام کرنے والے ہیں۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعبان کی پندرویں رات ہے۔ جسے شب براۃ کہتے ہیں ممکن ہے وہاں سے اس کام کی ابتداء اور شب قدر پر انتہا ہوتی ہو۔ واللہ اعلم (ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب اور تفسیر جناب مولانا شبیر احمد عثمانی)

(۲) اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا (تفسیر) جدا ہوتا ہے یعنی لوح محفوظ میں سے جدا کر کے اس کام والوں کو لکھ دیتے ہیں (موضح القرآن شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ)

(۳) اس رات میں تمام پر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ (تفسیر) یہ اسی شب

مبارک کی تعریف ہے کہ اس میں تمام مبنی بر حکمت امور کی تقسیم ہوتی ہے۔ اس آیت کو اگر سورۃ قدر کی روشنی میں دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ مقربین کو زمین سے متعلق تمام امور کلیہ سے آگاہ فرماتا ہے اور وہ ان سے زمین میں مامور ملائکہ کو آگاہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے مقرر کئے ہوئے نقشہ کے مطابق اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں (تدبر القرآن جلد ۷ صفحہ ۲۷۰)

(۴) اس رات میں پُر حکمت یا محکم معاملے کا فیصلہ کیا جاتا ہے (تفسیر) ابوالضحیٰ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نصف شعبان کی رات میں اللہ سب فیصلے کر دیتا ہے۔ اور شب قدر میں وہ فیصلے ان کارندوں کے سپرد کر دیتا ہے (تفسیر مظہری)

(۵) اس میں فیصلہ ہوتا ہے پر حکیمانہ بات کا جو ہماری طرف کی بات ہوتی ہے (تفسیر فصل الخطاب)

(۶) در آن شب مبارک فیصل کردہ میشود ہر کار استوار را وجمعے برآنند کہ لیلۂ مبارکہ شب برات است و آن شب نیمہ شعبان است۔ و برکت او در نزول ملائکہ و اجابت دعوت و فصل اقضیہ و تقسیم نعم است فیھا دریں شب یفرق جدا کردہ و فصل دادہ شود کل امر حکیم برامرے کہ حکم کردہ شدہ است در ہمہ سال ارزاق و آجال و شب برات از لیالی فاضلہ است کہ بدین امت دادہ اند (ترجمہ فتح الرحمان و تفسیر حسینی)

(۷) اسی رات میں ہر ایک مضبوط کام کا فیصلہ کیا جاتا ہے (تفسیر) اسی شب میں ہر محکم کام طے کیا جاتا ہے۔ یعنی لوح محفوظ سے کاتب فرشتوں کے حوالے کیا جاتا ہے۔ تمام سال کے کل اہم کام عمر، روزی وغیرہ سب طے کئے جاتے ہیں۔ (اردو ترجمہ تفسیر ابن کثیر جلد ۵ صفحہ نمبر ۴۸)

آپ نے مختلف سات تفاسیر میں آیت کریمہ کا ترجمہ اور اس کی تفسیر ملاحظہ فرمائی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان تمام تفاسیر میں صرف الفاظ کی تبدیلی ہوئی ہے مفہوم عام تفاسیر میں تقریباً ایک ہی ہے۔ ان تمام تفاسیر میں ملائکہ اور لوح محفوظ کے جن مفاہیم کو پیش کیا گیا ہے وہ قطعاً قرآن کریم کے مفاہیم کے خلاف ہیں۔ قرآن کریم میں ملائکہ اور لوح

محفوظ کا یہ مفہوم ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم میں لوح محفوظ کے الفاظ صرف ایک جگہ میں آئے ہیں جو مذکورہ صدر مفہوم ادا نہیں کرتے یہاں چونکہ ملائکہ ولوح محفوظ موضوع نہیں ہیں اس لئے ان سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

آپ نے ان مستند تفاسیر کے اقتباسات ملاحظہ فرمائے جن میں آیت کریمہ کا لفظی ترجمہ اور اس ترجمہ کی بنیاد پر تحریر کردہ تفاسیر دیکھیں۔ لیکن اس بات پر شدید حیرت ہوتی ہے کہ ان تمام تفاسیر میں درج کردہ تراجم غلط ہیں اور عربی قواعد اس کی اجازت نہیں دیتے اسی بنا پر اس آیت کریمہ کے متعلق جو تفاسیر بیان کی گئیں ہیں وہ از خود غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔ یہ تراجم کس وجہ سے غلط ہیں اور صحیح ترجمہ کیا ہے؟ یہ معلوم کرنے سے قبل ایک مختصر سی تمہید عرض کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ جس کو مطالعہ کرنے سے ترجمہ غلط ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔

قارئین کرام میں سے اکثر حضرات کو علم ہوگا کہ ۱۹۲۶ء میں ایک مسلمان خاتون نے ریاست بھاولپور میں ایک دعویٰ دائر کیا تھا کہ اس کا شوہر احمدی ہو گیا ہے اس لئے عدالت اس کا نکاح فسخ کرنے کا حکم جاری کرے۔ یہ مقدمہ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بھاولنگر کی عدالت میں دائر کیا گیا تھا۔ جج صاحب موصوف محمد اکبر اس فکر میں تھے کہ انہیں نبوت کی کوئی جامع و مانع تعریف (DEFINITION) معلوم ہو جائے تو پھر وہ اس مقدمہ کا فیصلہ بہ آسانی کر سکیں گے۔ اس مقدمہ کے سلسلے میں بڑے بڑے اکابر علمائے کرام جیسے مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی، شیخ الجامع، جامع عباسیہ، مولانا نجم الدین صاحب پروفیسر اورینٹل کالج لاہور، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند، مولانا میر مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری، شیخ الکل فی الکل حضرت مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کاشمیری شیخ الحدیث دیوبند وغیرھم پیش ہوئے مگر جج صاحب ان سب حضرات کی پیش کردہ نبوت کی (DEFINITION) سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اسی دوران اتفاق سے انہیں محترم پرویز صاحب کا مضمون بعنوان میکانیکی اسلام مل گیا۔ محترم پرویز صاحب نے نبوت کی جو تعریف اپنے مضمون میں بیان فرمائی تھی جج صاحب موصوف اس تعریف سے مطمئن ہو

گئے انہوں نے اس مقدمے کا فیصلہ ۷/ فروری ۱۹۳۵ء کو سنا دیا۔ یہ مقدمہ قریباً نو سال تک زیر سماعت رہا اور اس طویل عرصہ میں اس درجہ بڑے بڑے علماء کرام جج صاحب کے سامنے نبوت کی جامع و مانع اور اطمینان بخش تعریف بیان نہیں کر سکے۔ جج صاحب مطمئن ہوئے بھی تو محترم پرویز صاحب کے ایک ایسے مضمون سے جس کا براہِ راست اس موضوع سے کوئی تعلق بھی نہیں تھا۔ اس کی اصل وجہ کیا تھی وہ خود پرویز صاحب کی زبانی سنئے۔

''اس مقدمہ میں ہندوستان کے بڑے بڑے جید علماء کرام پیش ہوئے تھے جن میں سے ایک ایک کا بیان سینکڑوں صفحات پر مشتمل تھا۔ لیکن فاضل جج حقیقتِ نبوت کے متعلق ان میں سے کسی کے بیان سے مطمئن نہیں ہو سکے، وہ مطمئن ہوئے تو میرے ایک مضمون سے جو اس مقدمہ سے بالکل الگ آزادانہ لکھا گیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ میرے مضمون کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی بنا پر وہ اس قدر اطمینان بخش اور قولِ فیصل ثابت ہوا۔ وہ خصوصیت یہ تھی کہ میں نے مقامِ نبوت کی وضاحت قرآن کریم کی روشنی میں کی تھی۔ خارج از قرآن بحثوں کو اس میں داخل نہیں ہونے دیا تھا''

(اقبال اور قرآن جلد دوم ص ۴۳)

بس یہی کلید و چابی ہے اس معمہ کو سمجھنے کی۔ ہمارے علماء کرام روایات کے زیر اثر نظریات اور معتقدات پہلے سے بنا لیتے ہیں۔ پھر ان ہی نظریات و معتقدات کو پیش نظر رکھ کر آیات کا وہ ترجمہ و تفسیر کرتے ہیں جن سے ان کے وہ نظریات برقرار رہیں جو انہوں نے احادیث کے زیر اثر اختیار کئے تھے۔ مندرجہ بالا واقعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے جو خود پرویز صاحب نے بھی تحریر فرمائی ہے۔ کہ اگرچہ یہ علماء کرام نہایت قابل و عالم تھے لیکن پرویز صاحب کو ان پر صرف اس وجہ سے فوقیت حاصل ہوئی کہ ان کے سامنے صرف قرآن خالص تھا۔ اور بس۔

ہماری تفاسیر میں غلط ترجمہ ہونے کی اصل وجہ ان حضرات کا احادیث سے متاثر ہونا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ان کا علمی پایہ نہایت بلند تھا۔ ہم لوگ ان کی گرد راہ بھی نہیں بن سکتے۔ راقم سطور ان کی کفش برداری کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ اب آیت کریمہ کے مفہوم کی

طرف مراجعت کی جاتی ہے۔ استدلال کتب کتب قواعدہ بجائے صرف قرآن کریم کی آیت سے کیا جائے گا تا کہ کسی صاحب کا کوئی اعتراض بھی باقی نہ رہے۔

ہمارے علماء کرام نے اپنے نظریہ کو محفوظ رکھنے کی وجہ سے آیت کا ترجمہ زمانہ حال میں کیا ہے۔ "اس رات میں تمام امور کی تقسیم ہوتی ہے" حالانکہ اس کا ترجمہ ماضی میں ہونا چاہیے تھا۔ کہ اس رات میں تمام امور کی تقسیم ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہاں فعل مضارع ماضی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، اس کو عربی قواعد میں مضارع حکائی کہتے ہیں۔ ماضی کا قصہ بیان کرتے ہوئے۔ **وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ** (12-56)

اور اس طرح ہم نے یوسف کو سرزمین مصر میں اقتدار عطا فرمایا کہ وہ جہاں چاہتا تھا قیام کرتا تھا۔ دیکھئے یہاں **یتبوا** اور **یشاء** دونوں فعل مضارع ہیں لیکن چونکہ زمانہ ماضی کا قصہ یوسفؑ بیان کر رہے ہیں، اس لئے ماضی کا فائدہ دے رہے ہیں۔ ایسے افعال مضارع کو مضارع حکائی کہتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کریمہ کا ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نے یہ کیا ہے۔

"اور یوں قدرت دی ہم نے یوسف کو اس زمین میں جگہ پکڑتا تھا اس زمین میں جہاں چاہتا" حضرت مولانا محمود الحسن صاحب نے یہاں مضارع کا ترجمہ ماضی میں ہی کیا ہے۔ جو بالکل درست ہے لیکن تعجب ہے کہ جب یہ مضارع حکائی سورۃ دخان کی زیر بحث آیت میں آیا ہے تو وہاں صرف احادیث کے زیر اثر ہونے کیوجہ سے اس کا ترجمہ حال میں کرتے ہیں اس کو کہتے ہیں قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تحت رکھنا۔

اسی طرح شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے سورۃ یوسف کی آیت (۵۶) کا ترجمہ فرمایا "وہم چنیں (یعنی با ایں تقریب) منزلت دادیم یوسفؑ را در آں زمین قرار میگرفت از آں زمین ہر جا کہ می خواست" یہاں پھر شاہ صاحب نے **یتبوا** و **یشآء** کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے۔ اگر مولانا محمود الحسن صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب کے تراجم یہاں پیش نہ بھی کئے جائیں تب بھی ہر بات واضح ہے کہ حضرت یوسفؑ سرزمین مصر میں جہاں چاہے

جاتے تھے، یہ ماضی میں ہی تھا۔ اس وقت تو نہ حضرت یوسفؑ زندہ ہیں اور نہ وہ سرزمین مصر میں گھوم پھر رہے ہیں۔ یہ سارا قصہ ماضی کا ہے لیکن استعمال مضارع کے صیغے میں ہو رہے ہیں۔

دوسری مثال۔ وَ مَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَ هُمْ يَمْكُرُوْنَ (12-102) اور تو نہیں تھا ان کے پاس جب وہ ٹھہرانے گئے اور اپنا کام، اور فریب کرنے لگے۔ یہاں پھر مولانا محمود الحسن صاحب نے مضارع کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے ظاہر ہے کہ وہ اس وقت تو فریب نہیں کر رہے ہیں ماضی میں ہی کر رہے تھے۔ تیسری مثال۔ سورۃ مجادلہ پہلی آیت قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (58-1) سن لی اللہ نے اس عورت کی بات جو جھگڑتی تھی تجھ سے اپنے خاوند کے حق میں اور جھینکتی اللہ کے آگے۔ ترجمہ مولانا محمود الحسن صاحب۔ یہاں پھر مضارع حکائی کا ترجمہ ماضی میں کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی ترجمہ ماضی میں کیا ہے ہر آئنہ شنید خدائے تعالیٰ آں زن را کہ گفتگو میکرد با تو در باب شوہر خود وشکایت میکرد پیش خدا وخدا می شنید گفتگو کردن شما۔

قرآن سے یہ تین مثالیں بطور استدلال مضارع حکائی کے متعلق آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں۔ جن سے ثابت یہ کیا گیا ہے کہ مضارع حکائی کا ترجمہ ماضی میں کیا جاتا ہے۔ اس استدلال کے پیش نظر آیت کریمہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہم نے اس کتاب کو مبارک رات میں نازل کیا ہم عذاب سے ڈرانے والے تھے، ایسی رات کو اس کتاب میں تمام حکمت کے کام فیصل کیے گئے تھے۔ امرًا من عندنا یہ کتاب ہماری طرف سے بذریعہ وحی نازل ہوئی رحمۃً من ربك یہ اللہ کی رحمت ہے اور رحمۃ نے پھر کتاب کی وضاحت کی ہے۔ کیونکہ یہ دونوں لفظ قرآن کریم میں وحی کے معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

مقصد آیت کریمہ کا یہ ہے کہ قرآن کریم جس رات میں نازل ہوا تھا وہ بڑی بابرکت رات تھی اس رات میں حق وباطل، رشد وغوایت کے امتیازات نکھار کر بیان کر دیئے گئے تھے۔ قرآن کریم نے اپنے نزول کیوجہ سے اس رات کو لیلۃ مبارکہ کہا ہے۔ وہ رات جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ بے شک وہ لیلۃ مبارک تھی۔ اس کے بعد نہ قرآن

جیسی بابرکت کتاب   نازل ہوئی اور نہ ہی کوئی دوسری رات لیلۃ مبارکہ ہو سکتی ہے۔ برکت والی رات صرف وہ رات تھی جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ یہ نظریہ کہ ہر سال شب قدر یا لیلۃ مبارکہ ہوتی ہے۔ حدیث بے خبراں سے زیادہ کچھ نہیں۔ آیت کریمہ کے وضاحت کے بعد شب برات کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی۔

☆☆

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کے اعمال واذکار کو مسلمانوں کے بجائے اسلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ہم جسے تاریخ اسلام کے نام سے منسوب کرتے ہیں اصل میں وہ مسلمانوں کی تاریخ ہے اور یہ تاریخیں اڑھائی سو سال بعد تحریر میں آئیں جب کہ ان کے لئے پہلے سے تحریر کردہ کوئی مواد (Material) موجود نہیں تھا۔ یہ سقیفہ بنی ساعدہ سے لے کر، پورے بنی عباس کے دور تک خالص ملوکیت کے نکتہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں کیونکہ ہر آنے والی حکومت جو سابقہ حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار حاصل کرتی ہے، وہ سابقہ حکومت کی خامیوں اور کوتاہیوں کو خوب خوب اچھالتی ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں بھی چونکہ بنی امیہ کے بعد بنی عباس آئے جنہوں نے بنی امیہ سے بزور حکومت چھینی تھی اور ہمارا سارا لٹریچر بنی عباس کے دور کا تحریر کردہ ہے، اس لئے اس لٹریچر میں لازمی اور فطری بات تھی کے بنی امیہ کو بری طرح Depict کیا جاتا چنانچہ امیر معاویہ کا Role نہایت درجہ کا پست اور گھٹیا پیش کیا گیا ہے، اسی طرح جنگ صفین، جنگ نہروان، جنگ جمل کے واقعات اختراع کئے۔ حالانکہ قرآن کریم نے واضح طور پر ارشاد فرما دیا تھا کہ صحابہ آپس میں نہیں لڑیں گے 48/29، 19/96، لیکن اس کے باوجود ہماری تاریخ ایک طرف حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ کو اور دوسری طرف حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کو برسر پیکار دکھاتی ہے۔ جس میں ستر ہزار صحابہ قتل ہوئے اور حضرت زبیرؓ جو حضرت علیؓ کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے وہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں ہی قتل ہوئے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں عشرہ مبشرہ میں شامل ہیں یا للعجب۔ یہ سارے واقعات مسلمانوں کی تاریخ میں نہیں ہو سکتے ہیں، اسلامی تاریخ میں نہیں ہو سکتے کیونکہ قرآن کا واضح اعلان ہے کہ صحابہ کرام آپس میں جدال وقتال نہیں کر سکتے

☆جستجوئے حقیقت☆

ایک پرائیویٹ نشست میں تین احمدی حضرات تشریف لائے اور چند دیگر احباب بھی جمع ہوئے اور آپس میں علمی گفتگو ہوئی۔ احمدی حضرات نے اپنا موقف بہت مختصر طور پر بیان کیا اور اس بات کی وضاحت کی کہ ان میں اور عام مسلمانوں میں کوئی بہت زیادہ فرق نہیں ہے، وہ بھی اللہ، رسول، ملائکہ اور روز آخرت وغیرہ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضرت رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم سے بھی محبت رکھتے ہیں۔ چند احادیث سے بھی انہوں نے اپنے نظریات کی وضاحت کی۔ لیکن یہ حضرات PROFESSIONAL SENSE میں عالم یا مناظر نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے مخاطبین بھی خالص قرآنی نظریات کے حامل لوگ تھے جو خلاف قرآن روایتی نظریات پر یقین نہیں رکھتے اور احمدی حضرات جن موضوعات پر گفتگو کرتے ہیں یہ ان کو پہلے سے ہی تسلیم کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ آپس کا لحاظ ملاحظہ بھی اس بات کا مانع رہا کہ کوئی رنج دہ گفتگو ہو۔ اس لئے یہ گفتگو زیادہ دیر نہیں چل سکی اور نہ ہی نتیجہ خیز ہو سکی۔ لیکن اس نشست سے خیال پیدا ہوا کہ اس موضوع پر کچھ تحریر کر دیا جائے جس سے احمدی اور غیر احمدی نظریات کی وضاحت ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ جس وقت مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس وقت تک ہر جگہ روایتی نظریات پھیلے ہوئے تھے خالص قرآن کریم کی روشنی اس وقت تک پھیلنی شروع نہیں ہوئی تھی اور یہی وجہ مرزا صاحب کے نظریات کے نشرواشاعت کی ہوئی ورنہ جہاں تک خالص قرآن کی روشنی کا تعلق ہے تو احمدیت، تصوف، تشیع کے نظریات اس روشنی میں چند قدم بھی نہیں چل سکتے۔ شرط صرف قرآن خالص کی ہے۔ چونکہ روایاتی مسلمانوں کے اپنے بیشتر نظریات قرآن کے خلاف ہیں۔ اس لئے احمدی حضرات اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور ان نظریات کو EXPLOIT کرتے ہیں اور مسلمانوں کو لاجواب کر دیتے

ہیں۔ دوسری وجہ احمدیت کی نشر و اشاعت کی یہ ہوئی کہ مرزا صاحب اور ان کے مخالف مسلم علماء کے پیش نظر قرآن کریم اور اسلام بحیثیت مذہب کے تھا۔ ان دونوں گروہوں کے سامنے دین کا تصور نہیں تھا۔ نہ تو مرزا صاحب ہی مذہب کی سطح سے بلند ہوئے اور نہ ہی ان کے مدمقابل علماء مذہب سے بلند ہوئے۔ دین میں احمدیت کس مقام پر ٹھہرتی ہے اور کس طرح برہنہ ہو کر سامنے آتی ہے۔ یہ مضمون کے آخر میں آئے گا فی الحال مذہب کی سطح پر بات کی جاتی ہے اور حتی الامکان مختصر اور مہذب انداز سے۔ مرزا صاحب کے بنیادی طور پر دو دعاوی تھے جو ان کے نام کے جزو بن گئے تھے ان کو مسیح موعود اور مہدی معہود کہا جاتا ہے ان کے یہ دو بنیادی و اساسی دعاوی ہیں جن پر ان کی نبوت کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ وہ اپنی نبوت کی اساس ان ہی دو دعاوی پر رکھتے ہیں۔

(ا) جہاں تک حضرت امام مہدی کی آمد یا شیعہ حضرات کے مطابق ان کے ظہور کا تعلق ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ قرآن کریم میں دور دور تک اس کا کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ رسالہ "صوت الحق" خالص قرآنی رسالہ ہے، اس کا تعلق کسی فرقہ سے نہیں ہے، لیکن علمی انداز میں کسی بھی مسئلہ کا احاطہ کرنے کے لئے پورے حقائق کا سامنے لانا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے عرض ہے کہ سنی حضرات کے لئے آمد مہدی کی اتنی اہمیت نہیں ہے جس قدر اہمیت حضرات محترم اہل تشیع کے نزدیک ہے۔ کیونکہ ان کے ہاں ظہور امام جزو دین ہے۔ یہ قابل احترام حضرات ڈیڑھ ہزار سال سے اس موضوع پر تحریر فرماتے چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے حضرت امام کی سوانح حیات بھی تحریر فرمائی ہیں جس میں "**الصراط السوی فی احوال المهدی**" بہت نمایاں اور اہم کتاب ہے۔ آپ اس طویل عرصہ کا پورا لٹریچر ملاحظہ فرمالیں وہ اس عقیدہ کی سند میں ایک آیت بھی پیش نہیں کر سکتے۔ احمدی حضرات تو صرف سو سال سے اس عقیدہ کے قائل ہیں۔ سنی علماء کرام بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت امام مہدی کی آمد کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔ 1952ء میں پنجاب میں احمدی حضرات کے خلاف فسادات ہوئے تھے۔ یہ بڑے پیمانے پر ہوئے تھے اور اس کے بعد لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا تھا۔ یہ فسادات خالص سیاسی وجوہات پر ہوئے تھے

۔گورنمنٹ نے ان فسادات کے اسباب معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کردی تھی جو جسٹس منیر اور جسٹس کیانی پر مشتمل تھی۔ اس کمیٹی کا نام منیر کمیٹی تھا۔اس کمیٹی نے دس ایشو قائم کئے تھے ان میں ایک ایشو یہ بھی تھا کہ کیا امام مہدی کی آمد کا ذکر قرآن میں ہے یا نہیں؟ اس کمیٹی کے سامنے اکتیس (31) علماء نے بیانات دیئے تھے ان بیانات میں محترم المقام مودودی صاحب مرحوم کا بیان بھی تھا جو انہوں نے تحریری طور پر دیا تھا اور جو بعد میں طبع ہو گیا تھا اور ہر شخص کی پہنچ میں ہے۔اس بیان کے بالکل شروع میں جناب مودودی صاحب نے کھل کر اعتراف کیا تھا کہ امام موصوف کی آمد کا کوئی ذکر قرآن میں نہیں ہے۔

سنی حضرات کے مطابق یہ عقیدہ نہ صرف قرآن میں نہیں ہے بلکہ ''صحیحین'' یعنی بخاری شریف اور مسلم شریف میں بھی آمد مہدی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔جب اس عقیدہ کا ذکر نہ تو قرآن میں ہے اور نہ ہی صحیحین میں موجود ہے جو حضورؐ کی وفات کے بعد کا اڑھائی سو سال کا عرصہ COVER کر لیتی ہیں۔گویا اڑھائی سو سال تک یہ عقیدہ رائج نہیں تھا کیونکہ اگر یہ عقیدہ ان کے دور میں ہوتا تو ضرور ''صحیحین'' میں اس کی احادیث موجود ہوتیں تو پھر اس کے بعد والے محدثین کے پاس وہ کونسا ذریعہ تھا جس کے ذریعے ان کو اس عقیدہ کا علم ہوا۔ اس سے نظر بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ آہستہ آہستہ کافی عرصہ کے بعد DEVELOP ہوا ہے۔جو حضرات اس عقیدہ کی علمی انداز میں تردید کے خواہاں ہوں ان سے گذارش ہے کہ کمترین راقم سطور کا ''ایک مضمون جون 2005ء کے ''صوت الحق'' میں ''آمد مہدی و نزول مسیح کا عقیدہ خلاف قرآن ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔دوسرا۔طلوع اسلام میں بعنوان ''حضرت امام مہدی کی آمد کا عقیدہ خلاف قرآن ہے'' بابت اگست 2004 میں طبع ہوا ہے۔ان دونوں مضامین میں اس عقیدہ کا علمی جائزہ قرآن کریم کی روشنی میں لیا گیا ہے، وہ ملاحظہ فرمالیں۔ایک ہی موضوع پر دوبارہ، سہ بارہ، تحریر کرنے سے قارئین کرام کا وقت ضائع ہوتا ہے۔

جہاں تک مرزا صاحب کے دوسرے دعویٰ یعنی مسیح ہونے کا تعلق ہے تو اس کا تذکرہ بھی قرآن میں نہیں ہے۔قرآن کریم سے وفات مسیح کھل کر ثابت ہوتی ہے۔لیکن

ہمارے علماء کرام قرآن کریم کے خلاف حیات مسیح کے قائل ہیں اور اس سلسلہ میں ان کا دارومدار کلی طور پر احادیث پر ہے۔ مرزا صاحب وفات مسیح کے قائل تھے اور چونکہ یہ عقیدہ قرآنی آیات سے واضح ہے اس لئے یہاں ہمارے علماء ان سے مات کھا جاتے تھے اور لاجواب ہو جاتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں بدقسمتی سے نزول مسیح کا عقیدہ بھی مروج ہے۔ اس عقیدے کو مرزا صاحب درست قرار دیتے تھے اور احادیث سے اس کو ثابت کرتے تھے ۔اور اس سے نتیجہ یہ نکالتے تھے کہ کیونکہ نزول مسیح ہونا لازمی ہے، لیکن حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے ہیں اس لئے وہ تشریف نہیں لائیں گے بلکہ ان کا ایک نظیر اور مثیل آئے گا اور وہ میں ہوں۔ حالانکہ وفات مسیحؑ کی وجہ سے صحیح نتیجہ انہیں یہ نکالنا چاہئے تھا کہ کیونکہ حضرت عیسیٰ فوت ہو گئے ہیں، اس لئے اب کوئی نہیں آئے گا، اور نزول مسیح کی احادیث سب موضوع ہیں۔ لیکن مرزا صاحب نے ایسا نہیں کیا اور نزول مسیحؑ کے خلاف قرآنی عقیدہ سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن اس میں ایک مغالطہ (FLAW) ہے۔ اس بارے میں یہ حضرات ایک بات قرآن سے ثابت کرتے ہیں اور ایک بات احادیث سے۔ وفات مسیحؑ قرآن سے ثابت کرتے ہیں اور نزول مسیحؑ احادیث سے۔ اگر آپ ان حضرات سے یہ مطالبہ کریں کہ جس طرح آپ وفات مسیحؑ قرآن سے ثابت کرتے ہیں، اسی طرح نزول مسیحؑ بھی قرآن سے ثابت کریں تو یہ حضرات لاجواب ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا وہ ہرگز نہیں کر سکتے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰؑ فوت ہو گئے اور ان کی وفات قرآن سے ثابت ہے تو جس قدر احادیث نزول مسیحؑ کا پتہ دیتی ہیں وہ قرآن کے خلاف ہے اور موضوع ہیں۔ اپنی وفات کے بعد وہ آ ہی نہیں سکتے۔

احادیث معاملہ کو کس قدر الجھا رہی ہیں ان کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ مرزا صاحب اور مولوی محمد عبداللہ صاحب چکڑالوی کے مابین ایک مناظرہ 1905ء میں سیالکوٹ میں منعقد ہوا۔ جس وقت تک صرف قرآن سامنے رہا اور گفتگو کا مدار قرآن پر رہا، مولوی محمد عبداللہ صاحب کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن جب گفتگو قرآن سے سرک کر حدیث پر آ گئی تو پلہ

مرزا صاحب کا بھاری ہو گیا اور مولوی عبداللہ صاحب کو اس مناظرہ میں شکست ہوئی اور مرزا صاحب مناظرہ جیت گئے۔ مولوی عبداللہ پہلے ہی سے حدیثوں سے بدظن تھے، اس کے بعد وہ بالکل منکر حدیث بن گئے اور کھل کر سامنے آ گئے۔

مرزا صاحب کی نبوت کے یہ دو اساسی عمود ہیں جن پر ان کی نبوت کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ آپ خود غور فرمالیں کہ یہ دونوں عمود کس قدر خلاف قرآن ہیں، اور کس درجہ کمزور اور SHAKY ہیں۔ لیکن یہ دونوں عمود مسلمانوں کے خود فراہم کردہ ہیں۔ اور احادیث سے متخرج ہیں۔ اگر آپ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ان دونوں عمودوں کو تسلیم نہ کریں تو مرزا صاحب کی نبوت کی عمارت خود بخود منہدم ہو جاتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم خود ہی کرسیاں بچھاتے ہیں اور جب کوئی ان پر آ کر بیٹھتا ہے تو اس کو جوتیاں مارتے ہیں۔

اب اس مضمون میں ان خلاف قرآن نظریات کی نشاندہی کی جاتی ہے جس سے احمدی حضرات فائدہ اٹھاتے ہیں اور تمام مسلمان ان کو مانتے ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ ہر نبی رسول ہوتا ہے اور ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کا قرآن کے خلاف یہ عقیدہ ہے کہ رسول وہ ہے جو اپنے ساتھ کتاب لاتا ہے اور نبی وہ ہے جو کتاب نہیں لاتا۔ مرزا صاحب نے اس سے فائدہ اٹھایا اور خود کو ایسا نبی بتایا جو شریعت یا کتاب ساتھ نہیں لایا۔ لیکن قرآن میں ہے کہ تمام انبیاء کو کتاب دی گئی ہے، **اَنۡزَلَ مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ بِالۡحَقِّ** (2/213) نیز یہی الفاظ رسولوں کے متعلق بھی آئے ہیں (27/25)، انبیاء کرام کی انہیں کتابوں کو **اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ** (2/136) کہا گیا ہے۔ مسلمانوں کے اس غلط نظریہ سے فائدہ اٹھایا گیا۔ اسی نظریہ کے خلاف کہ سب انبیاء و رسل کتابیں ساتھ لائے ہیں احمدی حضرات فرماتے ہیں کہ سورہ مائدہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ **اِنَّاۤ اَنۡزَلۡنَا التَّوۡرٰىةَ فِيۡهَا هُدًى وَّنُوۡرٌ ۚ يَحۡكُمُ بِهَا النَّبِيُّوۡنَ** (5/44) بے شک ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور ہے اسی کے ذریعے انبیاء بنی اسرائیل فیصلے کرتے تھے۔ اس سے وہ یہ استدلال کرتے ہیں کہ تورات تو ایک کتاب ہے جو حضرت موسیٰ کو ملی تھی، لیکن اس سے بنی اسرائیل کے بہت سے انبیاء فیصلہ کرتے تھے اور یہ وہ نبی ہوتے تھے جو بغیر کتاب کے

آئے تھے اور مرزا صاحب بھی ایسے ہی نبی ہیں۔ لیکن اس بارے میں ان کو مغالطہ ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ کی کتاب کا نام تورات نہیں بتایا۔ تورات کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم کے بعد (3/64) اور حضرت عیسیٰ سے پہلے نازل ہوئی تھی (5/46) قرآن کریم کی رو سے تورات ان تمام کتابوں کا نام ہے جو انبیائے بنی اسرائیل پر حضرت عیسیٰ سے پیشتر نازل ہوئیں۔ اس مجموعے کو عہد نامہ عتیق (OLD TESTAMENT) کہتے ہیں۔ اس میں انتالیس 39 صحیفے ہیں جو مختلف انبیائے کرام پر نازل ہوئے تھے۔ اس لئے اس آیت سے یہ استدلال کرنا کہ کچھ نبی یا رسول بغیر کتاب کے آئے تھے، اور تورات سے فیصلہ کرتے تھے بالکل غلط ہے، اور مرزا صاحب کا یہ موقف قرآن کریم کے خلاف ہے۔ لیکن جمہور مسلمان خود اس کے قائل ہیں، اس لئے وہ اس عقیدہ پر گرفت نہیں کرسکتے تھے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے علم خاص خاص ہستیوں کو ملتا تھا اور اللہ تعالیٰ ہر شخص سے کلام کرنا پسند نہیں فرماتا تھا۔ اس لئے انسانیت دو حصوں میں منقسم ہے یا تو کوئی شخص خود نبی ہوتا تھا، یا کسی نبی کا مخاطب اور اس کا امتی ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ خود نبی بھی ہو اور خود ہی امتی بھی۔ یا وہ خود مرسل ہوتا تھا یا مرسل الیہ ہوتا تھا۔ قرآن کریم نے فرمایا کہ ان سب کی، یعنی مرسل الیھم باز پرس ہوگی۔ یہ سب زیر حساب اور تحت محاسبہ ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے **فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَ لَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ** (7/6) پھر ہم ضرور ان لوگوں سے جن کی طرف رسول بھیجے گئے تھے سوال کریں گے اور خود رسولوں سے بھی باز پرس کریں گے۔ یہاں قرآن کریم نے مرسل اور مرسل الیھم کو نکھار کے الگ الگ دو گروہوں میں منقسم کردیا ہے۔ حضرت رسول کریمؐ ہماری طرف مرسل تھے اور ہم سب ان کے مرسل الیھم ہیں۔ نہ کوئی مرسل، مرسل الیھم ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی مرسل الیھم مرسل ہوسکتا ہے۔ یہ بالکل دو الگ الگ گروہ ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مرزا صاحب مرسل ہونے کے بھی مدعی ہیں اور مرسل الیھم ہونے کے بھی۔ وہ اس لحاظ سے کہ خود کو حضورؐ کا امتی کہتے ہیں، حضورؐ کے مرسل الیہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ

خود مرسل ہونے کے بھی مدعی ہیں اور یہ قرآن کے خلاف ہے۔ یہی پوزیشن اس وقت کے موجودہ احمدی حضرات کی ہے کہ وہ یا تو حضورؐ کے مــرســل الیھــم ہوسکتے ہیں یا مرزا صاحب کے، دونوں کے مرسل الیھم نہیں ہوسکتے فتــدبروا ۔وحی الٰہی کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب بھی رسول یا نبی مبعوث ہوتا تھا اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب ہدایت سے نوازتا تھا۔ اس کی قوم اس کتاب کا اتباع کرتی تھی۔ رسول کی تشریف براری کے بعد بھی وہ اس کتاب کا اتباع کرتی رہتی لیکن مرور ایام کے ساتھ اس کتاب میں آمیزش ہو جاتی تھی اور جب وحی الٰہی میں ملاوٹ ہو جاتی تھی تو اللہ تعالیٰ ایک نئے رسول کو اس کی کتاب کے ساتھ مبعوث فرماتا تھا پھر اس نئی کتاب پر عمل کرنا اللہ کی اطاعت ہوتا تھا۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَ مَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلۡقَى الشَّيۡطٰنُ فِىۡۤ اُمۡنِيَّتِهٖ فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ (22/52)

(مفہوم) ہمارا فرستادہ نبی آتا لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا اس کے چلے جانے کے بعد اس امت کے لوگ اپنی مفاد پرستیوں کے پیش نظر، اس نبی کی وحی میں ملاوٹ کر دیتے تھے۔ پھر اس وحی کو اس ملاوٹ سے صاف کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ ایک اور رسول مبعوث کرتا جو اس سابقہ وحی کی ملاوٹ کو دور کرکے، اسے منزہ شکل میں پیش کرتا اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے قوانین کو پھر محکم بنا دیتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کو ہر کام کا علم ہوتا ہے اور وہ حکمت والا بھی ہے۔

اس آیت کریمہ کو اس سابقہ تحریر شدہ نظریہ کی تائید میں پیش کیا گیا ہے کہ سابقہ کتاب میں آمیزش ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ دوسرا رسول مبعوث فرماتا تھا اور وہ رسول وحی کو منزہ شکل میں پیش فرماتا تھا۔ اس سنت الٰہی کے پیش نظر قرآن کریم کو محفوظ کر دیا گیا تا کہ اس میں ملاوٹ نہ ہو۔ قرآن کا محفوظ کر دینا اس بات کا حتمی ثبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق اب نہ کوئی نئی کتاب (وحی) آئے گی اور نہ ہی کوئی رسول آئے گا۔ کیونکہ کتاب محفوظ ہے (15/9) اور جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنی تھی وہ بند ہوگئی

ہے۔ وَ تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا (6/115) البتہ احمدی حضرات ایک آیت کریمہ سے سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی اس وجہ سے کہ ہمارے مفسرین کرام نے خود اس کی تفسیر بالکل غلط کی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ وَاِنۡ مِّنۡ اَهۡلِ الۡـكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهٖ قَبۡلَ مَوۡتِهٖ (4/159) ترجمہ: اہل کتاب میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو اس کے مرنے سے قبل ایمان نہ لے آئے اور اس سے مراد لی جاتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ آسمان سے نازل ہوں گے تو اس وقت تمام اہل کتاب حضرت عیسیٰ کی موت سے پیشتر ان پر ایمان لے آئیں گے لیکن یہ مفہوم قطعاً غلط ہے کیونکہ جب حضرت عیسیٰ کے نزول کا کوئی تذکرہ قرآن کریم میں نہیں ہے تو یہ غیر قرآنی عقیدہ اپنی طرف سے زیادہ کرکے آیات کا مفہوم اس کے مطابق کرنا، درست قرآن فہمی نہیں ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں دو ضمیریں (ب ہ) آتی ہیں۔ موضوع احادیث کے زیر اثر نزول مسیح کے عقیدہ کی وجہ سے ہمارے مفسرین کرام سے اس میں تسامح ہوا ہے کہ انہوں نے بہٖ کی دوسری ضمیر کو حضرت عیسیٰ کی طرف راجع کیا ہے۔ لیکن درست بات یہ ہے یہ ضمیر اہل کتاب کی طرف راجع ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ من قبل موتہٖ قرآن کریم کا ایک محاورہ ہے جس کے معنی واقعتاً موت سے پیشتر نہیں ہے بلکہ اس کے معنی ساری عمر کے ہیں۔ اس کے لئے آیات (2/132.63/10) ملاحظہ فرمائیں جس سے واضح ہوگا کہ من قبل موتہٖ کے معنی ساری زندگی اور ساری عمر ہے۔ آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے خود اہل کتاب کو بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ صلیب کا واقعہ کیا تھا اور جسے صلیب پر چڑھایا گیا وہ حضرت عیسیٰ ہی تھے یا کوئی اور آدمی تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس بات پر کہ فی الواقع حضرت عیسیٰ کو ہی صلیب دی گئی تھی ساری عمر اس پر یقین محکم رکھتے ہیں۔ اس آیۂ کریمہ سے دور دور بھی حضرت مرزا صاحب کے آنے کا کوئی تعلق نہیں۔

یہاں تک تو گفتگو تھی اسلام کو مذہب کی سطح پر رکھنے کی۔ لیکن قرآن کریم تو اپنے کو دین کہتا ہے۔ مذہب کا تو لفظ تک قرآن کریم میں نہیں آیا۔ مذہب میں انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے براہ راست ہوتا ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ عقیدہ ہوتا ہے اس کا دنیا کی عملی

زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مذہب کے ہر ماننے والے کو کوئی نہ کوئی ضابطہ حیات اختیار کرنا ہوتا ہے جو خود انسانوں کا وضع کردہ ہوتا ہے۔ اس کی مثال برطانیہ کے عیسائیوں کی ہے ان کے مذہب کا زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی اطاعت تو انفرادی طور پر کر لیتے ہیں، لیکن عملی زندگی میں انہوں نے جمہوریت کو بطور دین اختیار کیا ہوا ہے مذہب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس کے بالکل برخلاف قرآن کریم اور اس کے پیش کردہ دین کا عروۃ الوثقیٰ ہی یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت براہ راست نہیں ہو سکتی۔ اللہ کی اطاعت کے لئے ضروری ہے کہ اس نظام کی اطاعت کی جائے جو اس کے رسول نے قائم کیا ہوتا ہے۔ چونکہ اللہ کے احکامات اس کا رسول جاری و نافذ کرتا ہے اس لئے ان احکامات کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ اللہ کی اطاعت کے لئے نظام کی اطاعت لازمی ہے اور اس نظام کی اطاعت کے لئے یہ دو امور لازمی ہیں۔

(ا) نظام کی اطاعت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ نظام زندہ، جیتی جاگتی، اتھارٹی کی شکل میں موجود ہو، مومنین پہلے اس کے احکامات کو سنتے ہیں پھر اس پر عمل کرتے ہیں۔ ان احکامات کی اطاعت کرنے سے پیشتر ان کو براہ راست ایک اتھارٹی سے سننا لازم ہے ارشاد ہوتا ہے

(ا) يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ لَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَ اَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ (8/20) اے ایمان والو اللہ و رسول کی اطاعت کرو اس سے روگردانی نہ کرو در حالانکہ تم سن رہے ہو۔

(۲) فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَ اسْمَعُوْا وَ اَطِيْعُوْا وَ اَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ (64/16) تو جہاں تک تم سے بن پڑے اللہ سے ڈرو، اور اس کے احکام سنو اور مانو اور اپنی بہتری کے واسطے خرچ کرو۔

(۳) وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ (2/285) اور کہنے لگے اے پروردگار ہم نے سنا اور مان لیا، پروردگار ہمیں تیری مغفرت کی خواہش ہے اور تیری طرف پلٹ کے جانا ہے۔

(۴) اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (24/51)، ایمان والوں کا قول تو بس یہ ہے کہ جب ان کو اللہ اور رسول کے پاس بلایا جاتا ہے تا کہ ان کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کردیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے حکم سنا اور مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

یہ چار آیات کریمات اس قدر واضح ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ اور نہ ہی اس کے دو مفاہیم برآمد ہوسکتے ہیں ان چاروں آیات سے واضح ہے کہ اللہ کی اطاعت کے لئے، ایک زندہ و پائندہ نظام کا ہونا لازمی ہے اور اس نظام کے احکامات مومنین کے سامنے جاری ہوتے ہیں جن کو مومنین پہلے سنتے ہیں اور پھر ان پر عمل کرتے ہیں۔

دوسری بات جو اس نظام کی لازمی خصوصیت ہے وہ یہ ہے کہ یہ اطاعت ایک ہوتی ہے، یہ دو مطاع ہیں۔ لیکن ان دو مطاعوں کی اطاعت کو قرآن کریم ایک اطاعت گردانتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ یہ احکامات اللہ کے ہوتے ہیں لیکن ان کو جاری و نافذ رسول کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کی اطاعت صرف ایک اطاعت ہو جاتی ہے۔ اس موضوع پر بار بار تحریر کیا جا چکا ہے۔ گذشتہ ماہ کے صوت الحق میں پھر لکھا گیا ہے۔ دوبارہ یہاں تحریر کرنا اب مناسب نہیں ہے۔ البتہ آیات کے حوالہ جات دیئے جاتے ہیں آپ خود تکلیف فرما کر ان کو دیکھ لیں۔ (58/5, 58/20, 33/36, 59/8, 8/20, 9/74, 6 9/4, 3/172 /62, 58/21, 99/24, 24/54, 4) اس کے علاوہ اور بھی کافی حوالے ہیں۔ چونکہ اس نکتہ نکتہ پر کہ قرآنی نظام کی اطاعت سے ہی اللہ کی اطاعت ہوتی ہے قرآن کریم نے بہت زور دیا ہے، اس لئے اس کو مختلف پہلوؤں اور متنوع طریقوں سے اجاگر کیا جاتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

(۱) فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما (4/65) پس اے رسول پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے

مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حکم نہ بنائیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو مان لیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5/48) جو احکام خدا نے نازل کئے ہیں تم ان کے مطابق فیصلہ کرو۔

اور یہ آیت کریمہ تو حجت قاطعہ کا درجہ رکھتی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ (4/59) اے ایمان والوں خدا کی اطاعت کرو اور رسول کی اور جو تم میں سے صاحبان حکومت ہوں ان کی اطاعت کرو اور اگر تم کسی بات میں تنازعہ کرو پس اگر تم خدا اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس امر میں اللہ اور رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان لانے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم اپنے فیصلے اللہ اور رسول سے کراؤ ۔ اور جو کوئی اپنے فیصلے اللہ و رسول سے نہیں کراتا وہ اللہ اور روز آخرت پر صحیح معنوں میں ایمان نہیں لاتا۔ اس سے اگلی آیت کریمہ میں اس سے بھی زیادہ وضاحت کی گئی ہے ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَ قَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ (4/60) (اے رسول) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر نظر نہیں کی جو یہ خیالی پلاؤ پکاتے ہیں کہ جو کتاب تجھ پر نازل کی گئی اور جو کتابیں تم سے پہلے نازل کی گئیں سب پر ایمان لائے ہیں اور دلی تمنا یہ ہے کہ سرکشوں کو اپنا حاکم بنائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ ان کی بات نہ مانیں۔

اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے "طاغوت" کو خود DEFINE کر دیا ہے۔

طاغوت وہ اتھارٹی، عدالت، یا ادارہ ہے جو فیصلہ جاری کرتا ہے اور جس سے فیصلے طلب کئے جاتے ہیں۔ قرآن کریم اس سے فیصلہ کرانا کفر قرار دیتا ہے۔ فیصلہ صرف اسلامی حکومت کی اتھارٹی کا سند ہو جاتا ہے۔

قرآن کریم کی رو سے معاشرے دو ہی طرح کے ہوسکتے ہیں۔ایک معاشرہ وہ ہے جو وحی کے احکامات پر قائم ہوتا ہے اور جس کو قرآن کریم اپنی اصطلاح میں دین کہتا ہے ۔دوسرا وہ معاشرہ ہوتا ہے جو انسانوں کے خودساختہ MAN MADE LAW پر متفرع ہوتا ہے ۔قرآن کریم اس کو طاغوت کہہ کر پکارتا ہے۔اس میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔اس میں زندگی بسر کرنے والا مجرم، باغی، اور اللہ کا نافرن ہوتا ہے قرآنی نظام یعنی دین کے علاوہ ہر نظام طاغوت ہے، اور اس میں زندگی بسر کرنا حرام ہے۔ مسلمانوں کا عروج و زوال ان کے دین سے وابستہ ہے۔ وہ اپنے ملک میں قرآن کا نظام جاری کرتے ہیں اس کے بعد حد درجہ قوت حاصل کرتے ہیں (8/60)، اس قوت سے ان کے اور اللہ کے دشمن لرزاں وترساں رہتے ہیں۔وہ عدل قائم کرتے ہیں (57/25) وہ ایک ایسی امت ہوتے ہیں کہ جو تمام دنیا کی نگراں ہوتی ہے اور ان کا مرکز خود ان کا نگراں ہوتا ہے (2/143)، وہ ہی ساری دنیا میں سپر پاور اور اعلون ہوتے ہیں (3/139) اللہ تعالیٰ کافروں کو ان پر غالب نہیں آنے دیتا (4/121) وہ سب سے بالا ہوتے ہیں۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے ۔۔۔۔۔۔ غیرت او برنتابد ہم سرے

یہ ہے دین اور یہ ہے امت مسلمہ کا مقام دیگر اقوام میں۔اور یہ ہے طریقہ اطاعت الٰہی کا قرآن کے مطابق۔دین کے اس آئینہ میں آپ احمدیت کو دیکھیں تو بالکل عریاں و برہنہ نظر آتی، جسے قرآن کریم سے دور دور کا واسطہ نہیں۔اصل یہ ہے کہ مرزا صاحب مذہب کی سطح تک ہی رہے۔وہ مذہب کی سطح سے اوپر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ان کے سامنے دین کا تصور ہی نہیں تھا۔

اب جب کہ انسانیت اپنے خودساختہ نظامہائے حیات سے تنگ ہو رہی ہے اور خود مسلمان بھی ذلیل وخوار ہو کر دین کی طرف رجوع کر رہے ہیں کہ اس کے علاوہ اور کوئی پناہ گاہ ہے ہی نہیں (72/22, 18/27) دین کا تصور روز بروز واضح ہوتا جا رہا ہے اور مذہب عقل کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔جس دن بھی کسی جگہ دین عملی شکل میں متمکن ہو گیا، احمدیت، تصوف، تشیع، یہاں تک جمہوریت اور سوشلزم کے باطل نظریات خود بخود اپنی

موت آپ مر جائیں گے۔ ان کا سکہ صرف مذہب کی دنیا میں رواں ہے، دین میں ان کا سکہ جنس کاسد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی بھی رسول یا نبی کی صداقت کی دلیل اس کی کتاب ہوتی ہے ۔چنانچہ غیر مسلم حضرات جب بھی حضورؐ کی رسالت و نبوت سے انکار کرتے ہیں یا یہ کہتے ہیں کہ انہیں غلط فہمی ہوگئی تھی یا انہیں HALLUCINATIONS ہوتے تھے تو ہم ان کو یہی دلیل دیتے ہیں کہ حضورؐ یقیناً رسول تھے کیونکہ قرآن کریم جو ان پر نازل ہوا ہے وہ کسی انسانی فکر کی کاوش نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم کی آیات سے بھی یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ قرآن وحی الٰہی ہے اور فکر انسانی اس کا سرچشمہ کسی صورت بھی نہیں ہوسکتا۔ قرآن کے وحی ہونے کے ثبوت میں کمترین راقم سطور کا ایک مضمون "اعجاز القرآن" کے نام سے "صوت الحق" میں شائع ہو چکا ہے۔ اسی قسم کی کوششوں سے ہم قرآن کریم کو وحی ثابت کرتے ہیں اور اس طرح حضورؐ کی رسالت از خود ثابت ہو جاتی ہے۔

مرزا صاحب کے سلسلہ میں یہ دقت پیش آتی ہے کہ انہوں نے کوئی کتاب پیش نہیں کی ۔وہ اپنی صداقت کی بنیاد پیش گوئیوں پر رکھتے رہے یا ان خلاف قرآن عقائد پر رکھتے رہے جو مضمون ہذا میں آپ کے سامنے پیش کر دئے گئے ہیں۔ اگر مرزا صاحب کی کوئی کتاب ہوتی تو اس کے CONTENTS سے بخوبی اندازہ ہو جاتا کہ وہ وحی ہے یا نہیں کیونکہ ان کی طرف سے کوئی کتاب پیش نہیں کی جاتی ،اس لئے مجبوراً ان کے عقائد ونظریات سے تعرض کیا گیا ہے، جو آپ کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ حد درجہ اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی صاحب کی دل آزاری یا دل شکنی نہ ہو۔ کیونکہ ؎

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

اس بات سے قطع نظر کہ مرزا صاحب مذہب ہی کی سطح پر رہے اور دین تک ان کی نگاہ نہیں گئی۔ مذہب میں بھی جو چیزیں قرآن کے خلاف تھیں انہوں نے ان میں سے ایک کی بھی نہ نشاندہی کی اور نہ ہی ان کی مخالفت کی۔ عامتہ المسلمین کے جو کچھ نظریات

قرآن کے خلاف ہیں مرزا صاحب نے ان سب کو قبول کرلیا اور اپنے سارے دور میں ان میں سے کسی کے خلاف بھی لب کشائی نہیں فرمائی۔ ہماری ساری تفاسیر، اور فقہ بنو عباس کے دور میں وجود میں آئیں۔ ہمارے بیشتر عقائد پر ملوکیت کی چھاپ ہے اور چونکہ وہ مسلمانوں کا فکری لحاظ سے تاریک ترین دور تھا اس لئے ہمارے فقہ کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے ملوکیت نے اسلام کی وہ تعبیر پیش کی جو خالص سرمایہ دارانہ نظام پر مشتمل تھی۔ قرآن کریم کی رو سے زمین پر کسی ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا تو اس کے ساتھ ہی ان اسباب وذرائع کو بھی پیدا کیا جن پر ان کی زندگی کا انحصار تھا۔ پانی، ہوا، حرارت، روشنی اور زمین جس سے خوراک حاصل ہوتی ہے زمین کے متعلق فرمایا وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ (55/10) نیز فرمایا۔ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ (41/10) اسی بناء پر قرآن نے ملکیت زمین حرام قرار دی مگر مرزا صاحب ملکیت زمین کے قائل تھے۔

قرآن کریم اکتناز کو منع فرماتا ہے (9/34) اور اس آیۃ کریمہ میں ایسا واضح حکم ہے کہ کوئی گریز کی راہ نہیں نکلتی تھی لیکن ہمارے مفسرین نے اس آیۃ کریمہ کے ذیل میں نہایت افسانوی رنگ میں جو اس کا شان نزول بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں یہ حکم حضورؐ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے کہ اگر زکوۃ ادا کردی جائے تو جس قدر بھی چاہئے آپ دولت جمع کرسکتے ہیں۔ صرف اڑھائی فیصد رقم دے کر سب دولت WHITE MONEY ہوجاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کریم میں آیا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ (22/41) مومنین وہ ہیں کہ اگر انہیں زمین میں حکومت مل گئی تو یہ اقامت صلوٰۃ کریں گے اور زکوۃ دیں گے۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ ایتائے زکوۃ بذکوۃ دینا ہے یعنی نوع انسان (یا افراد معاشرہ) کو سامان نشوونما عطا کرنا۔ اس اعتبار سے حکومت کی ساری آمدنی (REVENUES) کو زکوۃ (سامان نشوونما) کہا جائے گا جسے وہ افراد معاشرہ بلکہ پوری پوری عالمگیر انسانیت کو دینے کے لئے حاصل کرے گی۔ اس کے لئے وہ کیا انتظام کرے گی لوگوں سے کس قدر لے گی اس کا تعین ضروریات کے

لحاظ سے ہوگا۔ زکوٰۃ کسی ٹیکس (TAX) کا نام نہیں ہے اسلامی حکومت کی پوری آمدنی زکوٰۃ ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ مرزا صاحب کی نگاہیں صرف اس طرف نہیں گئی بلکہ ان سے اس کی توقع بھی نہیں کی جاسکتی۔

قرآن کریم نے فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے (30/32)، اور فرمایا کہ جس نے دین میں فرقہ بندی کی اس کا رسول اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (6/159)، چونکہ اس زمانہ کے مسلمانوں میں اور ہمارے علماء کرام میں فرقہ بندی جائز قرار دی ہوئی ہے مرزا صاحب نے بھی اس سے کوئی تعرض نہیں فرمایا کہ وہ اس کو قرآن کریم کی روشنی میں ملاحظہ فرماتے بلکہ اس کو مسلمہ کی حیثیت سے قبول کرلیا۔ مسلمان الہام اور پیش گوئیوں کو درست گردانتے ہیں۔ لیکن ان دونوں کی کوئی سند قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کی رو سے علم حاصل کرنے کے صرف دو سرچشمے ہیں۔ ایک وحی یعنی خدا سے براہ راست علم ملنا جو انبیاء کرام کے ساتھ مخصوص تھا اور ختم نبوت کے بعد اس کا سلسلہ بند ہوگیا۔ دوسرا عقل انسانی (HUMAN INTELLECT)، اس میں ہر انسان شریک ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ختم نبوت کے بعد اب دو چیزیں ہمارے پاس رہ گئی ہیں ایک وحی کی رو سے ملی ہوئی تعلیم یعنی قرآن کریم اور دوسرے عقل انسانی۔ بناء بریں الہام، کشف، مراقبہ، کا عقیدہ بالکل قرآن کے خلاف ہے اور یہی وہ چور دروازے ہیں جن کو کھول کر لوگ طرح طرح کے دعاوی کرتے ہیں۔ اور ان ہی سے مرزا صاحب نے فائدہ اٹھایا۔ لیکن یہ سب قرآن کے خلاف ہیں مزید یہ کہ جو لوگ الہام کے قائل بھی ہیں وہ وحی اور الہام میں سورج کی روشنی اور شمع کی روشنی جیسا فرق ان دونوں میں شمار کرتے ہیں۔ اور جسے وحی جیسی روشنی ملتی ہو، اس کو الہام کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن حیرت ہے کہ مرزا صاحب دونوں کے حامل ہونے کے مدعی تھے۔

عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں بھی ہماری فقہ نے سخت ناانصافی سے کام لیا ہے قرآن کریم کی رو سے اصولاً ایک بیوی رکھنے کی اجازت ہے۔ زوج مکان زوج (4/20) لیکن مرزا صاحب کئی کئی شادیوں کے قائل تھے۔ اور خود بھی اس پر عمل پیرا تھے۔ قرآن کریم میں پردہ کا کوئی حکم نہیں ہے جس سے آدھی آبادی بالکل بے کار ہوجاتی ہے لیکن

مرزا صاحب پردہ کے خود بھی قائل تھے اور اب بھی احمدی خواتین پردہ کرتی ہیں۔ یورپین ممالک میں رہنے کے باوجود بھی وہ پردہ کی پابند ہیں۔

ہماری فقہ نے یتیم پوتے پر سخت ظلم کیا ہے کہ چچا کی موجودگی میں اس کو وراثت سے بالکل محروم کر دیتے ہیں۔ فقہ کا یہ قانون بھی قرآن کے خلاف ہے اور مرزا صاحب کے زمانہ میں بھی اس کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہو گئی تھی یہاں تک کہ اب عائلی قوانین میں اس کی اصلاح کر دی گئی ہے۔ لیکن مرزا صاحب نے اس خلاف قرآن عقیدہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اسی طرح فقہ کے دیگر قوانین کا حال ہے۔ رجم، قتل مرتد، اور ایسے بیسوں مسائل قرآن کے خلاف تھے لیکن مرزا صاحب نے ان کو پیش نگاہ نہیں رکھا۔ مرزا صاحب نے صرف ان مسائل پر توجہ دی جن سے وہ فائدہ اٹھا سکتے تھے ورنہ آمد مہدی اور نزول مسیح کے عقیدے اس وجہ اہم نہیں تھے کہ جن پر مسلمانوں کے ایمان وکفر یا ان کے عروج وزوال کا انحصار ہو۔ قرآن فہمی میں مرزا صاحب اپنے زمانے کے مولویوں سے ایک قدم بھی آگے نہیں گئے۔ اور نہ ہی اپنے دور کے معاشرہ کی اصلاح میں انہوں نے کوئی دلچسپی لی۔ ان کی کسی ایک کتاب سے بھی ایک سطر ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو کہ انہیں مسلمانوں کی بربادی یا تباہی کا کوئی معمولی سا بھی رنج ہوا ہو۔ وہ اور مولانا حالی ہم عصر تھے بلکہ دونوں ایک ہی سن کی پیدائش تھے۔ آپ مولانا حالی کی مسدس کا مطالعہ فرمائیں۔ ہر قاری اشکبار اور چشم نم ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تباہی وبربادی سے مصنف کے سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ اس دور کے اکثر بزرگوں کی تصانیف سے ان کی بے قراری نظر آتی ہے۔ لیکن مرزا صاحب کے ہاں ذرا سی بھی ہمدردی یا رنج وغم کا اظہار نہیں ہوتا۔ وہ ساری عمر مباہلہ کی ہی دعوت دیتے رہے جو خود قرآن کے خلاف ہے۔ اور صرف مولویوں میں معروف ہے۔

@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@@

سخنے چند

قارئین کرام آپ نے کتاب ملاحظہ فرمائی۔ مسلمانوں کے لئے یہ دور بہت ہی مشکلات اور رسوائی کا دور ہے۔ ساری امت مسلمہ زبوں حالی سے دو چار ہے۔ ہمارے نزدیک مسلمانوں کے زوال کا سبب مسلمانوں کا مروجہ مذہب ہے جو غیر قرآنی عقائد توہمات اور پرستش پر مبنی ہے تحریک طلوع اسلام اور رسالہ صوت الحق مسلمانوں کے زوال کو دور کرنے اور انہیں غلبہ اور اقتدار دلوانے کی تحریک ہے، یہ مذہب کے خلاف اور دین کی داعی ہے اس کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ضمن میں جن ذمہ داریوں کو اپنے اوپر لیا ہے مثلاً رزق پہنچانے کی ذمہ داری (6-151/11-6) مسلمانوں کو غالب رکھنے کی ذمہ داری (4-141/47-35/3-139) ان کا پورا کرنا اسلامی نظام کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اس کو سب سے پہلے حضورؐ نے قائم فرمایا۔ حضورؐ خود اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ لہٰذا اس نظام کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت قرار دیا گیا۔ حضورؐ اور ان کے جانشینوں کی اطاعت کو اللہ اور رسول کی اطاعت گردانا گیا۔ اسلامی نظام کی اطاعت ہی عبادت الٰہی ہے اس تحریک کے نزدیک خدا پرستی کے معنی پرستش کے نہیں ہیں بلکہ اس کے نزدیک خدا پرستی کا مفہوم اللہ تعالیٰ کے قوانین کو عملاً جاری کرنا ہے اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنا نیک عملی ہے۔ مسلمانوں کے زوال وادبار کو دور کرنے، اور غلبہ واقتدار حاصل کرنے کا واحد طریقہ اس کے دین کا قیام ہے۔ مسلمانوں کی زندگی اور ان کے اقبال وادبار ان کے دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ مضامین نہایت دل سوزی اور دردمندی سے تحریر کئے گئے ہیں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ اسلامی نظام قائم کرنے میں جو کچھ بھی بن پڑے کر گزریں۔ اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی (34-46) دو دو اور ایک ایک کر کے ہی دین کے قیام کی کوشش شروع کر دیں۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ (47-7) اگر

آپ دین قائم کرنے میں ابتداء کردیں گے تو اللہ تعالیٰ خود آپ کی مدد کرے گا۔ آپ کے قدموں کو جما دے گا اور آپ کو استقامت عطا کرے گا۔ جب اللہ کی کتاب قرآن کریم ہمارے درمیان موجود ہے جو یہ دعویٰ کرتی ہے کہ مسلمان ہمیشہ غالب رہیں گے۔ اور مغلوب نہیں ہوسکتے (58-21/3-160/3-139) تو ہمیں گھبرانے اور خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمارا قرآن پر ایمان ہے کہ رب کا ایک ایک وعدہ برحق اور درست ہے۔ چونکہ قرآن کے تمام وعدے نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں اس لئے سب سے اہم اور ضروری بات یہ ہے کہ کسی خطۂ زمین پر اسلامی نظام قائم کردیا جائے تاکہ قرآن کے وعدے پورے ہوں۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ اس کا نظام ضرور بالضرور قائم ہوگا۔ (61-9/48-28/9-33) بس دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے۔ مگر ہمیں صرف یہ افسوس ہے کہ۔

تیری محفل میں لیکن ہم نہ ہوں گے

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین

◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆◆

مصنف کی دیگر کتب جو اہل علم حضرات سے داد وصول کرچکی ہیں۔

(۱) قرآن فہمی کے قرآنی اصول۔

(۲) قرآنی اور روایتی دین کے فاصلے۔

(۳) ذہن جو قرآن بناتا ہے۔

(۴) دین اور مذہب کے فاصلے۔

تزئین و آرائش۔ حسین امیر فرہاد